برصغیر میں

معتمد اور غیر معتمد تفاسیر

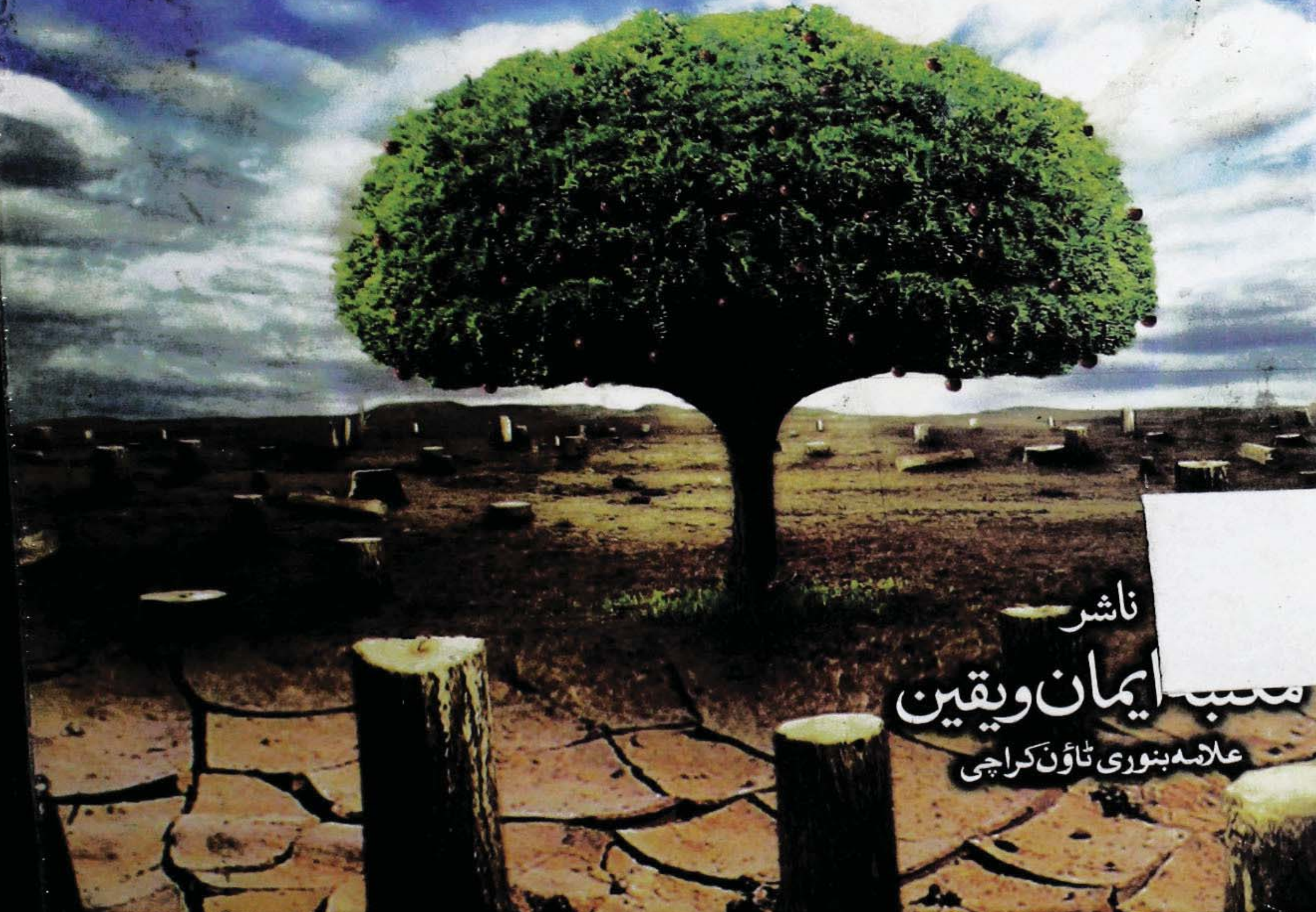
نشاندہی ـــــ تبصرے ـــــ جائزے

تالیف

حضرت مولانا فضل محمد یوسف زئی مدظلہم العالی

استاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی



ناشر

مکتبہ ایمان ویقین

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

معتمد اور غیر معتمد تفاسیر

نشاندہی، تبصرے اور جائزے

عالم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان کتاب قرآن مجید کی اہلِ حق علما نے صحیح تفاسیر لکھ کر جو خدمت کی ہے اور اہل باطل علمانے غیر صحیح تفاسیر لکھ کر اس پر جو ظلم کیا ہے زیر نظر کتاب میں تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے ہیں پڑھیے اور انصاف پر مبنی فیصلہ کیجیے۔

تالیف

حضرت مولانا فضل محمد یوسف زئی
استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ ایمان ویقین
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

نام کتاب: معتمد اور غیر معتمد تفاسیر

تالیف: حضرت مولانا فضل محمد یوسف زئی صاحب

صفحات: ۳۵۲

ماؤنٹنگ: حبیب اللہ بٹ ناظم آباد کراچی 0321-2156429

طبع: بارِ اول

تاریخ اشاعت: شعبان ۱۴۳۷ھ

کمپوزنگ: اظہار الحق: جامعہ صدیقیہ گلشن معمار کراچی

ناشر: مکتبہ ایمان ویقین بنوری ٹاؤن کراچی

انتساب

ان نابغۂ زمان مفسّرین کے نام جنہوں نے
اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کی تفسیر جادۂ حق
پر قائم رہتے ہوئے کی اور اہلِ باطل کی
تحریفات کا خوب دفاع کیا۔

حضرت مولانا فضل محمد صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّا اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالۡحَقِّ ۚ
فَمَنِ اهۡتَدٰى فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيۡهَا ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ ﴿۴۱﴾

سورت زمر آیت نمبر (۴۱)

ترجمہ: (اے پیغمبر!)

ھم نے لوگوں کے فائدے کے لئے تم پر یہ کتاب برحق نازل کی ہے۔
جو شخص راہ راست پر آجائے گا، وہ اپنی ہی بھلائی کے لئے آئے گا، اور جو
گمراہی اختیار کرے گا وہ اپنی گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرے گا، اور
تم اس کے ذمہ دار نہیں ہو۔

فہرست مضامین

عرض حال

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهِ الَّذِیْنَ اَوْفَوْا عَهْدَهٗ.

اَمَّا بَعْدُ:

فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ جَلَّ جَلَالُه وَعَمَّ نَوَالُهٗ ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِیْزٌ لَّایَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ﴾ (حم السجدة: ۴۲)

اور یقیناً وہ (قرآن) عزت وعظمت والی کتاب ہے جس میں نہ آگے اور نہ پیچھے سے غلطی کا دخل ہے حکمت والے تعریفوں والے بادشاہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

قرآن عظیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ محفوظ آسمانی صحیفہ ہے ہر قسم کے لوگ آئے اور گئے مگر یہ کتاب محفوظ ہے اس کے الفاظ کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ابھی چار دن پہلے کوئٹہ میں مولانا اکرم صاحب کے گھر میں قرآن عظیم کا ایک پرانا نسخہ میں نے دیکھا جو قلمی نسخہ ہے اور ۳۷۱ھ میں لکھا گیا ہے میں نے خود اس میں پونے پارہ قرآن پڑھا بالکل محفوظ کتاب ہے جس کی عمر ایک ہزار چھیاسٹھ ۱۰۶۶ سال ہے آج کل دنیا میں جو قرآن موجود ہے اس قرآن میں اور اُس قدیم پرانے قرآن میں ایک حرف کا فرق نہیں ہے، اگر چہ اس کتاب کے معانی اور مطالب میں اہل باطل نے دست اندازی کی کوشش کی ہے اور آئے روز کرتے رہتے ہیں لیکن وہ اہل باطل کی اپنی سیاہ کاری ہے قرآن مجید کے محفوظ الفاظ کی ترجمانی نہیں ہے۔

بہرحال زیر نظر کتاب کا نام میں نے ''اہل حق اور اہل باطل کی تفاسیر'' تجویز کیا تھا پھر میں نے اس کتاب کا نام صحیح اور غیر صحیح تفاسیر تجویز کیا لیکن حالات کے پیش نظر اس کا ظاہری نام میں نے ''معتمد اور غیر معتمد تفاسیر'' رکھا ہے میں نے اس کتاب میں ان لوگوں کا تعاقب کیا ہے جنہوں

نے قرآن عظیم کے معانی اور تفسیر وتشریح میں دست اندازی کی کوشش کی ہے بہر حال میں نے اس کتاب میں قرآن عظیم کی تفسیر کی لغوی اور اصطلاحی تعریف لکھدی ہے مفسرین کے طبقات کا ذکر کیا ہے اور پھر اہم اور مشہور تفاسیر کے نام لکھے ہیں اس کے صفحات اور مجلدات کا تذکرہ کیا ہے اور ہر مفسر کا تفسیر میں اس کے اپنے رجحان کو بھی بیان کیا ہے گویا یہ کتاب علوم القرآن پر مشتمل ایک چھوٹا سا نادر تحفہ ہے میرا دل چاہتا ہے کہ یہ کتاب ہر عالم اور ہر طالب علم کے پاس ہر وقت موجود ہو اہل حق کی تفاسیر کے مقابلے میں برصغیر میں اہل باطل کی تفاسیر کا تذکرہ بھی میں نے کیا ہے اور ان مقامات کو ظاہر کیا ہے جہاں ان اہل باطل نے تفسیر میں تحریف کی ہے، یا اہل حق کے صحیح منہج سے الگ راستہ اختیار کیا ہے، بڑی محنت کر کے ایک دقیق بحث کے ذریعہ سے ان تحریفات کو کھولا ہے قابل گرفت عبارات کو پیش کر کے حوالہ دیا ہے اور پھر قابل گرفت مواضع پر تبصرہ کیا ہے اور مقدور بھر تنقید کی ہے تا کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا حق ادا ہو جائے۔

برصغیر میں اہل باطل کی تفاسیر کی ابتداء سر سید احمد خان کی تفسیر سے ہوتی ہے پھر علامہ حمید الدین فراہی کی تفسیر ہے پھر غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والوں کی چند تفاسیر ہیں پھر علامہ عنایت اللہ مشرقی کی تفسیر ہے پھر چوھدری غلام احمد خان پرویز کی تفسیر ہے پھر علامہ وحید الدین خان کی تفسیر ہے پھر مودودی صاحب کی تفسیر ہے پھر جناب امین احسن اصلاحی کی تفسیر ہے پھر جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی تفسیر ہے۔ کنز الایمان کے نام سے بھی ایک تفسیر ہے لیکن میں نے اس کو نہیں چھیڑا ہے۔

مجھے ان لوگوں سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے نہ میں نے ان کی ذاتی زندگی پر گفتگو کی ہے ان میں سے کچھ ایسے حضرات بھی ہونگے کہ معاشرہ میں بہت سارے لوگ ان کے چاہنے والے ہوں گے اور میری تحریر ان پر گراں بھی گزرتی ہوگی لیکن میں ان سے گزارش کرتا ہوں کہ میں نے جو لکھا ہے اور ان کی تفسیری غلطیوں کی نشاندہی کی ہے یہ حضرات پہلے ان غلطیوں کو پڑھیں اور پھر خود سوچیں کہ کس معیار پر یہ تفسیر لکھی گئی ہے اس کے بعد میرے تبصرے کو بھی پڑھیں اگر ان کے ذہن میں صحیح نقشہ آگیا اور انہوں نے حقیقت کو پالیا تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو قبول

کرلیں اور اپنے گزشتہ فروگزاشتوں پر نظر ثانی کریں اور حق کا ساتھ دیں، ان اہل باطل مفسرین میں بعض تو ایسے ہیں جو بالکل راہ حق سے گمراہ ہوچکے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو راہ راست سے کسی حد تک دور نکل چکے ہیں گویا کوئی اول کوئی دوم کوئی سوم درجے کے پریشان حال ہیں ان کی تفاسیر کے پڑھنے والے حضرات جب ان کی عبارات پڑھیں گے اور میرے تبصرے دیکھیں گے تو ان شاء اللہ ابہام کے بادل چھٹ جائیں گے اور حق کی طرف رجوع کرنے میں آسانی ہوگی ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

بہرحال میرا اصل مقصد جناب حمید الدین فراہی صاحب اور ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی صاحب اور ان کے شاگرد جاوید احمد غامدی کی تفاسیر اور اس کی غلطیاں خاص کر مسلمانوں کے سامنے لاکر ظاہر کرنا ہے کیونکہ ان حضرات کی تعلیمات کا شیدائی جاوید احمد غامدی آج کل ٹی وی اور میڈیا پر آکر مسلمانوں میں مذہبی انتشار پیدا کر رہے ہیں یہ تینوں حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے منکر ہیں اپنی ضرورت کے لیے حدیث کو بڑے شوق سے بیان کردیں گے لیکن حدیث کی ضرورت کو یہ حضرات بالکل تسلیم نہیں کرتے ہیں چنانچہ ان کی ضخیم تفاسیر میں آپ کو احادیث کا تذکرہ نہیں ملے گا ہزاروں صفحات میں پندرہ بیس احادیث بھی ڈھونڈ لانا مشکل ہے۔

غامدی صاحب نے اپنے نظریات زیادہ تر امین احسن اصلاحی سے لی ہیں، مودودی صاحب کے ساتھ بھی سالہا سال تک رہے ہیں ان کی آزاد خیالی بھی ان میں آئی ہے انکار حدیث میں ان کا مشہور معتمد اور محسن منکر حدیث حبیب الرحمٰن کاندھلوی ہے ان کے غلط نظریات مِنْ وعَنْ غامدی صاحب نے قبول کرلیے ہیں، وفات مسیح کی پوری داستان غامدی صاحب نے غلام احمد قادیانی سے مستعار لی ہے سر سید احمد خان سے بھی غامدی صاحب اپنی تفسیر میں استفادہ کرتے ہیں معجزات کے انکار میں فراہی واصلاحی وغامدی سب کے سب تقریباً سر سید کے نظریات سے خوشہ چین ہیں۔ البتہ آج کل غامدی صاحب وحدتِ ادیان کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اس طرح غامدی صاحب مسلم امت کے مذہبی فکر کی تشکیل نو کر رہے ہیں جن کے افراد مغرب سے مرعوب،

سلف سے دور اور دین سے ناواقف ہونگے خلاصہ یہ کہ غامدی صاحب تحریک استشراق کا جدید اسلامی نمونہ ہیں پورے دین وشریعت سے انکار کے لیے غامدی صاحب اپنی کتاب میزان میں لکھتے ہیں ''حدیث سے کوئی اسلامی عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا''۔ (میزان ص:۶۴ طبع دوم)

خدا کی پناہ کہ اس طرح آدمی بھی اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے اور مفسر قرآن بنتا ہے۔

وصلى الله تعالىٰ على نبيه الكريم وحبيبه الوسيم

(حضرت مولانا) فضل محمد یوسف زئی (حفظہ اللہ)

۳ رجب ۱۴۳۷ھ ۱۱ اپریل ۲۰۱۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ الْخَلْقَ بِقُدْرَتِهٖ وَخَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضَ وَالْجِبَالَ وَالْبِحَارَ وَالأَنْهَارَ بِعَظْمَتِهٖ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الأَسْمَآءُ الْحُسْنٰی. اَنْزَلَ الْقُرْآنَ هُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیُضِلُّ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَمَا یُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفَاسِقِیْنَ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الأَوَّلِیْنَ وَالآخِرِیْنَ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ وَرَسُوْلِ الْمَلَاحِمِ صَاحِبِ الْجَمَلِ الأَحْمَرِ وَالسَّیْفِ الْمشْهورِ عَیْنَاهُ حَمْرَاوَانِ مِنْ شِدَّةِ الْقِتَالِ هُوَ رَحْمَة مُهْدَاة مَبْعُوْث بِرَفْعِ قَوْم وَخَفْضِ آخرِیْنَ وَعَلٰی آلِهٖ وَأَصْحَابِهِ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ رُهْبَانُ اللَّیْلِ وَفُرسَانُ النَّهارِ الْمُجَاهِدُوْنَ الْحمادُوْنَ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ.

امابعد: علماء اسلام اور اہل ایمان اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن عظیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک بڑی رحمت اور بڑی ہدایت ہے قرآن عظیم کے الفاظ کی تلاوت سے انسان کو بے پایان ثواب ملتا ہے اور اس کے معانی اور ترجمہ اور مفہوم سمجھنے سے انسان کو رہنمائی اور ہدایت ملتی ہے۔ لہٰذا کسی صحیح عقیدہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے قرآن عظیم کا ترجمہ وتفسیر انتہائی اہم چیز ہے اہل اسلام کے علماء نے اپنے اپنے زمانے میں عوام کی ہدایت کے لیے قرآن عظیم کے تراجم وتفاسیر کا بڑا اہتمام کیا ہے اور آج تک الحمد للہ یہ عظیم کام جاری ہے۔ سب سے پہلے قرآن عظیم کی تفسیر عربی زبان میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے لکھی ہے اسی لیے ان کے القاب میں سے ایک لقب ترجمان القرآن ہے اور دوسرا لقب ''حِبْرُ الْاُمَّۃِ'' ہے۔

پھر علماء کرام کے درمیان یہ بات محل بحث رہی ہے کہ آیا کسی عجمی زبان میں قرآن کا ترجمہ کرنا جائز ہے یا نہیں ہے؟ کچھ علماء عدم جواز کے قائل تھے کہ قرآن عظیم کی فصاحت و بلاغت کا حق کسی

اور زبان میں ادا نہیں ہوسکتا ہے لیکن جمہور علماء نے فیصلہ صادر فرمایا کہ انسانوں کی ہدایت کے پیش نظر قرآن عظیم کا ترجمہ وتفسیر کسی بھی زبان میں کرنا صرف جائز نہیں بلکہ ضروری ہے۔ چنانچہ علماء نے یہ بات بھی بتائی ہے کہ شاید بابا سعدیؒ نے سب سے پہلے فارسی میں قرآن عظیم کا ترجمہ کیا ہے، واللہ اعلم۔ شاہ ولی اللہ نے فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے اور فتح المنان کے نام سے مختصر تفسیر بھی لکھی ہے۔ پھر برصغیر میں سب سے پہلے قرآن عظیم کا اردو ترجمہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے بیٹے شاہ عبدالقادر نے کیا ہے اور موضح القرآن کے نام سے مختصر مگر جامع تفسیر بھی شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالقادر نے لکھی ہے، کہتے ہیں کہ یہ الہامی ترجمہ وتفسیر ہے بارہ سال تک شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ایک پتھر پر بیٹھ کر قرآن کی یہ خدمت سرانجام دی ہے۔ میں نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ سے ایک بیان میں خود یہ بات سنی ہے کہ اس پتھر پر زیادہ استعمال کی وجہ سے گھڑا پڑ گیا تھا، اگر برصغیر میں شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ اردو زبان میں قرآن کا ترجمہ نہ کرتے تو شاید بعد میں کسی کو ترجمہ کی توفیق نہ ہوتی۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے علماء اسلام کو قرآن عظیم کی اس خدمت کا بڑا موقع فراہم کیا ہے چنانچہ امت کے علما نے قرآن عظیم کی ہزاروں تفاسیر لکھ کر قرآن عظیم سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے آسمان کے نیچے دنیا میں ایسی کوئی کتاب نہیں ہے جس کی اتنی شروحات وتفاسیر لکھی گئی ہوں اور روزمرہ وہ کتاب اس طرح بڑے پیمانے پر پڑھی جارہی ہو اور اس کتاب کی اتنی تلاوت ہورہی ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کا زندہ معجزہ ہے جو ہر انسان دیکھ سکتا ہے نیز اگر کوئی شخص اس کتاب کی دس ہزار مرتبہ اول سے آخر تک تلاوت کرے وہ دس ہزار مرتبہ تلاوت کے بعد بھی اس کتاب کی تلاوت میں مزید لطف محسوس کرتا ہے بجائے اُکتا جانے کے مزید شوق وذوق بڑھ جاتا ہے۔

شاعر نے سچ کہا ہے

وَخَیرُ جَلِیسٍ لَایَمَلُّ حَدِیثُہٗ وَتَرُدَادُہٗ تَزدَادُ فِیہِ تَجَمُّلا

اب میں ان چند تفاسیر کا نام لکھنا چاہتا ہوں جو اہل حق نے لکھی ہیں لیکن پہلے میں طبقات

المفسرین کے دس طبقات کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

مفسرین کا پہلا طبقہ

اسلام میں مفسرین کا پہلا طبقہ صحابہ کرام کا طبقہ ہے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تفسیر کی احادیث سن لیں اور پھر امت تک پہنچادیں چنانچہ طبقۂ صحابہ میں دس صحابہ کرام تفسیر میں زیادہ مشہور تھے جن کے نام یہ ہیں:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ حضرت زید بن ثابتؓ حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہم۔

طبقۂ صحابہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تفسیر میں خاص شاگرد حضرت ابن عباس ہیں جنہوں نے تفسیر ابن عباس کے نام سے اسلام میں پہلی تفسیر لکھی ہے جو آج تک متداول اور مشہور ہے۔

مفسرین کا دوسرا طبقہ

اس دوسرے طبقے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کا مشہور طبقہ ہے جو تابعین کا طبقہ کہلاتا ہے جن میں چُنیدہ چُنیدہ اشخاص کے نام یہ ہیں:

(۱) حضرت مجاہد بن جبر متوفی ۱۰۲ھ (۲) طاؤس بن کیسان متوفی ۱۰۶ھ (۳) زید بن اسلم متوفی ۱۳۶ھ (۴) ملیکہ بن ابی رباح (۵) سعید بن جبیر (۶) عکرمۃ، اسی طبقہ میں حسن بصری اور محمد بن سیرین ابوالعالیہ ضحاک بن مزاحم اور سُدی الکبیر مشہور ہیں اگر چہ ان میں بعض کی سند ابن عباس سے منقطع ہے۔

مفسرین کا تیسرا طبقہ

اس تیسرے طبقے میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں جن میں علقمہ بن قیس متوفی

۶۲ھ زید بن قیس ابراہیم نخعی زرّ بن حُبیش اور اسود سرفہرست ہیں اس طبقہ میں سفیان بن عیینہ شعبہ بن الحجاج یزید بن ہارون اور وکیع بن الجراح رحمہم اللہ بھی شامل ہیں۔

مفسرین کا چوتھا طبقہ

اس چوتھے طبقے میں محمد بن جریر طبری ابوالقاسم انماطی عبدالرحمٰن ابن ابی حاتم اور ابن حبان رحمہم اللہ سرفہرست ہیں اس طبقہ میں دیگر مفسرین کے نام بھی ہیں لیکن ان کی تفاسیر رطب ویابس سے خالی نہیں ہیں۔

مفسرین کا پانچواں طبقہ

اس طبقہ میں محمد بن حُصین نیشاپوری ابواسحاق احمد بن ثعلبی نیشاپوری ابومحمد عبداللہ جوینی ابوالحسن واحدی نیشاپوری رحمہم اللہ شامل ہیں ان حضرات کی بعض تفاسیر بھی رطب ویابس سے خالی نہیں ہیں

مفسرین کا چھٹا طبقہ

چھٹا طبقہ متاخرین مفسرین کا ہے جو چھٹی صدی میں گزرے ہیں جن میں ابوالقاسم اسماعیل بن محمد اصفہانی امام راغب اصفہانی ابوحامد محمد بن محمد غزالی محمد بن عمر جاراللہ زمخشری اور حسین بغوی رحمہم اللہ سرفہرست ہیں ان حضرات کے علاوہ بھی بہت مفسرین اس طبقہ میں گزرے ہیں۔ ان مفسرین نے اپنے اپنے علمی ذوق پر میں ترجیحی بنیادوں پر تفاسیر لکھی ہیں کسی پر احادیث کا رنگ غالب تھا کسی پر فقہ کا رنگ غالب تھا کسی پر علم کلام کا رنگ غالب تھا کسی نے منطق میں شوق ظاہر کیا تو کسی نے فلسفہ کو اپنایا اور کسی نے تصوف کی روشنی میں تفسیر لکھ ڈالی۔

مفسرین کا ساتواں طبقہ

اس طبقہ میں محمد بن فخرالدین رازی صاحب تفسیر الکبیر، محمد بن احمد قرطبی، موفق الدین احمد بن یوسف موصلی صاحب تفسیر الکواشی قاضی ناصرالدین عبداللہ بن عمرو بیضاوی سرفہرست ہیں دیگر

مفسرین بھی ہیں۔

مفسرین کا آٹھواں طبقہ

اس طبقہ میں ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نفسی صاحب مدارک ہیں ابوالفداء عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر قرشی صاحب تفسیر ابن کثیر ہیں۔ عبدالواحد بن منیر اور قطب الدین بن محمود بن مسعود شیرازی صاحب تفسیر فتح المنان، شرف الدین حسن بن محمد طیبی صاحب تفسیر ''فتوح الغیب عن قناع الریب'' ہیں مذکورہ حضرات اس طبقہ کے مشہور مفسرین ہیں۔

مفسرین کا نواں طبقہ

نویں صدی کے مفسرین میں جلال الدین محمد بن احمد محلی، اور جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی ہیں ان کی تفسیر جلالین سے مشہور ہے۔ شیخ علی بن احمد مہائمی رحمہ اللہ صاحب تفسیر مہائمی ہیں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ صاحب بحر مواج، علامہ سعد الدین تفتازانی صاحب کشف الاسرار اور عبدالرحمٰن بن عمر بلقینی صاحب مواقع العلوم، اور ابوالفضل شہاب الدین محمود آلوسی حنفی صاحب تفسیر روح المعانی ہیں یہ حضرات اس صدی کے مشہور مفسرین ہیں۔

مفسرین کا دسواں طبقہ

اس طبقہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین شامل ہیں اس طبقہ کو اگر وسیع کر کے دیکھا جائے تو اس میں محمد بن علی شوکانی کی تفسیر شوکانی ہے تفسیر مظہری ہے فتح البیان نواب صدیق حسن خان کی تفسیر ہے اور بلغۃ الحیر ان حضرت مولانا حسین علی کی تفسیر ہے تفسیر بیان القرآن ہے جو حکیم الامۃ شاہ اشرف علی تھانوی کی تفسیر ہے عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر ماجدی ہے۔ تفسیر عثمانی ہے تفسیر حقانی ہے تفسیر احمد علی لاہوری ہے تفسیر جواہر القرآن ہے تفسیر معارف القرآن ہے اور اہل حق کی دیگر بہت ساری تفاسیر بھی ہیں جو

ہمارے اس موجودہ دور کی مشہور تفاسیر ہیں مگر جو فی الحال میرے ذہن میں آیا وہی مین نے لکھدیا۔

بہر حال مذکورہ تفاسیر اہل حق کی تفاسیر ہیں روایات وتفاسیر کے حوالے سے مضبوطی اور کمزوری اپنی جگہ پر الگ چیز ہے لیکن مجموعی طور پر یہ اہل حق کی تفاسیر ہیں اس کے علاوہ چند مشہور تفاسیر جو اہل باطل کی ہیں اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے یہ الگ بات ہے کہ ان حضرات میں بعض تو حق کے جادۂ مستقیمہ سے بالکل ہٹ کر دور جا نکلے ہیں جیسے سر سید احمد خان کی تفسیر، غلام احمد قادیانی کی تفسیر، غلام احمد پرویز کی تفسیر، عنایت اللہ مشرقی کی تفسیر، عبداللہ چکڑالوی کی تفسیر، حمید الدین فراہی کی تفسیر، امین احسن اصلاحی کی تفسیر اور جاوید احمد غامدی کی تفسیر قابل ذکر ہیں۔
اس کے ساتھ ساتھ نسبتاً کچھ کم نقصانات پر مشتمل تفاسیر بھی ہیں جیسے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر ڈاکٹر اسرار صاحب کی تفسیر احمد رضا خان صاحب کی تفسیر اور دیگر کچھ ڈاکٹروں اور پروفیسروں کی تفاسیر ہیں مجھے چونکہ صرف جاوید احمد غامدی صاحب کی تفسیر البیان کی قابل گرفت جگہوں سے متعلق کچھ لکھنا ہے۔لہٰذا دیگر تفاسیر کا صرف نام لیکر عوام کو آگاہ کردیا تنبیہ کے لیے یہ کافی ہے کچھ تفصیلات بھی آنے والی ہیں۔

چند ضخیم تفاسیر کا بیان

مندرجہ بالا مذکورہ تفاسیر کا تذکرہ میں نے اختصار کے ساتھ کیا ہے ورنہ ان دس طبقات مفسرین میں دسیوں تفاسیر ایسی بھی ہیں جن کا نام میں نے طوالت کے خوف سے نہیں لیا ہے البتہ اہل اسلام نے قرآن عظیم کی جو عظیم الشان تفسیری خدمات انجام دی ہیں اس میں سے چند ایسی تفاسیر کا نام لکھتا ہوں جو انتہائی ضخیم ہیں اور کئی کئی جلدوں اور ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں مفسر اور تفسیر کا نام ملاحظہ فرمائیں اور ان کی عظیم خدمات کو سلام کیجئے۔
(۱) ان مبارک اور خوش نصیب ہستیوں میں شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن بخاری حنفی متوفی

۵۴۶ھ ہیں جو''الزاهد العلاء'' کے لقب سے معروف ہیں انہوں نے قرآن عظیم کی تفسیر لکھی ہے جو ایک ہزار سے زیادہ اجزاء پر مشتمل ہے تاج التراجم میں قاسم بن قطلو بغا حنفی رحمہ اللہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۲)''حدائق ذات بهجة'' یہ تفسیر عبدالسلام بن محمد القزوینی متوفی ۴۸۳ھ کی ہے جو تین سو جلدوں پر مشتمل ہے بلکہ صاحب کشف الظنون کے ایک قول کے مطابق یہ تفسیر پانچ سو جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۳) محمد بن جریر طبریؒ متوفی ۳۱۰ھ کی تفسیر جامع البیان ہے جو تفسیر ابن جریر طبری کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے انہوں نے تیس ۳۰ ہزار صفحات پر ایک تفسیر لکھی پھر اس کا اختصار اور خلاصہ تین ہزار اوراق یعنی چھ ہزار صفحات میں کیا آج کل یہ اختصار شدہ تفسیر تیس جلدوں میں موجود ہے۔

حضرت سید بنوری رحمہ اللہ یتیمۃ البیان میں لکھتے ہیں کہ اندازہ یہ ہے کہ اختصار سے پہلے اصل تفسیر تین سو جلدوں پر مشتمل ہوگی علماء لکھتے ہیں کہ تفسیر ابن جریر کے بعد تمام تفاسیر کسی نہ کسی طریقہ سے اسی سے ماخوذ ہیں ابن جریر طبری سنی ہیں ان پر شیعیت کا الزام غلط ہے۔ ایک اور ابن جریر طبری شیعہ ہے۔

(۴) قاضی ابوبکر بن العربی متوفی ۵۴۳ھ کی ایک ضخیم تفسیر ہے جس کا نام انوار الفجر ہے''القبس'' میں انہوں نے خود اپنی تفسیر کا تذکرہ فرمایا ہے الدیباج المذھب میں مذکور ہے کہ بعض علماء نے اس تفسیر کو سلطان ابوعنان کی لائبریری میں ۸۰ مجلدات میں دیکھی ہے شیخ زاہد الکوثری فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر اسی ہزار (۸۰۰۰۰) اوراق پر مشتمل ہے۔ ایک محی الدین ابن عربی صوفی ہیں وہ مخدوش ہیں العربی معتمد ہیں جو العربی الف لام کیساتھ ہے۔

(۵) شیخ اکبر طائی اندلسی متوفی ۶۲۸ھ کی تفسیر ہے جو ساٹھ جلدوں پر مشتمل ہے لیکن وہ صرف سورت کہف تک پہنچ سکی ہے اندازہ کیجئے کہ صاحب فتوحات مکیہ شیخ اکبر کی پوری تفسیر کتنی بڑی ہوسکتی ہے۔

(۶) شیخ جمال الدین ابوعبداللہ حنفی مقدسی رحمہ اللہ متوفی ۶۹۸ھ کی تفسیر ہے جس کا نام ''التحریر والتحبیر'' ہے علامہ کفوی فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر ۸۰ جلدوں پر مشتمل تھی لیکن علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے ''الفوائد البھیہ فی تراجم الحنفیہ'' میں لکھا ہے کہ یہ تفسیر ننانوے جلدوں پر مشتمل تھی اور پچاس تفاسیر سے استفادہ کر کے لکھی گئی تھی شیخ موصوف ابن النقیب کی کنیت سے مشہور ہیں۔

(۷) شیخ ابوالقاسم اصبهانی متوفی ۵۳۵ھ کی تفسیر ہے جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۸) امام شمس الدین ابوالمظفر متوفی ۶۵۴ھ نے بھی تیس جلدوں میں تفسیر لکھی ہے۔

(۹) شیخ مفضل بن سلمہ حنفی نے ''ضیاء القلوب فی معانی القرآن'' کے نام سے تقریباً بیس جلدوں پر مشتمل تفسیر لکھی ہے موصوف تیسری صدی کے مفسرین علماء میں سے تھے

(۱۰) ابن ندیم نے ذکر کیا ہے کہ امام ابوبکر محمد بن حسن النقاش نے ''التفسیر الکبیر'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے جو بارہ ہزار اوراق پر مشتمل ہے۔

(۱۱) صاحب ظہر الاسلام اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۵ پر لکھتے ہیں کہ ابوجعفر نحاس کے شاگرد شیخ ابوبکر ادفویؒ نے علوم القرآن سے متعلق ایک سو بیس جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے اور انہوں نے ایک تفسیر لکھی ہے جو سو ۱۰۰ جلدوں پر مشتمل ہے ان کا انتقال ۳۸۸ھ میں ہوا۔

(۱۲) حافظ بن شاہین کی تفسیر شاہین ہے جو آج کل کے حساب سے ایک ہزار جلدیں بنتی ہیں۔

(۱۳) زاہد الکوثری فرماتے ہیں کہ میرے علم میں آج کل سب سے ضخیم تفاسیر میں سے ''فتح المنان'' ہے جو ''التفسیر العلامی'' کے نام سے مشہور ہے اور چالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ بڑی تفاسیر کا یہ تذکرہ حضرت محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی کتاب ''یتیمۃ البیان فی شیء من علوم القرآن'' سے میں نے لیا ہے۔

تفسیر میں ہر مفسر کا اپنا رجحان ہوتا ہے

قرآن عظیم کی تفاسیر کی دنیا میں واقعی اس امت کے علماء نے بے انتہاء محنت فرمائی ہے اور امت کے سامنے تفسیری روایات کو جمع فرمایا ہے اور سند کے حوالہ سے ہر خاص وعام کے لیے ہر روایت کے ساتھ سند لکھدی گئی ہے اور حوالہ بھی دیا ہے اب بات صاف ہوگئی کہ اگر سند قوی ہے تو کلام قوی ہے اگر سند کمزور ہے تو کلام کمزور ہے اگر سند میں کوئی وضاع راوی آیا ہے تو کلام موضوع ہے علمی میدان ہے ہر طرف راستے کھلے ہیں چھان پھٹک کا موقع سب کے لیے ہے اسی وجہ سے تفسیری روایات میں علماء نے چھان بین کی ہے صحیح اور غیر صحیح روایات کی نشاندھی کی ہے لہٰذا کسی غلط روایت کے آنے سے تمام روایات کو مسترد کرنا نہ علم ہے اور نہ انصاف ہے اور نہ علماء کا یہ طرز ہے اگر احادیث اور صحیح روایات کو چھوڑ کر قرآن کریم کی تفسیر کسی نے شروع کردی تو وہ تفسیر بالرائے کی وعید شدید کا مستحق ٹھہرے گا اور ان کی تفسیر میں تفسیر کا ذوق بالکل نہیں ملے گا نہ مزہ آئے گا بلکہ قرآن کی اس طرح خودساختہ تفسیر سے قاری یہ محسوس کرے گا کہ وہ آج کل کی لکھی ہوئی انجیل کی بے مقصد کہانیاں پڑھ رہا ہے۔

بہر حال حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ یتیمۃ البیان فی شیء من علوم القرآن میں فرماتے ہیں کہ ہر برتن سے وہی کچھ ٹپکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے چنانچہ ہر مفسر نے اسی تناظر میں قرآن عظیم کی تفسیر میں غور وحوض کیا ہے پس جس کا جو قلبی رجحان اور میلان اور قلبی شغف ومحبت تھی اس نے علمی میدان میں اسی کا مظاہرہ کیا چنانچہ ایک محدث مفسر کا طریقۂ کار روایات کو اکٹھا کرنا اور اس میں بحث کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا جس طرح ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں طریقہ اختیار کیا ہے اور جلال الدین سیوطی نے ''الدر المنثور'' میں بھی یہی طرز واسلوب اختیار کیا ہے۔

اسی طرح فقہی مسائل کا ذوق رکھنے والے مفسر نے فقہی مسائل کے استنباط واستخراج کی طرف

زیادہ توجہ دیدی ہے جیسے امام قرطبی رحمہ اللہ نے تفسیر قرطبی میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اسی طرح نحوی مفسر نے نحوی رجحان کو ذکر کیا ہے اور قرآن عظیم کے اعراب اور الفاظ قرآن کی تراکیب اور نظم قرآن کے سمندر میں غوطے لگائے جس طرح ابوحیان نحوی نے اپنی تفسیر ''اَلْبَحْرُ الْمُحِیط'' اور ''النھر'' میں اپنے نحوی رجحان پر تفسیر لکھی ہے۔ اسی طرح علم بلاغت سے شغف رکھنے والے مفسر نے قرآن عظیم کے اطناب وایجاز میں پوشیدہ راز واعجاز کو ظاہر کرنے میں شوق دکھایا ہے جیسے علامہ جاراللہ زمخشری نے تفسیر کشاف میں اور ابوسعود نے ''الارشـــاد'' میں یہ طریقہ کار اپنایا ہے۔

علم کلام سے شغف رکھنے والے متکلم مفسر نے علم کلام کو اپنی جولانگاہ کا میدان قرار دیا ہے جیسے امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر مفاتیح میں یہی منہج اختیار کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ان مفسرین نے قرآن عظیم کے آفاقی علوم کو بھی مکمل طور پر جاری رکھا ہوا ہے اسی طرح ایک منطقی مفسر کے مدنظر قرآن عظیم میں قیاس کی ترتیب اور حدود اور رُسوم سے متعلق بحث رہتی ہے جس طرح ابن سینا نے سورت اخلاص کی تفسیر میں یہ طریقہ اپنایا ہے جدید فلسفہ کے شوق رکھنے والے مفسر کا مطمح نظر کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات عنصری عجائبات اور طبعی غرائب کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش ہوتی ہے وہ اسی کو بیان کرتا ہے جیسے مصر کے علامہ جوھری طنطاوی نے اپنی تفسیر کو فلکیات اور عنصریات اور طبعی عجائبات سے اتنا بھر دیا ہے کہ بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن عظیم تو اسی کے لیے نازل ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب وہ کامل ومکمل اور جامع کتاب ہے جو ناپید کنار سمندر سے بڑھ کر ہے اور اس کی علمی امواج اس طرح ٹھاٹھیں مار رہی ہیں کہ ہزارہا سمندروں کی مواجی اس کے سامنے ایک قطرہ سے زیادہ نہیں ہے خلاصہ یہ کہ جس مفسر نے قرآن کو جس زاویہ سے دیکھا اس نے اسی میں قرآن کی خدمت کی گویا

عِبَـــارَاتُـــنَـــا شَتّـــی وَحُسْـــنُکَ وَاحِـــدٌ
وَکُـــلٌّ اِلٰـــی ذَاکَ الْـــجَـــمَـــالِ یُشِیْـــرُ

خودقرآن کا اعلان ہے کہ ﴿قُلْ لَوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (سورۃ کہف)

دوسری آیت ﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمَاتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ﴾ (سورۃ لقمان)

اسی طرح اتقان میں علامہ سیوطی نے ابن ابی الدنیا کا یہ قول نقل کیا ہے:

عُلُوْم الْقُرآن وَمَا یستنبط مِنْه بَحر لا سَاحِلَ لَهٗ

ترجمہ: ’’قرآن کے علوم اوراس سے مستنبط وسیع وعریض مسائل وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔

حق اور سچ یہ ہے کہ ایک کمزور وکمتر مخلوق بزرگ وبرتر اور طاقتور خالق کی کتاب کا حق ادا نہیں کرسکتا ہے۔ مفسر کبیر امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کی قبر پر جو شعر لکھا ہوا ہے اس میں اسی عاجزی کا اقرار ہے۔

مَـــا لِـــلتُّـــرَابِ وَلِـــلْـــعُـــلُـــوْمِ وَاِنَّـــمَـــا
یَسْـــعٰـــی لِیَـــعْـــلَـــمَ اَنَّـــهٗ لَایَـــعْـــلَـــمُ

ترجمہ: ’’مٹی اور خاک کا علوم کے ساتھ کیا نسبت ہے اس کی محنت وکوشش تو یہی ہے کہ بے علمی کا اقرار کرے۔

ان تمہیدی باتوں کے بعد اب تفسیر کی لغوی اور اصطلاحی تعریف اور اس سے متعلق مباحث کو ملاحظہ فرمائیں۔

تفسیر کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

تفسیر کی لغوی تعریف علامہ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں اس طرح لکھی ہے

التفسیر (تفعیل) مِنَ الفسر وَھُوَ الْبَیَانُ وَالْکَشْفُ (اتقان ج۲ ص۴۸۶)

یعنی تفسیر تفعیل کے وزن پر ہے یہ فَسر سے ہے جو بیان، وضاحت اور کھولنے کے معنی میں ہے۔

علامہ صابونی رحمہ اللہ نے تفسیر کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی ہے:

عِلْمٌ یُعْرَفُ بِہٖ فَھْمُ کِتَابِ اللّٰہِ الْمُنَزَّلِ عَلٰی نَبِیِّہٖ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَبَیَان مَعَانِیْہ وَاسْتِخْرَاجُ اَحْکَامِہٖ وحکمہ (التبیان فی علوم القرآن ص:۸۹)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں تفسیر کی لغوی اور اصطلاحی تعریف یوں کرتے ہیں: ''عربی زبان میں ''تفسیر'' کے لفظی معنی ہیں ''کھولنا'' اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جائیں، اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے۔ (البرہان)

تفسیر اور تاویل میں فرق

تفسیر اور تاویل کے بارے میں علامہ سیوطی نے اتقان میں بہت کچھ لکھا ہے چند عبارات پیش خدمت ہیں جس سے تفسیر اور تاویل میں فرق واضح ہو جاتا ہے فرماتے ہیں:

وَالتَّاوِیْلُ اَصْلُہٗ مِنَ الْاَولِ وَھُوَ الرُّجُوْعُ فَکَاَنَّہٗ صرف الآیۃ اِلٰی مَا تَحْتَمِلُہٗ مِنَ الْمَعَانِیْ (اتقان ج۲ ص:۴۸۶)

''تاویل دراصل اَوْل سے ماخوذ ہے جو رجوع کے معنی میں ہے گویا تاویل آیت کو ان معانی کی طرف موڑ دیتی ہے جس کا احتمال آیت میں ہوتا ہے۔

واختلفَ فِی التَّفْسِیْر وَالتَّاوِیْل فَقَال اَبُوعُبید وَطَائفۃ ھُمَا بمعنیً

''یعنی ابوعبید اور علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ تفسیر اور تاویل مترادف الفاظ ہیں

معنی میں دونوں ایک ہی ہیں۔

وَقَالَ الرَّاغب التَّفسِيُر اَعمّ مِن التَّاوِيْل وَاكثر اِستعمال التَّفسير فى الْاَلْفَاظِ ومفرداتها واكثر استعمال التّاويل فِي الْمعانى والْجمل

ترجمہ: ''امام راغب فرماتے ہیں کہ تفسیر تاویل سے عام ہے تفسیر کا اکثر استعمال قرآن کے مفرد الفاظ میں ہوتا ہے اور تاویل کا زیادہ استعمال قرآن کے جملوں اور معانی میں ہوتا ہے۔

وَقَالَ غيُره التَّفسِيُر بَيَان لَفظ لَايَحُتَمِلُ اِلَّا وجهًا وَاحداً والتَّاوِيْلُ تَوُجِيُهُ لَفظٍ متوجه اِلٰى معان مُختلفَة اِلٰى واحد منها بما ظهر من الأدلة (اتقان ج۲ص:۴۸۶)

وقال غيره التفسير يتعلق بالرواية والتاويل يتعلق بالدراية (اتقان ج۲ص:۴۸۸)

ان تمام عبارات کا مطلب اور خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی کسی آیت کے ظاہری مطلب کے بیان کرنے سے متعلق ہوتی ہے جس میں ایک ہی احتمال اور مطلب ہوتا ہے لیکن تاویل کسی آیت کے کئی مطالب ومعانی میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا نام ہے گویا تفسیر ظاہر آیت پر جاتی ہے اور تاویل آیت کے باطنی مفاہیم پر جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تاویل تفسیر سے کوئی الگ چیز نہیں ہے، یہ بھی قرآن کی تفسیر ہی ہے لیکن اس کا تعلق تحقیق وتدقیق سے ہوتا ہے عام ذہنوں میں یہ بات آتی ہے کہ تاویل کوئی غلط رخ اختیار کرنے کا نام ہوتا ہے ایسا نہیں ہے ہاں تفسیر بالرائی کے الفاظ جب آجائیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس شخص نے قرآن کی تفسیر کے معروف طریقہ کو چھوڑ کر اپنے خیال میں اپنی رائے اور اپنے رخ پر چلنے کا راستہ اختیار کیا ہے شریعت میں یہ جائز نہیں چنانچہ تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

تفسیر بالرائی کرنے والوں کے لیے وعید شدید

ابوداؤد نسائی اور ترمذی میں تفسیر بالرائی کرنے والوں سے متعلق ایک حدیث ہے جس کے الفاظ

یہ ہیں ''مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ فَاصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ'' (رواہ ابوداؤد وترمذی ونسائی)

(اتقان سیوطی)

ترجمہ: ''جس شخص نے قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے سے کلام کیا تو باوجود صحیح تفسیر کرنے کے اس شخص نے غلطی کی، ایک اور حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ''

ترجمہ: ''جس شخص نے قرآن کی تفسیر میں بغیر علم کے کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے''۔

ایک اور حدیث میں الفاظ اس طرح ہیں ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ قَوْلاً يَعْلَمُ اَنَّ الْحَقَّ غَيْرُهٗ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ''۔

ترجمہ: ''جس شخص نے قرآن کی تفسیر وتوضیح میں حق کے خلاف رائے زنی کی جبکہ وہ جانتا ہے کہ حق اس کے علاوہ ہے تو یہ شخص اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے''۔

مذکورہ بالا احادیث کو حضرت سید محمد یوسف بنوری نے اپنی تصنیف لطیف یتیمۃ البیان میں ذکر فرمائی ہیں اور اس کا مطلب بھی بحوالہ علامہ سیوطی بیان کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ نے مفسر کی شرائط اور تفسیر بالرأی کے عنوان کے تحت جو تحقیق فرمائی ہے اس کو مکمل نقل کیا جائے چنانچہ انہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

مفسر کی شرائط اور تفسیر بالرأی

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں کہ ''امام سیوطی فرماتے ہیں کہ: اس بات میں علماء کرام کی دو آراء ہیں کہ آیا ہر شخص کے لیے قرآن کریم میں غور وفکر کر کے از خود تفسیر بیان کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۱) ایک جماعت تو کہتی ہے کہ کسی شخص کو قرآن کریم کی کسی آیت وجزء کی تفسیر کرنا روا نہیں، چاہے وہ بڑا ادیب اور ادلۂ شرعیہ، علم فقہ، علم نحو، علم اخبار وآثار میں خوب رسوخ رکھتا ہو، سوائے

اس کے کہ وہ صرف وہ تفسیر بیان کرے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو۔

(۲) اور دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کرنا ہر اس شخص کے لیے جائز ہے جو ان پندرہ علوم میں کامل رسوخ رکھتا ہو، جن کی مفسر کو احتیاج ہوا کرتی ہے، وہ پندرہ علوم یہ ہیں:

۱۔علم لغت ۲۔علم نحو ۳۔علم صرف ۴۔علم اشتقاق

۵۔علم معانی ۶۔علم بیان ۷۔علم بدیع ۸۔علم قرأت

۹۔علم فقہ ۱۰۔علم قصص ۱۱۔علم اصول فقہ

۱۲۔علم اسباب نزول ۱۳۔علم اصول دین (علم کلام) ۱۴۔علم ناسخ ومنسوخ

۱۵۔علم توضیح مجمل ومبہم۔

اوران سب سے بڑھ کر وہبی علم جو اللہ رب العزت عاملین علماء کو الہام والقاء کے ذریعے مرحمت فرماتے ہیں، جس کی جانب حدیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اشارہ بھی وارد ہوا ہے کہ:

مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ يُورِثُه اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ.

ترجمہ: جو شخص اپنے علم پر عمل کرے، اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا علم اسے مرحمت فرمادیں گے جن کو وہ نہیں جانتا۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے، ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ سے نقل فرمایا ہے کہ: مندرجہ بالا پندرہ علوم مفسر کے لیے تفسیر میں ہتھیار کی مانند ہیں اور ان کو حاصل کیے بغیر کوئی شخص مفسر بن ہی نہیں سکتا، چنانچہ جو شخص ان علوم پر کامل دسترس حاصل کیے بغیر تفسیر کرتا ہے، وہ تفسیر بالرأی کا ارتکاب کرنے والا ہوگا، جس سے احادیث مبارکہ میں ممانعت وارد ہوئی ہے، اس کے مقابلے میں ان علوم میں رسوخ رکھنے والا تفسیر بالرائی کا مرتکب نہ ٹھہرے گا۔ راقم الحروف (سید یوسف بنوریؒ) عرض گذار ہے کہ ان دونوں فریق میں تطبیق اور پہلے قول کو دوسرے کے مانند ٹھہرا کر ان میں جمع وتوفیق چنداں مشکل نہیں، کیونکہ جو تفسیر صحیح سند سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اور اسی طرح کی کوئی اور حدیث اس کے معارض ومقابل نہ ہو تو وہ تفسیر ہر دو فریق کے نزدیک متعین

ومقرر ہوگی اور اگر کوئی تفسیر صحیح سند سے ثابت نہ ہو اور وہ مقام تفسیر وتوضیح کا محتاج ہو اور وہ متشابہات میں سے بھی نہ ہو جن پر اجمالی ایمان تو ضروری ہوا کرتا ہے، لیکن اس کی حقیقت اور تفصیل اللہ جل شانہ کے سپرد کردی جاتی ہے اور نہ ہی ایسا مشکل ومبہم ہو کہ گو متشابہات میں سے نہ ہو، لیکن متشابہات کے مانند ہو گیا ہو کہ غور وفکر سے اس کے معنی واضح نہ ہو سکتے ہوں بلکہ صرف اہل علم ہی اس کے صحیح معنی ومفہوم تک رسائی حاصل کر سکتے ہوں اور اہل زبان ہی اس کے درست مصداق کو سمجھتے ہوں، تو اس جگہ کوئی کلام کرنا صرف ایسے عالم کے لیے جائز ہوگا جو مذکورہ بالا پندرہ علوم میں کامل رسوخ اور مہارت تامہ رکھتا ہو۔ (بہر حال تفسیر کتاب اللہ جائز ہے) اس لیے کہ اللہ رب العزت کی یہ مقدس کتاب جو لوگوں کے لیے نصیحت اور ان تمام امراض کے لیے جو سینوں میں چھپے ہیں، شفا کا پیام ہے وہ کیونکر آسمان وزمین کے مابین یوں معلق رہ سکتی ہے کہ اس کا معنی کسی کو سمجھ نہ آئے؟ حالانکہ باری تعالیٰ کا خود فرمانِ عالی شان ہے:

﴿لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾

جب کہ اگر اس مقام پر قول اول سے اس کا سطحی معنی لیا جائے کہ استنباط واستخراج سے کچھ علم حاصل ہو ہی نہیں سکتا ہے تو قرآن کا بیشتر حصہ غیر معلوم ٹھہرے گا۔ بہتر بات یہی ہے کہ ان دونوں اقوال کو ایک مدار میں مرتکز کر دیا جائے، اس طرح معاملہ آسان اور لچک دار ہو جائے گا اور ان دونوں فریق کے مابین یہ اختلاف پاٹنے میں مدد ملے گی۔ مذکورہ جمع وتطبیق کے بیان میں علامہ زرکشی کا یوں فرمانا: میری تائید کرتا نظر آتا ہے، کہ قرآن کریم دو حصوں پر مشتمل ہے: ایک حصہ تو وہ ہے جس کی تفسیر نقلاً بیان کی جائے اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کی تفسیر کے متعلق نقلی روایات وارد نہیں ہوئیں، پھر پہلے حصے کی تفسیر یا تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یا صحابہ کرام یا کبار تابعین سے منقول ہوگی، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیر ہو تو اس میں سند کی صحت سے بحث کی جائے گی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے منقول تفسیر میں دیکھا جائے گا کہ اگر وہ تفسیر لغوی

اعتبار سے بیان کی گئی ہے تو چونکہ وہ اہل زبان تھے، اس لیے اس تفسیر پر اعتماد کیا جائے گا یا وہ تفسیر اسباب وقرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مشاہدہ کے پیش نظر ہوگی تب بھی اس تفسیر کی قبولیت میں شک نہ ہوگا۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ اگر صحابہ کرام کی تفاسیر میں بظاہر اختلاف وتعارض واقع ہور ہا ہو تو اگر جمع وتطبیق ممکن ہو تو جمع وتطبیق کی صورت نکالی جائے گی اور اگر جمع وتطبیق ممکن نہ ہو تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ تفسیر مقدم کی جائے گی، اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صحت تاویل کی خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ التَّأْوِیْل'' اے اللہ! ان کو تاویل قرآنی کا علم مرحمت فرما۔

تفسیر بالرأی سے کیا مراد ہے؟

''مَنْ تَکَلَّمَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِہٖ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ''.

ترجمہ: ''جس نے قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے سے کلام کیا تو باوجود صحیح تفسیر کرنے کے اس نے غلطی کی''۔

جان لینا چاہیے کہ مذکورہ بالا حدیث میں ممنوعہ تفسیر بالرائی کی تشریح وتوضیح میں علماء کرام کی آراء مختلف ہیں کہ اس تفسیر بالرائی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد مبارک کیا ہے؟ یہ الفاظ نسائی، ابوداؤد، اور ترمذی کے ہیں، جبکہ ایک روایت میں ''مَن قال'' اور ایک دوسری روایت میں ''مَنْ فَسّر الْقُرآن'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

''مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ''.

ترجمہ: ''جس نے قرآن کریم میں بغیر علم کے کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''۔

اسی طرح اس حدیث کے متعلق بھی علماء کرام کا اختلاف ہے کہ اس میں تفسیر بدون علم سے کیا مراد ہے؟ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے نقل فرمایا ہے۔ پہلی حدیث کی صحت کے متعلق علماء کرام نے بحث فرمائی ہے اور جب بعض قرائن سے اس کی صحت ثابت ہوئی، تب علامہ بیہقی رحمہ اللہ

نے فرمایا کہ: اس رائے سے مراد ''واللہ اعلم'' وہ رائے ہے جو بغیر کسی دلیل کے قائم کی جائے۔ البتہ جو رائے برہان ودلیل سے مؤید ہو، وہ رائے جائز ہے اور حدیث مذکور کے اس ٹکڑے:
''فأصاب فقد أخطأ'' (اگر درست تفسیر بھی بیان کرلے، تب بھی اس نے غلطی کی) کا مطلب امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''المدخل'' سے یوں نقل فرمایا ہے کہ: اگرچہ اس نے تفسیر میں درست تو کہا لیکن اس صحیح رائے زنی کے لیے جو طرز وطریقہ اس نے اختیار کیا، اس میں اس سے خطا ہوئی، اس لیے کہ صحیح طرز تو یوں تھا کہ سب سے پہلے اس کے الفاظ کی تفسیر کے لیے اہل زبان کی طرف رجوع کرتا، پھر اس کے ناسخ ومنسوخ اور سبب نزول کے متعلق تأمل وتفحص کرتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے قرآن کریم کی وحی کے زمانہ کا مشاہدہ کیا ہے اور ہم تک وہ سنن واحادیث نقل فرمائی ہیں جو کلام اللہ کی تفسیر وتشریح میں مدد کرتی ہیں، ان کے اقوال واخبار میں جس مقام کی وضاحت مطلوب ہو، اس کے متعلق غور وفکر کرتا یا پھر اس رائے سے مراد اس شخص کی رائے ہے جو علوم کے اصول وفروع جانے بغیر محض اپنی اٹکل سے رائے زنی کرے۔ چنانچہ اس کی درست بات سے اگرچہ موافقت بھی ہو جائے گی، لیکن چونکہ وہ اس درست اور صواب رائے سے ناواقف بھی ہے تو محض اٹکل سے رائے زنی کچھ سودمند اور قابل تعریف نہ ہوئی۔
اور دوسری حدیث کے متعلق علامہ انباری رحمہ اللہ کے بیان کردہ معانی میں سے ایک یہ ہے کہ:
مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ قَوْلاً يَعْلَمُ أَنَّ الْحَقَّ غَيْرُهُ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ
یعنی جس شخص نے قرآن کی تفسیر وتوضیح میں حق کے خلاف رائے زنی کی، باوجودیکہ حق کو جانتا ہو تو یہ شخص اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔
امام سیوطی نے ''الاتقان'' میں لکھا ہے کہ: ابن نقیب حنفیؒ فرماتے ہیں کہ تفسیر بالرائی کے متعلق علماء کرام سے پانچ اقوال منقول ہیں:
۱۔ جو علوم تفسیر قرآن کے لیے بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو حاصل کیے بغیر تفسیر قرآن بیان کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ علوم تفسیر کے لیے بمنزلہ شرائط کے ہیں اور ان کے حصول

اوران میں رسوخ کے بغیر تفسیر قرآن جائز نہیں ہے۔

۲۔ متشابہات کی تفسیر جن کا حقیقی علم صرف خدائے واحد کو ہے اس کی تفسیر کرنا تفسیر بالرائی ہے۔قال السیوطی فی الاتقان الثانی تفسیر المتشابه الذی لایعلمه الا الله (الاتقان:)

۳۔ مذہب فاسد کے مطابق تفسیر کرنا، بایں طور کہ مذہب کو اصل اور تفسیر کو تابع بنادیا جائے جس طرح ممکن ہو اگرچہ تفسیر ضعیف بھی ہو، اس کو لے کر مذہب فاسد کے موافق کردیا جائے۔

۴۔ بغیر کسی دلیل کے قطعی طور پر کسی تفسیر کو خدائے قدوس کی مراد ٹھہرادینا۔

۵۔ اپنی خواہش وہوس کے پیش نظر تفسیر بیان کرنا۔

راقم الحروف سید بنوری کہتا ہے کہ اس موقع پر قول فیصل وہ ہے جو امام خازن رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور ہمارے استاذ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی اس قول کو پسند فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ علماء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں اپنی رائے سے تفسیر کرنے کے متعلق جو ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے، یہ ممانعت اس شخص کے حق میں ہے جو اپنے جی کی مراد اور اپنی من چاہی تاویل وتفسیر بیان کرتا ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ شخص یا تو علم رکھتا ہوگا یا نہیں؟ اگر علم رکھتا ہے تو یہ اس شخص کی طرح ہوگا جو قرآن کی بعض آیات کو لے کر اپنی کسی بدعت کی درستگی اور استناد کے لیے دلیل بنا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ آیت کی مراد کچھ اور ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی بدعت کی تصحیح کے لیے آیت کے ذریعے اپنی دلیل کو قوی قرار دے کر مخالف فریق کو التباس وپریشانی میں مبتلا کردے، جیسا کہ فرقۂ باطنیہ، خوارج اور دیگر بدعتی فرقوں نے اپنے فاسد مقاصد کی تکمیل کے لیے یہ وطیرہ استعمال کیا، تاکہ لوگوں کو دھوکہ وفریب میں مبتلا کریں، اور اگر قرآن میں یہ رائے زنی بغیر علم کے محض جہالت سے ہو، بایں طور کہ آیت بہت سی وجوہ واسباب کا احتمال رکھتی ہو اور وہ شخص قرائن سے صرف نظر کر کے ان وجوہ محتملہ کے علاوہ آیت کی کسی اور وجہ سے تفسیر وتشریح

کرے، یہ دونوں طرز، غلط اور قابل مذمت ہیں۔ اور یہ دونوں اس ممانعت اور وعید میں داخل ہیں جو قرآن میں رائے زنی کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

اور وہ جو طرز تاویل جس کی تفصیل یوں ہے کہ استنباط واجتہاد سے آیت کو اس کے مطابق معنیٰ کی طرف پھیر دیا جائے۔ اور آیت کا سیاق وسباق اس معنیٰ کا احتمال بھی رکھتا ہو۔ اسی طرح یہ معنیٰ قرآن وسنت کے مخالف بھی نہ ہو، اس کے بارے میں علماء کرام نے گنجائش فرما رکھی ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کی تفسیر بیان فرمائی اور اپنی تفسیری روایات میں ان کے درمیان اختلاف بھی واقع ہوا، اور یہ بات بھی نہ تھی کہ تمام صحابہ کرام صرف وہی تفسیر کرتے ہوں، جو انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی ہو، بلکہ جتنا وہ سمجھتے اور لغوی معنیٰ ومفہوم کو جانتے، اس کے بقدر تفسیر بھی فرمایا کرتے تھے (اور یہی تاویل ہے) اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے باقاعدہ یوں دعا فرمائی:

''اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْل ''۔ اسی بنا پر صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ تفسیری روایات انہی کی منقول ہوئی ہیں۔

ہمارے شیخ استاذ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے صحیح البخاری کی ''أمالي'' [فیض الباری۔ ۴/۱۵۰] میں یوں فرمایا ہے کہ: اگر کسی شخص کی اپنی رائے کے مطابق بیان کردہ تفسیر سے کوئی متفق ومجمع علیہ مسئلہ متغیر نہ ہوتا ہو، اسی طرح سلف صالحین کے متفقہ عقائد میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی ہو تو ایسی تفسیر اس ممنوع تفسیر بالرائی کے ضمن میں شمار نہ ہوگی۔ البتہ اگر کسی متفقہ متواترہ مسئلہ میں تغیر آجائے یا مقررہ عقیدے میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہو، تب یہ تفسیر، ممنوعہ تفسیر بالرائی میں شمار کی جائے گی۔ نیز ایسی رائے زنی کرنے والا جہنم کا مستحق ہوگا۔ یہ بات کہ تفسیر، تفسیر بالرائی کے زمرے میں داخل نہ ہو، اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ مفسرین کرام کے طرز طریق سے خوب واقفیت حاصل نہ کرلی جائے۔

(بحوالہ اصول تفسیر وعلوم القرآن ترجمہ یتیمۃ البیان ص: ۶۹ تا ۷۵)

اب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی تفسیر معارف القرآن سے ایک پُر مغز کلام ملاحظہ فرمائیں جس میں آپ نے مفسرین کی تفاسیر کے یہ مأخذ کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ وہ معارف القرآن کے مقدمہ ص: ۵۰ سے ۵۵ تک لکھتے ہیں:

تفسیرِ قرآن کے مآخذ

علم تفسیر کو اس امت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کیسی کیسی مشقتیں اٹھائیں؟ اور یہ جدّ وجہد کتنے مراحل سے گزری؟ اس کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں، لیکن یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ تفسیر قرآن کے مآخذ کیا کیا ہیں؟ اور علم تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہر زبان میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے استفادہ کیا ہے، یہ سرچشمے کل چھ ہیں:

ا۔ قرآن کریم:

علم تفسیر کا پہلا مأخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ کی دعاء میں یہ جملہ موجود ہے کہ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ یعنی ہمیں ان لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا'' اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور سے متعین کر دیا گیا، چنانچہ ارشاد ہے ﴿فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ﴾ (۶۹:۴)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ۔

چنانچہ مفسرین کرام رحمہم اللہ جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب

سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔ (یاد رہے کہ تفسیر قرآن بالقرآن باقاعدہ تفسیر نہیں ہے بلکہ یہ اجمال کی تفصیل ہوتی ہے اور ابہام کی وضاحت ہوتی ہے: جو لوگ قرآن کی تفسیر احادیث کے ذریعہ سے نہیں کرنا چاہتے ہیں اور اہل حق مفسرین کی اتباع بھی نہیں کرنا چاہتے ہیں وہ تفسیر القرآن بالقرآن پر بہت زور دیتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے ایک مضمون بنا کر قرآن کی کسی آیت کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں اور یا کسی آیت کی تائید میں قرآن کی دوسری آیت پیش کرتے ہیں اور اس کو تفسیر القرآن بالقرآن کہتے ہیں مثلاً مولانا حمید الدین فراہی صاحب جو تفسیر القرآن بالقرآن کا بڑا داعی گزرا ہے انہوں نے سورت الفیل میں ﴿اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ﴾ کی اس طرح شواہد پیش کر کے تفسیر کی ہے ﴿اِنَّهُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّاَکِیْدُ کَیْدًا﴾ (طارق) ﴿فَجَمَعَ کَیْدَهٗ ثُمَّ اَتٰی﴾ (طٰہٰ) ﴿لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُهُمْ شَیْئًا﴾ (ال عمران) ﴿وَاُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ﴾ (اعراف) ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ کَیْدِ الْکَافِرِیْنَ﴾ (انفال) ﴿اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطَانِ کَانَ ضَعِیْفًا﴾ (نساء) تفسیر کچھ بھی نہیں صرف تائیدات اور شواہد کو تفسیر کہہ دیا اور فخر کیا ایک شعر بھی پیش کر دیا

یقودهم النعمان منه بمصحف   وکید الخارجی مناجد (نابغہ)

(تفسیر نظام القرآن ص:۴۶۲)

یہ ان لوگوں کے ہاں تفسیر ہے اور اس پر فخر کرتے ہیں اہل باطل منکرین حدیث کی تفاسیر کا یہی حال ہے جس کا تذکرہ آئندہ ہوگا۔

۲۔ حدیث

''حدیث'' آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپؐ کو مبعوث ہی اس لیے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرما دیں، چنانچہ آپ ﷺ نے

اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے، اس لیے مفسرین کرام رحمہم اللہ نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعیّن کیے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لیے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصولوں پر پوری نہ اترتی ہو، لہٰذا جو روایت جہاں بھی نظر آجائے اسے دیکھ کر قرآن کریم کی کوئی تفسیر متعین کر لینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہوسکتی ہے، درحقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اور اس میں قدم رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جنہوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

۳۔ صحابہؓ کے اقوال

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن کریم کی تعلیم براہِ راست آنحضرت ﷺ سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزولِ وحی کے وقت وہ بہ نفسِ نفیس موجود تھے، اور انہوں نے نزولِ قرآن کے پورے ماحول اور پسِ منظر کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا، اس لیے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابلِ اعتماد ہو سکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرامؓ کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر پر صحابہؓ کا اتفاق ہو تو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں سمجھتے، ہاں! اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد اصولِ فقہ، اصولِ حدیث اور اصولِ تفسیر میں مدوّن ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴۔ تابعین

صحابہؓ کے بعد تابعین رحمہم اللہ کا نمبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام سے سیکھی ہے، اس لیے ان کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعینؒ کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ (الاتقان ۱۷۹/۲) لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ لغت عرب

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لیے تفسیر قرآن کے لیے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پسِ منظر میں چونکہ کوئی شانِ نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لیے ان کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ یا تابعینؒ کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ ان کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں محاکمہ کے لیے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ تدبر اور استنباط

تفسیر کا آخری مأخذ ''تدبر اور استنباط'' ہے قرآن کریم کے نکات واسرار ایک ایسا بحرِ ناپید کنار ہے، جس کی کوئی حدّ ونہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی وہ جتنا جتنا اس میں غور وفکر کرتا ہے اتنے ہی نئے نئے اسرار ونکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرام اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار ونکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ مآخذ سے متصادم نہ ہوں، لہٰذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن وسنت، اجماع، لغت یا

صحابہ وتابعین کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، بعض صوفیاء نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کیے تھے، لیکن امت کے محقق علماء نے انہیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن وسنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ (اتقان ۱۸۴/۲)

اسرائیلیات کا حکم

''اسرائیلیات'' اُن روایتوں کو کہتے ہیں جو اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، پہلے زمانے کے مفسرین کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کی وہ روایات لکھ دیتے تھے جو انہیں سند کے ساتھ پہنچتی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لیے ان کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام اور تابعین پہلے اہل کتاب کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انہیں قرآن کریم میں پچھلی امتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انہوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انہوں نے اپنے پرانے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوگئی ہیں، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات جن کی سچائی قرآن وسنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

(۲) وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن وسنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہوگئے

تھے، اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد ہے کہ: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۱۰۲:۲)

اور سلیمان کافر نہیں ہوئے، بلکہ شیاطین نے کفر کیا: اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار "اُوْرِیا" کی بیوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مروا کر اس کی بیوی سے نکاح کرلیا، یہ بھی کھلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

(۳) وہ روایات جن کے بارے میں قرآن وسنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ تورات کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، نہ ان کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے قول فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انہیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں ہے۔ (مقدمہ تفسیر ابن کثیر)

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو وصرف اور لغت وادب کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ وتفسیر اور عقائد وکلام کا وسیع وعمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لیے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان

پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کردیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شُد ھ بُد ھ رکھنے والے لوگ جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کردیتے ہیں، بلکہ پرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ انتہائی خطرناک طرزِ عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لیجاتا ہے، دنیوی علوم وفنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرلے تو دنیا کا کوئی صاحب عقل اسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کرسکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کرسکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل نہ کی ہو، اس لیے کہ ڈاکٹر بننے کے لیے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی دان انجینیرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینئر تسلیم نہیں کرسکتا، اس لیے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا، بلکہ اس کے لیے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لیے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن وحدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہوسکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم وفن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کیے بغیر اس علم وفن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن وسنت اتنے لاوارث کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان کی تشریح وتفسیر کے لیے کسی علم وفن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کردے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ﴾ (۵۴:۱۷)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لیے کسی لمبے چوڑے علم وفن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت وموعظت کے مضامین بیان کیے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت ودوزخ کے حالات، خوف خدا اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، مذکورہ بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کر دیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ: للذکر: (نصیحت کے واسطے) اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام وقوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہ، سمجھنا اور ان سے احکام ومسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لیے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے۔ علامہ سیوطیؒ نے امام ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق

تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں، وہ فرماتے تھے کہ:

تعلّمنا القراٰن وَالُعلْم وَالعملَ جميعًا

''ہم نے قرآن اور علم وعمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے''۔ (اتقان ۲/۶ نمبر ۱۷)

چنانچہ موٴطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۂ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کیے، اور مسند احمد میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔

(اتقان ۲/۶ ۱۷ انوع ۷۷)

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعر وادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لیے اتنی طویل مدّت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لیے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عربی زبان کی مہارت اور نزولِ وحی کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود ''عالم قرآن'' بننے کے لیے باقاعدہ حضور سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزول قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شُد بُد پیدا کر کے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسر قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

''جو شخص قرآن کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں

بنالے''۔ (ابوداؤد، ازاتقان ۱۷۹/۲)

اور: مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَأْيِهٖ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ

''جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرلے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہدے تب بھی اس نے غلطی کی''۔ (ابوداؤد، نسائی، ازاتقان ۱۷۹/۲)

(بحوالہ مقدمہ معارف القرآن ص: ۵۰ تا ص: ۵۵)

محترم قارئین! قرآن عظیم کی تفسیر کے لیے مآخذ کا بہترین اور بھرپور کلام حضرت مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع ؒ کی تحقیق میں آپ نے پڑھا اب حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کا ایک مختصر مگر پُر مغز کلام کو بھی ملاحظہ فرمائیں حضرت سید محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں:

تفسیر قرآن میں محض لغت اور تاریخ پر اعتماد

اس بحث کے متعلق میں نے اس لیے کچھ تفصیل سے کام لیا کہ آج کل بہت سے ہم عصر اہل علم حضرات کو دیکھتا ہوں کہ جب قرآن پاک کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ احادیث وآثار سے وہ بے نیاز ہیں اور محض لغت وتاریخ پر اعتماد کر کے سنت اور اجماع امت سے آنکھیں بند کر کے صَرفِ نظر کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں، بلکہ ان کی قدر ومنزلت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے بارے میں اپنی ہوس وخواہش کے پیش نظر جو چاہتے ہیں کہتے پھرتے ہیں۔ جہاں احادیث وآثار ان کی رائے کے خلاف ہوں وہاں ان کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، یہی الحاد وزندیقیت کا پہلا دروازہ ہے جس کے لیے سرسید احمد خان اور عنایت اللہ مشرقی کی تفاسیر ہی کو ملاحظہ کر لیجئے کہ کس طرح تاریخ (جس کی بنیاد ہی بودی اور مضطرب ہے اور انہی کمزور رائے) کو فہم قرآن اور بلند پایہ الفاظ نصوص کے حل کے لیے مدار ومرکز ٹھہرایا ہے، ان کی تفسیر کے متعلق اگلے صفحات میں کلام کیا جائے گا ''ان شاء اللہ'' انہی کی مانند دیگر ہم عصر نے بھی یہ طرز اپنا رکھا ہے، اللہ ہی توفیق دینے والے ہیں اور وہی حق کی طرف

رہبری اور ہدایت فرمانے والے ہیں۔ (اصول تفسیر وعلوم قرآن ص:۶۸)

حکایت

یہاں ایک قصہ ملاحظہ فرمائیں جس کو میں نے اپنے استادوں سے سنا ہے اور مکہ مکرمہ میں انجینئر جناب حاجی عبدالمنان صاحب کی مجلس میں بھی اس کا تذکرہ ہوا کہ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ نے ایک ملاقات میں ڈاکٹر اقبال مرحوم سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم کون ہے ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا کہ آپ تھوڑی دیر صبر کریں بتاتا ہوں یہ کہہ کر ڈاکٹر اقبال اپنے گھر کے اندر کمرہ میں گئے اور وہاں سے قرآن عظیم کا بہت پرانا نسخہ لائے جو کئی کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ حضرت! اللہ تعالیٰ کا یہ کلام قرآن مجید آسمان کے نیچے سب سے زیادہ مظلوم کتاب ہے پھر کہنے لگے کہ یہ اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ یہ ایک تفسیر ہے جو ایک انگریز نے لکھی ہے تو اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب اتنی مظلوم ہے کہ انگریز کفار اس پر تجربہ کر کے تفسیریں لکھ رہے ہیں اور مسلمان خاموش ہیں۔

واقعی حقیقت یہی ہے کہ اہل باطل منافقین اور ملحدین اپنے باطل نظریات کو پھیلانے کے لیے اور رواج دینے کے لیے تفاسیر لکھتے ہیں اور اسلامی احکامات میں تحریفات کرتے ہیں جس طرح جناب غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' کا حال قارئین بہت جلد پڑھ لیں گے۔ نیز سرسید احمد خان اور چوہدری غلام احمد خان پرویز اور علامہ عنایت اللہ مشرقی کی تفاسیر کا حال معلوم ہو جائے گا۔ بہر حال حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے مقدمہ معارف القرآن میں نو بڑی تفاسیر کا تذکرہ فرمایا ہے اور تبصرہ کے ساتھ کلام کیا ہے اگرچہ ان تفاسیر کا نام طبقات مفسرین میں آیا ہے لیکن مزید فائدہ کے لیے حضرت مفتی صاحب کا مبارک کلام بھی پیش کرنا چاہتا ہوں وہ فرماتے ہیں:

مشہور تفاسیر

عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے قرآن کریم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں، بلکہ دنیا کی

کسی کتاب کی بھی اتنی خدمت نہیں کی گئی، جتنی قرآن کریم کی کی گئی ہے، ان سب تفاسیر کا تعارف کسی مفصل کتاب میں بھی ممکن نہیں، چہ جائیکہ اس مختصر مقدمہ میں اس کا ارادہ کیا جائے، لیکن یہاں ہم ان اہم تفاسیر کا مختصر تعارف کرانا چاہتے ہیں جو معارف القرآن کا خاص مآخذ رہی ہیں، اور جن کا حوالہ معارف القرآن میں بار بار آیا ہے، اگرچہ معارف القرآن کی تصنیف کے دوران بہت سی تفاسیر اور سینکڑوں کتابیں پیش نظر رہی ہیں، لیکن یہاں صرف ان تفاسیر کا تذکرہ مقصود ہے جن کے حوالے بکثرت آئیں گے۔

تفسیر ابن جریر:

اس تفسیر کا اصل نام ''جامع البیان'' ہے اور یہ علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ) کی تالیف ہے، علامہ طبری اونچے درجے کے مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں، منقول ہے کہ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھنے میں مشغول رہے، اور ہر روز چالیس ورق لکھنے کا معمول تھا (البدایہ والنہایہ ص ۱۴۵ جلد ۱۱) بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے، لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے جلیل القدر عالم ہیں، بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر تیس جلدوں میں ہے، اور بعد کی تفاسیر کے لیے بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جو قول ان کے نزدیک، راجح ہوتا ہے اسے دلائل کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں، البتہ ان کی تفسیر میں صحیح وسقیم ہر طرح کی روایات جمع ہوگئی ہیں، اس لیے ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انہیں دستیاب ہوسکیں ان سب کو جمع کردیا جائے، تاکہ اس جمع شدہ مواد سے کام لیا جاسکے، البتہ انہوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذکر کی ہے، تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کرکے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا

فیصلہ کر سکے۔

تفسیر ابن کثیر:

یہ حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمہ اللہ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے، جو آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں، ان کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دیا گیا ہے، اور خاص بات یہ ہے کہ مصنف روایتوں پر محدثانہ تنقید بھی کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب تمام کتب تفاسیر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تفسیر القرطبی:

اس کا پورا نام "الجامع لاحکام القرآن" ہے اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے جو فقہ میں امام مالک کے مسلک کے پیرو تھے، اور عبادت و زہد کے اعتبار سے شہرہ آفاق تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انہوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے، اور بار بار شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر کبیر:

یہ امام فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے اور اس کا اصلی نام "مفاتیح الغیب" ہے، لیکن "تفسیر کبیر" کے نام سے مشہور ہے، امام رازی متکلمین اسلام کے امام ہیں، اس لیے ان کی تفسیر میں عقلی اور کلامی مباحث اور باطل فرقوں کی تردید پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حل قرآن کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہے۔ اور اس میں جس دل نشین انداز میں

قرآن کریم کے معانی کی توضیح اور آیات قرآنی کے باہمی ربط کی تشریح کی گئی ہے، وہ بڑا قابل قدر ہے، اغلب یہ ہے کہ امام رازی رحمہ اللہ نے سورۂ فتح تک کی تفسیر خود لکھی ہے، اس کے بعد وہ اسے پورا نہ کر سکے، چنانچہ سورۂ فتح سے آخر تک کا حصہ قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقی (متوفی ۶۳۹ھ) یا شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولی رحمہ اللہ (متوفی ۷۰۷ھ) نے مکمل فرمایا۔

(کشف الظنون ۲/۴۷۷)

امام رازیؒ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق چونکہ کلامی بحث اور باطل فرقوں کی تردید پر خاص طور پر زور دیا ہے، اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بہت سے مقامات پر انتہائی طویل ہوگئی ہیں، اس لیے بعض حضرات نے ان کی تفسیر پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ "فِيهِ كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا التَّفْسِيرُ" (اس کتاب میں تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے) لیکن یہ تبصرہ تفسیر کبیر پر بڑا ظلم ہے، اور حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، کہ حل قرآن کے لحاظ سے بھی اس تفسیر کا پایہ بہت بلند ہے، البتہ چند ایک مقامات پر انہوں نے جمہور امت کی راہ سے ہٹ کر آیات قرآنی کی تفسیر کی ہے، لیکن ایسے مقامات آٹھ ضخیم جلدوں کی اس کتاب میں خال خال ہیں۔

تفسیر البحر المحیط :

یہ علامہ ابوحیان غرناطی اندلسی (متوفی ۷۵۴ھ) کی تصنیف ہے جو اسلامی علوم کے علاوہ علم نحو و بلاغت میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کی تفسیر میں نحو و بلاغت کا رنگ نمایاں ہے، وہ ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اختلاف اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیتے ہیں۔

احکام القرآن للجصاص :

یہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ (متوفی ۳۷۰ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہائے حنفیہ میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی اس کتاب کا موضوع قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط ہے، اور

انہوں نے مسلسل آیتوں کی تفسیر کے بجائے صرف ان آیتوں کی فقہی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو فقہی احکام پر مشتمل ہیں، اس موضوع پر اور بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو ان سب میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

تفسیر الدر المنثور:

یہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (متوفی ۹۱۰ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا پورا نام "الدر المنثور فی التفسیر الماثور" ہے، اس میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ان تمام روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق ان کو ملی ہیں، ان سے پہلے بہت سے محدثین مثلاً حافظ ابن جریر، امام بغوی، ابن مردویہ، ابن حبان، اور ابن ماجہ وغیرہ اپنے اپنے طور پر یہ کام کر چکے تھے۔

علامہ سیوطی نے ان سب کی بیان کردہ روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، البتہ انہوں نے روایات کے ساتھ ان کی پوری سند ذکر کرنے کے بجائے صرف اس مصنف کا نام ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے جس نے اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا ہے، تاکہ بوقت ضرورت اس کی مراجعت کر کے سند کی تحقیق کی جاسکے، چونکہ ان کا مقصد روایات کے ذخیرہ کو یکجا کرنا تھا، اس لیے اس کتاب میں بھی صحیح و سقیم ہر طرح کی روایتیں جمع ہوگئی ہیں، لہٰذا سند کی تحقیق کیے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاسکتا، علامہ سیوطی بعض مرتبہ ہر روایت کے ساتھ یہ بھی بتادیتے ہیں کہ اس کی سند کس درجہ کی ہے، لیکن چونکہ تنقید حدیث کے معاملہ میں وہ خاصے متساہل مشہور ہیں، اس لیے اس پر بھی کما حقہ اعتماد کرنا مشکل ہے۔

تفسیر مظہری:

یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف ہے اور انہوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جانِ جاناں دہلوی رحمہ اللہ کے نام پر اس تفسیر کا نام "تفسیر مظہری"

رکھا ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لیے نہایت مفید، انہوں نے الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔

روح المعانی:

اس کا پورا نام "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی" ہے، اور یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ محمد آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۷۰) کی تصنیف ہے اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے، انہوں نے اپنی اس تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانے کی کوشش کی ہے لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہیئت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ کی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے، روایات حدیث کے معاملے میں بھی اس کے مصنف دوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے یہ بڑی جامع تفسیر ہے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ (ماخوذ از مقدمہ معارف القرآن جلد اول ص: ۵۰ تا ۵۵)

باطل پرستوں کی تفاسیر کا جائزہ

میں خود حیران ہوں کہ جو لوگ نہ مدارس کے علماء ہیں نہ انہوں نے مدارس اسلامیہ میں پڑھا ہے نہ ان کے سامنے طلباء کا مجمع ہے نہ دینی مدارس میں ان کی کوئی شہرت ہے نہ ان کو حدیث وفقہ کی کسی کتاب کی تشریح وتوضیح کی خدمت کی توفیق ہوئی نہ ان کو تفسیر قرآن لکھنے کی کوئی ایسی مجبوری ہے جس کے بغیر ان کی زندگی گزر نہیں سکتی ہے نہ ان کو قرآن عظیم کے درسوں سے کوئی ایسی الفت ومحبت اور شغف ہے کہ وہ دن رات اسی شوق میں پڑے ہوئے ہیں نہ وہ لوگ امت کے لیے تقویٰ کا نمونہ ہیں نہ ان لوگوں نے عوامی حلقوں میں قرآن عظیم کے درسوں کا اہتمام کیا نہ تعلیمی

حلقوں کے طلباء اور علماء کو ان کی تفاسیر کی طرف کوئی مجبوری ہے پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ ایک دم قرآن عظیم کی تفسیر کے میدان میں کود پڑے ہیں؟ اور دھڑ ادھڑ انہوں نے قرآن عظیم کی تفاسیر لکھ کر ڈھیر لگا دیئے ہیں مثلاً غلام احمد قادیانی جنہوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا ان کو کیا ضرورت تھی کہ انہوں نے ایک ضخیم تفسیر لکھدی؟ چوھدری غلام احمد خان پرویز کو کس احساس نے مجبور کیا کہ اس نے معارف القرآن اور پھر مطالب الفرقان دو تفسیریں لکھ ڈالیں۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی کو کیوں شوق پیدا ہوا کہ اس نے ''تذکرہ'' کے نام سے ایک ضخیم تفسیر لکھدی علامہ وحید الدین خان کو کس شوق نے بے چین کیا کہ اس نے تذکیر القرآن کے نام سے تفسیر لکھدی۔ عبداللہ چکڑالوی کی کیا مجبوری تھی کہ اس نے قرآن کی تفسیر لکھدی سر سید احمد خان کو کس چیز نے مجبور کیا کہ اس نے تفسیر القرآن کے نام سے ایک لمبی چوڑی تفسیر لکھ ڈالی حکیم محمد حسن امروہی قادیانی مرزائی نے آخر کس جذبہ کے تحت ''غایۃ البیان'' کے نام سے تفسیر لکھدی پھر محمد علی قادیانی کو کس چیز نے مجبور کیا کہ اس نے تفسیر لکھدی؟ مرزا بشیر الدین محمود قادیانی نے تفسیر کبیر کے نام سے کیوں تفسیر لکھدی؟ مرزا طاہر احمد قادیانی نے کس غرض سے تفسیر لکھدی؟ نور الدین قادیانی نے کیوں تفسیر لکھدی؟

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور امین احسن اصلاحی صاحب کو تفسیر لکھنے کا شوق کیوں پیدا ہوا کہ اول الذکر نے تفہیم القرآن اور ثانی الذکر نے تدبر قرآن کے نام سے تفسیر لکھدی۔

مولانا حمید الدین فراہی نے آخر تمام مفسرین کے طرز و طریق کو چھوڑ کر الگ طرز پر نظام القرآن کیوں لکھ دی جو چند سورتوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن سے نقل کر کے ناکام ناقل جناب جاوید احمد غامدی صاحب کو کس چیز نے مجبور کیا کہ اس نے البیان کے نام سے تفسیر لکھدی؟

ان تمام سوالوں کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ اہل باطل تھے اور ان کے نظریات شریعت مطہرہ سے متصادم تھے ان غلط نظریات کے پھیلانے کے لیے ان لوگوں نے قرآن عظیم کو ڈھال بنا دیا

کہ لوگ ان کے نظریات اس لیے قبول کریں گے کہ یہ تو اتنے بڑے لوگ ہیں کہ انہوں نے قرآن کی تفسیریں لکھدی ہیں اور یہ مفسرین ہیں پھر یہ لوگ نہایت چالاکی سے اپنے غلط نظریات کو اپنی غلط تفاسیر میں لکھنے لگے اور لوگ اس کی وجہ سے دھوکہ میں پڑ گئے کہ دیکھو جی قرآن کی تفسیر میں یہ لکھا ہے اس طرح لوگ گمراہ ہونے لگے مجھے کسی سے کوئی تعصب یا عداوت نہیں ہے اگر یہ لوگ واقعی قرآن عظیم کے مفسر تھے اور امت کے خیر خواہ تھے تو انہوں نے سلف صالحین اور تمام مفسرین کا صحیح راستہ کیوں اختیار نہیں کیا؟ خود ساختہ نیا راستہ اختیار کر کے انہوں نے صریح غلطی اور کھلی گمراہی کی باتیں اپنی تفسیروں میں کیوں لکھدیں؟

میں قطعاً یہ طاقت نہیں رکھتا کہ ان تمام حضرات کی تمام غلطیاں اپنی اس مختصر کتاب میں درج کردوں میں صرف جاوید احمد غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' کی موٹی موٹی غلطیاں مسلمانوں کے سامنے لانا چاہتا ہوں جس کے ضمن میں امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کی غلطیوں کا بھی کچھ تذکرہ ہوگا اسی طرح اس کے استاذ حمید الدین فراہی صاحب کے غلط رخ پر چلنے کا کبھی کبھار ذکر آئے گا تاہم اہل باطل کی مذکورہ بالا چند متداول تفاسیر سے میں چند عبارات نقل کروں گا تاکہ علماء اور عوام کے لیے بطور نمونہ کوئی چیز سامنے آجائے اور یہ مصرع صادق آجائے کہ:

ع قیاس کن زِ گلستان من بہار مرا۔

آخر میں، میں علماء کرام سے اپیل کروں گا کہ جو لوگ دانشور بن کر اسلام اور اہل حق مفسرین پر صدیوں سے اعتراض کرتے چلے آئے ہیں اور علماء صدیوں سے دفاع کر کے ان کو جوابات دے رہے ہیں اب یہ طریقہ چھوڑ دینا چاہیے اب باطل پرستوں کے خلاف جارحانہ انداز سے علمی محاسبہ شروع کر دینا چاہیے اور علمی حملے جاری رکھنے چاہیے۔

صدیوں سے اہل باطل کے اعتراضات کے جوابات علماء کرام نے دفاعی انداز سے دیئے ہیں اب ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے غلط تفاسیر کی غلطیوں کی نشاندھی کی ضرورت ہے۔

باطل پرست مفسرین کا اقرار

اہل باطل کی خواہش پرست مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ سلف صالحین کے عام مفسرین کے راستے پر نہیں چلیں گے ان کا کھلے الفاظ میں یہ اقرار ہے کہ وہ مروجہ تفاسیر کا روایتی راستہ اپنی تفاسیر میں اختیار نہیں کریں گے بلکہ وہ ایک ایسا نیا راستہ اختیار کریں گے جس کو معاشرہ کے نوجوان اور عوام الناس پسند کریں گے کیونکہ تفاسیر میں پرانا روایتی اور تقلیدی راستہ اب مقبول نہیں رہا ہے کیونکہ وہ اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس جدید طرز کے بانی اور موجد سر سید احمد خان صاحب گزرے ہوئے اہل حق مفسرین کے بارے میں اس طرح یاوہ گوئی کرتے ہیں افکار سرسید نام کی کتاب ص: ۳۸، ۳۹ میں مولانا ضیاء الدین لاہوری نے سرسید کی عبارات کو اس طرح نقل کیا ہے۔

سرسید احمد خان کا اقرار

(۱) صرف کتاب اللہ یعنی قرآن مجید ایسا تھا جو تمام آفات سے محفوظ تھا مگر مفسرین نے اس پر بھی رحم نہیں کیا اور اپنی تفسیروں میں ضعیف و موضوع روایتیں لکھنی شروع کیں اور بے اصل قصے، جو اکثر بلکہ کلیتاً یہودیوں کے ہاں سے اخذ کئے تھے، ان میں شامل کیے اور رفتہ رفتہ وہ تفسیریں نہایت اعتبار اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگیں۔ پھر اس پر قیاسات اور اجتہادات نے بہت کچھ اضافہ کیا اور مذہب اسلام ایک مجموعہ صحیح و غلط مسائل کا اور واقعی و غیر واقعی واقعات کا بن گیا۔

(۲) تمام مفسرین کی، سوائے معتزلہ کے، یہ عادت ہے کہ اپنی تفسیروں میں محض بے سند اور افواہی روایتوں کو بلا تحقیق لکھتے چلے جاتے ہیں اور ذرا بھی تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ سیدھی سادھی بات کو بھی عجوبہ بات بنا کر بیان کرتے ہیں اور سنی سنائی باتیں نا تحقیق اور قصے اور کہانیاں اس میں شامل کر دیتے ہیں۔

ضعیف اور موضوع بے اصل روایتوں کو اپنی تفسیروں کا زیور سمجھتے ہیں اور کیسی ہی ضعیف و بے اصل روایت ان کے کان تک پہنچے، قرآن مجید کے اصل مطلب پر غور کیئے بغیر قرآن کی آیتوں کو توڑ مروڑ کر ان بے اصل روایتوں کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔

کسی کے ہاں کا قصہ ہو، جب وہ اپنی تفسیروں میں اس کو داخل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ایک مصنوعی روایت داخل کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ مسلمانی روایت ہے۔ اپنی تصنیفات کا حکم بڑھانے کی نیت سے، نیز اپنی کامل آگہی کی غرض سے ہمارے مفسرین اور اہل سیر نے تمام مہمل اور بے ہودہ افسانوں کو جو عوام الناس میں مشہور تھے، بکمال آرزو جمع کر کے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے۔

(۳) اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے مفسرین نے بہت سی لغو باتیں اور جھوٹی روایتیں اور یہودیوں اور مجوسیوں کی حکایتیں اپنی تفسیروں میں بھر دی ہیں۔

بعض نے اپنی تفسیروں میں واعظین کے لیے دلچسپ اور عجیب و غریب اور حُمقاء کے خوش کرنے کے لیے دور از عقل و قیاس مضامین، جو یہودیوں کے ہاں مروج تھے، جمع کر دیئے ہیں۔

(۴) تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں خواہ وہ تفسیر ابن جریر ہو یا تفسیر کبیر وغیرہ اور خواہ وہ سیرۃ ابن اسحاق ہو خواہ سیرت ابن ہشام اور خواہ وہ روضۃ الاحباب ہو یا مدارج النبوۃ وغیرہ ان میں تو اکثر ایسی لغوی اور نامعتبر روایتیں اور قصے مندرج ہیں جن کا نہ بیان کرنا ان کے بیان کرنے سے بہتر ہے۔

حضرت امام محی الدین ابن عربی.....کی تفسیر ایسی رکیک تاویلوں سے بھری ہے جس کے لیے کوئی قانون ہی نہیں۔

غرض کہ ایسی تفسیریں اور علی الخصوص وہ جو واعظین کے فائدہ کے لیے لکھی گئی ہیں اور جن میں خیالی اور بے ہودہ قصے انبیاء علیہم السلام کے بھرے ہوئے ہیں اور ملائک اور بہشت اور دوزخ اور ان کے اوصاف و خواص کے بیان کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کتب سیر سے خلاف قیاس

بیانات کو پیش کرتے ہیں سراسر غیر معتبر روایات سے مملو ہیں۔
''ابن اسحاق'' ابن ہشام، طبقات کبیر المشہور بہ واقدی، سیرت ہشامی، ابوفدا، مسعودی، مواہب لدنیہ۔

ان کے سوا عربی اور فارسی زبان میں اور بھی کتابیں ہیں جو ان ہی سے بنائی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں سے پہلی چار کتابیں بہت قدیم ہیں اور باقی بہت پچھلی۔ یہ سب کتابیں تمام سچی اور جھوٹی روایتوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مخلط مجموعہ ہے جس میں صحیح اور غلط، مشتبہ اور درست اور جھوٹی اور سچی کا کچھ امتیاز نہیں اور جو کتابیں زیادہ قدیم ہیں ان میں اس قسم کا اختلاط اور زیادہ ہے۔

میرے نزدیک سیرت ہشامی اور ابن اسحاق وغیرہ سب واہیات اور الف لیلہ اور مہا بھارت کے برابر ہیں۔ بلاشبہ میں ان کتابوں کو نہایت غیر معتبر جانتا ہوں۔ ہزاروں روایتیں غلط اور بے سند ان میں مندرج ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بھی تمام تصانیف ان ہی نامعتمد کتابوں پر مبنی ہیں۔ واقدی، ہشامی، مولود نامہ، معراج نامہ..... میں بجز بے ہودہ باتوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

واقدی کچھ بڑا معتبر شخص نہیں ہے۔ وہ تو حاطب اللیل یعنی اندھیری رات میں لکڑیاں چلنے والا ہے۔ اس کی غلط روایتوں اور جھوٹے قصہ اور کہانیوں اور بے سند باتوں سے تمام علماء نے اس کو نامعتبر ٹھہرایا ہے۔ محمد بن عبدالباقی الزرقانی..... کی کتابیں موجود ہیں جو کچھ بھی قدر و قیمت کے لائق نہیں، بجز اس کے کہ جو افواہاً اس نے سنا اور جو آواز چڑیا کی خواہ کوے کی اس کے کان میں آئی وہ اس نے لکھ دی، کوئی طریقہ و تحقیق کا اور کوئی راستہ تنقیح کا اس نے اختیار نہیں کیا۔

غرض کہ اب فن سیر کی تمام کتابیں، کیا قدیم کیا جدید، مثل ایسے غلہ کے انبار کے ہیں جس میں کنکر، پتھر، کوڑا کرکٹ کچھ چنا نہیں گیا اور ان میں تمام صحیح و موضوع، جھوٹی اور سچی، سند اور بے سند، ضعیف و قوی، مشکوک و مشتبہ روایتیں مخلوط اور گڈ مڈ ہیں۔

وہ (روایتیں) الف لیلہ و قصہ حاتم طائی سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں، اس لیے کہ اپنے ثبوت

کے لیے بالکل محتاج دوسری سند یا دلیل یا کسی اور وجہ قابل اعتماد کی ہیں۔ پس اگر وہ روایتیں اور کتابیں ہمارے مذہب کی بنیاد قرار پائیں اور ان پر مسائل مذہب کا مدار ٹھہرے تو مسلمانی مذہب تو لونڈوں کا کھیل اور دیو پری کا قصہ ہو جائے گا۔ (نعوذ باللہ منھا)

اگر ان کتابوں کو ہم استنباط مسائل مذہبی میں دخل دیں تو ہم صاف صاف ہندوؤں کے مقلد ہوں گے جنہوں نے مہابھارت کو اپنے ہاں کتب مقدسہ میں داخل کر لیا ہے۔

مسلمان مؤرخوں نے جو کتابیں اسلام کی تاریخ کی لکھی ہیں، خواہ وہ سنی عالموں کی مکمل ہوئی ہوں یا شیعہ عالموں کی، لغویات و مہملات اور جھوٹے قصوں اور موضوع روایتوں سے بھری ہوئی ہیں، اور غلو مذہبی نے اور اختلاف مذہبی نے ان کو زیادہ تر بدنما اور درجہ اعتبار سے ساقط کر دیا ہے بلکہ اصلی واقعات کو ایسا خراب کیا کہ ان کی اصلی حالت دریافت کرنی مشکل ہے۔

(بحوالہ افکار سرسید ص: ۴۴، ۴۵)

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا اقرار

اس امت کے گزرے ہوئے بزرگ مفسرین خواہ وہ صحابہ کے طبقہ میں ہوں یا تابعین اور تبع تابعین کے مبارک دور سے ان کا تعلق ہو یا وہ خیر القرون کے مفسرین ہوں یا برصغیر کے تمغہ یافتہ شاہ ولی اللہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے مفسرین ہوں یا کوئی اور ہوں مودودی صاحب نے سب کے طور وطریق اور طرز تفسیر سے راہ فرار اختیار کر کے الگ ہونے کا کھلا اعلان کیا ہے جو ابھی ان کے دیباچہ میں آنے والا ہے۔

پھر جدید دور کے تقاضوں کے مطابق نئے نوجوانوں کے مزاج کے ساتھ ساتھ چلنے کا کھلا اعلان بھی مودودی صاحب نے اپنی تفسیر کی ابتدا میں دیباچہ کے عنوان کے ذیل میں کیا ہے مولانا مودودی صاحب نے قرآن عظیم کی تفسیر کو تفہیم القرآن کا نام دیا ہے اس میں آپ نے مفسرین کے مروج انداز کو ترک کیا ہے اور روایات سے ہٹ کر آپ نے اپنی سمجھ سوچ اور اپنے ذہن کی

مدد سے قرآن کی آیات سے ایک مفہوم تیار کر کے پیش کیا ہے جس سے آپ نے پڑھنے والوں کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ جہاں قرآن کے سمجھنے کے لیے کسی حدیث کی ضرورت پڑی اور وہ حدیث مولانا کے مزاج اور عقلی معیار پر پوری نہیں اتری تو اس کو بلا روک ٹوک رد کر دیا ہے۔ جیسے سورۃ ''ص'' میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں آیت ۲۴ کے حواشی میں آپ نے صحیح اور صریح حدیث کو اس لیے رد کر دیا ہے کہ وہ ان کی عقل کے معیار پر پوری نہیں اترتی ہے۔ جس کا تذکرہ آیندہ ہوگا۔

اسی طرح مولانا نے قرآن عظیم کا ترجمہ بھی قرآن کے الفاظ کی رعایت کیے بغیر کیا ہے چونکہ یہ حرام ہے اور مولانا نے دیباچہ میں اس کی طرف مکرر اشارہ بھی کیا ہے فرماتے ہیں قرآن کی اصل عبارت میں کوئی کمی بیشی کرنا حرام ہے لیکن کسی دوسری زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے الخ (دیباچہ ص: ۹) اس لیے مولانا نے قرآن کے الفاظ کی پابندی سے آزاد ہو کر اپنے تفہیم القرآن کے ترجمہ کو ترجمانی کا نام دیا ہے گویا ترجمہ میں کلام اللہ کے الفاظ کی رعایت ضروری ہے لیکن ترجمانی میں کمی بیشی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے مولانا نے اپنے دیباچہ میں قرآن کے لفظی ترجموں کے کئی نقائص شمار کیے ہیں اور اس پر سات دلائل قائم کیے ہیں لیکن گزارش یہ ہے کہ ایک انسان اگر اللہ تعالیٰ کے کلام کے ترجمہ میں کمی بیشی کرتا ہے اور اس کو ترجمانی کا نام دیکر ترجمہ کی جگہ پر رکھتا ہے یہ تو بہت ہی غلط بات ہے اگر لفظی ترجمہ میں دلچسپی اور جاذبیت پیدا نہیں ہوتی ہے اور کوئی شخص آزاد ترجمہ کرتا ہے اور اس کو ترجمانی کا نام دیتا ہے تو ان کو چاہیے کہ وہ اس کی وضاحت بھی کرے کہ یہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ ترجمانی ہے اور اس کو ترجمہ کی جگہ میں بھی نہ رکھے تا کہ عوام دھوکہ میں نہ پڑے جس طرح تفہیم القرآن کا ترجمہ پڑھنے والے اس کو الفاظ کا ترجمہ ہی سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

بہر حال اب میں مولانا مودودی صاحب کی وہ عبارات قارئین کے سامنے رکھتا ہوں جس میں موصوف نے اقرار کیا ہے کہ اس نے عام مفسرین کے طریقۂ تفسیر کو چھوڑ کر الگ ڈگر پر چل کر

اپنی تفسیر کو ایک نئے ڈھب پر لا ڈالا ہے۔ تفسیر کے بعض پیچیدہ مقامات میں موصوف نے مصر کے بڑے عالم اور اخوان المسلمون کے بانی سید قطب کی تفسیر ظلال القرآن سے استفادہ کی کوشش کی ہے لیکن حضرت سید محمد یوسف بنوریؒ نے یتیمۃ البیان میں تصریح فرمائی ہے کہ مودودی صاحب نے سید قطب کی تفسیر کا مطلب نہیں سمجھا ہے اور اپنی تفسیر میں بڑی غلطیاں کی ہیں۔

تفہیم القرآن کا دیباچہ

(جناب مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ) قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر پر ہماری زبان میں اب تک اتنا کام ہو چکا ہے کہ اب کسی شخص کا محض برکت و سعادت کی خاطر ایک نیا ترجمہ یا ایک نئی تفسیر شائع کر دینا وقت اور محنت کا کوئی صحیح مصرف نہیں ہے۔ اس راہ میں مزید کوشش اگر معقول ہو سکتی ہے تو صرف اُس صورت میں جبکہ آدمی کسی ایسی کسر کو پورا کر رہا ہو جو سابق مترجمین و مفسرین کے کام میں رہ گئی ہو، یا طالبین قرآن کی کسی ایسی ضرورت کو پورا کرے جو پچھلے تراجم و تفاسیر سے پوری نہ ہوتی ہو۔ ان صفحات میں ترجمانی و تفہیم قرآن کی جو سعی کی گئی ہے وہ دراصل اسی بنیاد پر ہے۔ میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں روح قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہو گئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے وہ مترجمین و مفسرین کی قابل قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تشنگی کو بجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت، میں بھی کر سکتا ہوں۔ انہی دونوں احساسات نے مجھے اس کوشش پر مجبور کیا جس کے ثمرات ہدیہ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔ اگر فی الواقع میری یہ حقیر پیش کش لوگوں کے لیے فہم قرآن میں کچھ بھی مددگار ثابت ہوئی تو یہ میری بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔

اس کام میں میرے پیش نظر علماء اور محققین کی ضروریات نہیں، اور نہ ان لوگوں کی ضروریات ہیں جو عربی زبان اور علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد قرآن مجید کا گہرا تحقیقی مطالعہ کرنا

چاہتے ہیں۔ایسے حضرات کی پیاس بجھانے کے لیے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے، میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور علوم قرآن کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا جن کے لیے ممکن نہیں ہے۔انہی کی ضروریات کو میں نے پیش نظر رکھا ہے۔اس وجہ سے بہت سے ان تفسیری مباحث کو میں نے سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا جو علم تفسیر میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں مگر اس طبقے کے لیے غیر ضروری ہیں۔پھر جو مقصد میں نے اس کام میں اپنے سامنے رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ایک عام ناظر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قرآن کا مفہوم و مدعا بالکل صاف صاف سمجھتا چلا جائے، اور اس سے وہی اثر قبول کرے جو قرآن اس پر ڈالنا چاہتا ہے۔نیز دوران مطالعہ میں جہاں جہاں اسے الجھنیں پیش آسکتی ہوں وہ صاف کردی جائیں اور جہاں کچھ سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوں ان کا جواب اسے بروقت مل جائے۔یہ میری کوشش ہے۔میں نے اس کتاب میں ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں پابندیٔ لفظ کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کو غلط سمجھتا ہوں۔بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ترجمہ قرآن کا تعلق ہے، یہ خدمت اس سے پہلے متعدد بزرگ بہترین طریقہ پر انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں اب کسی مزید کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔انتہیٰ

مولانا مودودی صاحب کی یہ باتیں بہت اچھی ہیں اور یہ تجویز بہت معقول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عام مفسرین کے منہج کو چھوڑ کر مولانا مودودی صاحب نے نئی نسل کو کس راستے پر ڈال کر چلایا ہے؟ ٹھیک ہے کہ بہت سارے بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ کی رہنمائی ہوگئی ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ باستثنائے چند کیا وہ دین اسلام کی روح کے مطابق پرہیز گار بھی بنے ان کی چال ڈھال اور وضع قطع اسلامی سانچے میں ڈھل کر وہ دوسروں کے لیے نمونہ بھی بنے؟ اور کیا وہ ہر لحاظ سے ایک پاکیزہ سوچ پاکر انبیاء علیہم السلام اور صحابہ عظام اور علمائے کرام کے بارے میں ادب کی دہلیز پر سر جھکانے والے بھی بنے؟ اور کیا لندن یا امریکہ کے کسی بازار میں گزرتے ہوئے وہ یہود

ونصاریٰ کے دل ودماغ میں یہ اثر ڈال سکے کہ یہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی اور محمدی جارہے ہیں ہاں اس الگ انداز تفسیر سے لوگ بیشک ایک جماعت کے پکے کارکن بن گئے حالانکہ مقصود اللہ والا بنانا ہے کارکن بنانا نہیں ہے، اس رخ کو چھوڑ کر ایک اور رخ پر آجائیں اور دیکھیں کہ جب سارے مفسرین کے طرز کو غیر نافع اور غیر ضروری سمجھ کر مولانا نے چھوڑ دیا پھر اپنی تفسیر میں اتنی بھاری غلطیاں کیوں کیں؟ اور جمہور علماء امت کے اجماعی مسائل کو نظر انداز کر کے تفہیم القرآن میں اپنے انداز کے مسائل اور نظریات کیوں بھر دیئے؟ ساری غلطیوں کے تذکرہ کے لیے تو ایک بڑا دفتر چاہیے اس مختصر کتاب میں کیا بیان ہوگا لیکن بطور نمونہ مشتے از نمونہ خروارے چند غلطیوں کا تذکرہ کرتا ہوں۔

تفہیم القرآن کی چند غلطیاں

غلطی نمبر (۱) ''الٓمٓ''مولانا مودودی صاحب نے قرآن عظیم کے پہلے لفظ الف لام میم میں ایک واضح غلطی کی ہے فرماتے ہیں: کہ اس استعمال کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لیے ان کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا۔ (تفہیم القرآن:۴۹)

جمہور مفسرین کے طریقہ کو چھوڑ کر مودودی صاحب الف لام کی وضاحت کے لیے خود ساختہ مفروضے بنا رہے ہیں جو مزید شکوک وشبہات پیدا کر رہے ہیں اور تفسیر بالرائی کی خدمت ہورہی ہے۔ سارے مفسرین فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان راز ہے اور یہ وہ متشابہات ہیں جس کا نہ معنی معلوم ہے اور نہ معنی مراد یعنی مطلب معلوم ہے۔ سلف صالحین حروف مقطعات میں فرماتے ہیں ''اللہ أعلم بمرادہ'' یعنی ان مقطعات کا مطلب اور مراد اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان راز ہے۔

غلطی نمبر (۲) مولانا مودودی صاحب نے جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست پر کلام کیا ہے اور ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ گویا صحابہ کرام بغض وحسد میں مبتلا تھے مال کے حریص اور لالچی تھے، سود خور تھے بخیل تھے ان طبعی واخلاقی بیماریوں کی وجہ سے ان کو احد کے میدان میں شکست ہوگئی۔ (دیکھئے تفہیم القرآن ج۱ص:۲۸۸)

غلطی نمبر (۳) مولانا مودودی صاحب نے سورۃ آل عمران کی ایک آیت کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے جس میں صحابہ کرام کو مال غنیمت کی محبت میں گرفتار بتایا ہے آیت کا ٹکڑا یہ ہے ﴿مِنْ بَعْدِ مَا اَرَاكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ یعنی تم نے امیر کے حکم سے روگردانی کی اس کے بعد کہ اللہ تمہیں وہ چیز دکھا چکا تھا جس کو تم پسند کرتے تھے "مَا تُحِبُّوْنَ" کی تفسیر تمام مفسرین نے یہ کیا ہے ای فتح المؤمنین وانهزام الكافرين یعنی کافروں کی شکست اور مؤمنین کی فتح تم کو پسند تھی۔

اس کے مقابلے میں مودودی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے "یعنی مال غنیمت"۔ (تفہیم القرآن)

تبصرہ

یہاں مودودی صاحب نے بہت غلط ترجمہ کیا ہے جس سے صحابہ کرام کی شان بہت گھٹ جاتی ہے کیونکہ یہ ان پر الزام ہے کہ وہ مال کی محبت میں گرفتار تھے سوال یہ ہے کہ بے شک صحابہ کرام مال غنیمت اکھٹا کرنے کے لیے جبل رُماۃ کے مورچہ سے اتر کر چلے گئے تھے مگر یہ تو کوئی چھینا جھپٹی نہیں تھی کہ جس کے ہاتھ میں جو کچھ آ گیا وہ اسی کا ہو گیا اسلام کا قاعدہ تو یہ ہے کہ مال غنیمت سب کے سب بیت المال میں جمع ہو جاتا ہے پھر مجاہدین پر تقسیم ہوتا ہے اس میں مال غنیمت کی محبت میں گرفتار ہونے کا کیا کام ہے جمہور مفسرین سے کٹ کر اسی طرح دھکے کھانے پڑ جاتے ہیں۔ نوجوانوں سے اپیل ہے کہ اس جیسے آزاد خیال لوگوں کی تفاسیر سے احتراز کریں۔

غلطی نمبر (۴) جدید وقدیم فلاسفہ اور اکثر قدیم سائنسدانوں نے سات آسمانوں کا انکار کیا

ہے اور اس کے ضمن میں انہوں نے واقعہ معراج کا انکار کیا ہے مولانا مودودی صاحب نے سورۃ بقرۃ کی آیت ۲۹ کی تفسیر میں سات آسمانوں کی حقیقت اور اس کے تعین کو مشکل قرار دیا ہے اور آسمانوں سے متعلق سابقہ دانشوروں کے بدلتے تصورات اور بدلتے مشاہدات کو قرآن کی تفسیر کے لیے ناکافی قرار دیکر آسمانوں سے متعلق ایک نیا عجیب تصور قائم کر دیا ہے تفہیم القرآن ج ا ص :٦١ کو دیکھئے اور یقین کیجئے کہ اس سے سینکڑوں احادیث کا انکار لازم آتا ہے اور واقعہ معراج کی تفصیلات بے بنیاد ثابت ہو جاتی ہیں یہ سب کچھ سابقہ جمہور مفسرین کے شاہراہ اعظم کو چھوڑنے اور نئے ڈگر پر چلنے کا نتیجہ ہے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کریں جو بڑی دولت ہے۔

غلطی نمبر (۵) سورۃ بقرہ آیت ۶۳ کی تفسیر میں مودودی صاحب نے معتزلی مزاج کے مطابق رفع طور کا انکار کیا ہے اور اس کو ایک ڈراؤنی تصوراتی صورت قرار دیا ہے۔ مودودی صاحب نے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ''یاد کرو وہ وقت جب ہم نے طور کو تم پر اٹھا کر تم سے پختہ عہد لیا تھا''۔ ترجمہ کے بعد مودودی صاحب نے حاشیہ کی تفسیر میں لکھا ہے ''اس واقعے کو قرآن میں مختلف مقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل میں ایک مشہور و معروف واقعہ تھا لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا پہاڑ ان پر آپڑے گا ایسا ہی کچھ نقشہ سورۃ الاعراف آیت ۱۷۱ میں کھینچا گیا ہے (تفہیم القرآن ج ا ص ۸۳)

تبصرہ

جناب مودودی صاحب نے بنی اسرائیل پر کوہ طور اٹھائے جانے اور لٹکائے جانے کو حسی اور مادی عمل کے بجائے ایک تصوراتی عمل اور موہومی عمل ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے جو برصغیر کے اہل

باطل مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ظاہر کیا ہے حالانکہ قرآن کی ظاہری آیت ﴿وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ﴾ کا ترجمہ صاف صاف حسی اور مادی اٹھائے جانے کا اعلان کرتا ہے مودودی صاحب کے ترجمہ میں بھی یہی چیز ہے پھر آیت ﴿وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ﴾ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ہم نے پہاڑ کو دو ٹکڑے کر کے پھاڑ دیا اور ان کے اوپر سائبان کی طرح لٹکا دیا۔ سید قطب اور دیگر مفسرین اس کو معجزہ قرار دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے معجزاتی طور پر ان پر پہاڑ لٹکا دیا جب معجزاتی طور پر اٹھایا گیا تھا تو وہ مادی اور حسی طور پر تھا نہ کہ تصوراتی اور خیالی اور وہمی اور فرضی طور پر تھا۔ جو مودودی صاحب کا خیال ہے، ہمیں اس پر تعجب ہے کہ یہ طریقہ صرف مودودی صاحب نے تفسیر میں نہیں اپنایا بلکہ یہ طرز تفسیر تقریباً تمام اہل باطل تفاسیر نے اپنایا ہے امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر تدبر قرآن جلد ا ص: ١٩٩ پر اس کو اسی طرح فرضی معاملہ قرار دیا ہے جاوید احمد غامدی نے بھی دبے دبے الفاظ میں یہی معاملہ بتایا ہے لیکن جمہور مفسرین اس کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حسی مادی طور پر پہاڑ کے اٹھائے جانے کو معجزہ قرار دے رہے ہیں مگر اپنے ڈھب پر تفسیر کرنے والے اہل باطل اس کو تصوراتی، خیالی، وہمی اور فرضی قرار دے رہے ہیں۔

غلطی نمبر (٦) ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ الَّيۡلُ رَاٰ كَوۡكَبًا﴾ (انعام آیت: ٧٦) چنانچہ جب رات ان پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے۔

تبصرہ:

جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس آیت کی لمبی تفسیر میں بڑی دو غلطیاں کیں۔ ایک غلطی یہ کی کہ ان کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام چونکہ کفر و شرک کے ماحول میں پیدا ہوئے تھے توحید کی تعلیم ان کو کہیں سے نہیں مل سکتی تھی وہ اس وقت نبی اور پیغمبر کے منصب پر فائز بھی نہیں تھے گرد و پیش میں کفر و شرک کا دور دورہ تھا لہٰذا حق تک پہنچنے میں بڑی جد و جہد اور لمبی جستجو کی ضرورت تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی حق کی جستجو کا آغاز کیا اس میں وہ حق بجانب تھے

اگر وہ توحید پر نہ تھے تو یہ ایک عارضی حالت تھی جو قابل گرفت نہیں ہوتی ہے۔

اس لمبے کلام کے مفہوم سے علماء نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام نبوت سے پہلے توحید پر نہ تھے اس سے علماء نے مودودی صاحب کو اس الزام کا نشانہ بنایا کہ وہ نبوت سے پہلے کسی نبی کو کفر و شرک سے معصوم نہیں سمجھتے ہیں تفہیم القرآن کی عبارت کے پہلے حصے سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے اور یہی کلام مجموعی طور پر غلط ہے۔

اس لمبی عبارت میں مودودی صاحب نے جو دوسرا حصہ پیش کیا ہے اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاند سورج اور تاروں کو اپنا رب کہا ہے تو اس میں اس لیے حرج نہیں تھا کہ یہ استقراری اور استقلالی عمل نہیں تھا بلکہ یہ طالب حق کا ایک سفر تھا اور اثنائے سفر میں اگر حق کی جستجو کے لیے عارضی طور پر کفر و شرک کا ارتکاب ہو جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

مودودی صاحب نے لمبی عبارت میں کئی مثالیں پیش فرما دیں اور پھر فیصلہ سنا دیا کہ ''لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کے ذہن کو اس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر وہ توحید الٰہ کی مرکزی حقیقت تک پہنچ کر رہے۔ (تفہیم القرآن سورۃ الانعام:۷۶)

تبصرہ:

مودودی صاحب کی عبارت کے پہلے حصے اور دوسرے حصے سے علماء نے یہ نتیجہ نکالا کہ مودودی صاحب نے حضرت ابراہیم کو مرتکب شرک قرار دیا ہے گو ایک لمحہ کے لیے ہو، اس سے عصمت انبیاء کا مسئلہ کھڑا ہو گیا چونکہ مودودی صاحب عصمت انبیاء کے بارے میں پہلے سے کمزور جملے ارشاد فرما چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑے گناہ یعنی قتل قبطی کا ملزم ٹھہرایا، حضرت یونس کو فریضۂ رسالت میں کوتاہی کرنے والا قرار دیا اس لیے علماء کو اس طرح فیصلہ کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معصوم نہیں سمجھا اور یہ عصمت انبیاء کے مخالف ہیں۔ حالانکہ ان آیات میں جو ''ھذا ربی'' کا جملہ ہے یہ استفہام انکاری ہے یعنی کیا یہ میرا رب

ہے؟ نہیں نہیں یہ میرا رب نہیں ہے۔

میں تو وہی بات عرض کرتا ہوں کہ اگر مودودی صاحب جمہور مفسرین کے ساتھ ہوتے تو یہ صورت بدسامنے نہ آتی جمہور کے ساتھ رہنے میں عافیت ہے الگ ہونے میں خطرات ہیں۔

غلطی نمبر (۷) مودودی صاحب نے سورۃ ''ص'' میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بھی بہت غلط باتیں لکھی ہیں جمہور مفسرین نے آیت ﴿وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ﴾ سورۃ ص کی آیت ۳۴ کی جو تفسیر کی ہے اس کے لیے انہوں نے بخاری اور مسلم کی ایک صحیح حدیث پیش فرمائی ہے جس میں صحیح صورت حال کو واضح کیا گیا ہے مودودی صاحب کو وہ تفسیر پسند نہیں تھی لہذا انہوں نے عام مفسرین کی تفسیر کو غلط قرار دیا اور کہا کہ یہ حدیث اگر چہ صحیح ہے لیکن عقل اس کو نہیں مانتی ہے لہذا میں اس کو قبول نہیں کرسکتا ہوں تفہیم القرآن کی عبارت ملاحظہ ہو:

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک روز قسم کھائی کہ آج رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوگا، مگر یہ بات کہتے ہوئے انہوں نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک بیوی حاملہ ہوئیں اور ان سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا جسے دائی نے لاکر حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر ڈال دیا۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے۔

خود بخاری میں مختلف مقامات پر یہ روایت جن طریقوں سے نقل کی گئی ہے ان میں سے کسی میں بیویوں کی تعداد ۶۰ بیان کی گئی ہے، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰ اور کسی میں ۱۰۰۔ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے، اور باعتبار روایت اس کی صحت میں کلام نہیں کیا جاسکتا، لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہوگی جس طرح وہ نقل ہوئی ہے۔ بلکہ آپ نے

غالباً یہود کی یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر اسے بطور مثال بیان فرمایا ہوگا، اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہوگئی کہ اس بات کو حضور خود بطور واقعہ بیان فرمارہے ہیں۔ ایسی روایات کو محض صحتِ سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ ہر شخص خود حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ جاڑے کی طویل ترین رات بھی عشا اور فجر کے درمیان دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اگر بیویوں کی کم سے کم تعداد ۶۰ ہی مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس رات بغیر دم لیے فی گھنٹہ ۶ بیوی کے حساب سے مسلسل دس گھنٹے یا ۱۱ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے۔ کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟ اور کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ حضور نے یہ بات واقعے کے طور پر بیان کی ہوگی؟ (تفہیم القرآن سورہ ص: ۳۴)

تبصرہ:

مودودی صاحب نے اس جگہ ایک غلطی یہ کی ہے کہ اس صحیح حدیث کو صریح عقل کے خلاف قرار دیا ہے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ آنحضرت نے تو حدیث کو بطور تفسیر بیان فرمایا پورا قصہ بھی بیان فرمایا اور مودودی صاحب مفروضہ بنا کر فرماتے ہیں کہ آنحضرت نے بطور واقعہ اور قصہ یہ حدیث بیان کی ہوگی بطور تفسیر نہیں۔ تیسری غلطی یہ کی ہے کہ اس صحیح صریح حدیث کو یہود کی یاوہ گوئی اور بکواس کہدیا ہے۔ چوتھی غلطی یہ کی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزاتی فعل کو اپنے اوپر قیاس کیا اور کہا کہ ایک رات میں ساٹھ بیویوں سے جماع ممکن نہیں ہے۔ پانچویں غلطی اور گستاخی یہ کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ نہایت حقارت سے کیا ہے یعنی اس رات بغیر دم لیے فی گھنٹہ چھ بیویوں کے حساب سے مسلسل دس یا گیارہ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے الخ۔

مودودی صاحب کی یہ غلطیاں اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ جمہور مفسرین کی تفاسیر کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے ہیں تو اپنی بے علمی میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہے لکھ دیتا ہے مودودی صاحب کی پوری تفسیر کی غلطیوں کو نکال کر نشاندہی کرنے کے لیے بڑی تصنیف اور بڑے وقت کی ضرورت ہے۔ میں مسلمان

جوانوں سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں جو غلطیاں کی ہیں وہ تو غلطیاں ہیں لیکن جہاں تفسیر میں غلطی نہیں کی ہے اور اپنے ذہن کے زور سے اچھی اچھی حکمت کی باتیں بھی لکھی ہیں وہ بھی اکثر و بیشتر تفسیر بالرای ہے جس کی احادیث میں سخت ممانعت ہے۔

میں ان آزاد خیال مفسرین کو شاعر کا ایک شعر یاد دلاتا ہوں شاعر نے کہا:

مشرقی و مغربی تعلیم حاصل کر مگر
بن کر علامہ وبال جہل نادانی نہ بن

نوجوان تفسیر عثمانی کا مطالعہ کیا کریں اور اگر زیادہ وقت ہو تو معارف القرآن کا مطالعہ کیا کریں۔

یہ جو کچھ میں نے اظہار خیال کیا ہے یہ مواخذات اکثر یتیمۃ البیان میں حضرت بنوری کے بیان کردہ ہیں پھر بھی تفہیم القرآن کی غلطیوں کی بنسبت یہ دریا کا ایک قطرہ ہے۔

اہل باطل کی تفاسیر میں سر سید احمد خان کی ایک ضخیم تفسیر بھی ہے جس کا نام سید احمد خان صاحب نے تفسیر القرآن رکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تحریف قرآن ہے اس کی غلطیاں گنانا اور نکالنا تو گویا ایک الگ تصنیف کا تقاضا کرتا ہے بطور اشارہ میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی یتیمۃ البیان کا تبصرہ اور مؤاخذہ اردو ترجمہ از ص: ۶۱ تا ۶۴ نقل کرتا ہوں۔

سر سید احمد خان اور ان کی تفسیر

سید محمد یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ سر سید احمد خان کی تفسیر کے متعلق تذکرہ چلا، اس لیے اگر ان کی شخصیت اور ان کی تحریر کردہ تفسیر کے متعلق وضاحت نہ کی جائے تو یہ مذہبی مداہنت اور عملی نفاق ہوگا، اس لیے کہ وہ بہت سے ایسے باطل پرست روشن خیال لوگوں کے رہبر و رہنما ہیں، جن کے لیے ان کی کج روی کی بنا پر ملت اسلامیہ کی سیدھی اور ستھری راہ تاریک کردی گئی ہے، سر سید احمد خان زندیق اور ملحد شخص تھے یا پھر جاہل گمراہ، حق کی جانب راہ روی کے خواستگار تھے، لیکن سیدھی راہ ان سے خطا ہوگئی، انہوں نے شرعی معاملات اور شعائر ملت کے متعلق اپنی

گمراہ اور ناکارہ عقل کو کسوٹی ٹھہرایا، جس کی بناء پر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، ان کا طرز وطریقہ یہ تھا کہ اہل یورپ واہل مغرب، ملت اسلامیہ پر جو بے کار اعتراضات کیا کرتے تھے، موصوف ان کو قبول کرتے تھے۔ پھر قرآن وسنت میں تاویلات کرتے۔ اور اسلام کو کفر کے قریب کرکے دونوں کو ایک ہی دین بتلاتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف یہ تمام تر تاویلات اس لیے کیا کرتے تھے کہ اس طرح وہ ان کافروں کے دربار میں جن کے ہاتھ میں ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور تھی، تقرب اور شرف باریابی حاصل کرلیں۔

چنانچہ انہوں نے فرشتوں کا انکار کیا اور کہا کہ: ملائکہ خیر کے فطری ملکہ کا نام ہے جو انسانی فطرت وجبلت میں ودیعت ہے، یہ کوئی مستقل عالم سے عبارت نہیں جو وجود انسانی سے کوئی خارج شیء شمار کیا جائے، بلکہ یہ ان صفات میں سے ہے جو انسان کے اندر ہی موجود ہیں۔

اسی طرح شیطان کا بھی انکار کیا اور کہا کہ: ''شیطان اس شری ملکہ سے عبارت ہے جو فطرت انسانی کا حصہ ہے، اسی طرح حشر اور معاد جسمانی کا انکار کیا، بلکہ ملحد فلاسفہ کی طرح صرف معاد روحانی کا قائل ومعتقد ہوا اور اسی طرح آسمانوں اور ارواح کے وجود کا بھی منکر ہوا۔

موصوف شرعی نبوت، جو خدائی عطیہ ونوازش ہے، کے بھی منکر تھے، جو نبوت حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر جاکر تمام ہوئی، وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ: یہ نبوت کسبی ہوتی ہے، انہوں نے نبوت کی صفات وعلامات میں تحریف وتبدیل سے کام لیا، نبی اور کسی بھی امت کے عام مصلح کو برابر قرار دیا، چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، اسی طرح ان معجزات کا بھی انکار کیا جو انبیاء کرام کے ہاتھوں سے خداوند کریم وقدیر کی قدرت سے ظاہر ہوئے کہتے ہیں کہ: ''خوارق کا ظہور خداوند کریم کے دست قدرت سے بالاتر ہے، گویا کہ موصوف نے تکلیف وتشریع کی بنیاد ہی کو باطل قرار دیا، بلکہ تمام قطعی ضروریات دین اور صریح صحیح قطعی نصوص کی بھی تاویلات کیں، جن کی قطعیت دلالت وثبوت کے اعتبار سے مسلم ومتفق ہے، حتی کہ میرٹھ کے ایک خطاب میں کہنے لگے کہ: دنیوی معاملات تو خود اسلام نے ہمارے سپرد کر رکھے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کے متعلق

تصرف کریں، اس لیے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے کہ:
أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ مِنِّيْ :تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو، جہاں تک دینی معاملہ کا تعلق ہے تو اس میں خوب وسعت و کشائش رکھی گئی ہے، فرمایا گیا کہ:مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ: جس شخص نے کہا کہ: خدائے برحق کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جنت میں گویا داخل ہو گیا، اگر چہ زنا یا چوری کا مرتکب ہو۔

موصوف کے نزدیک ساری شریعت اسلامی کا یہی خلاصہ اور نچوڑ ہے، چنانچہ وہ قرامطہ باطنیہ، اسماعیلیہ، مزدکیہ، اخشونیہ جیسے ملحد زنادقہ کے گروہ میں شامل ہو گئے، جنہوں نے قطعی ضروریات دین میں دوراز کار تاویلات کر دیں، بلکہ موصوف ان کے روحانی شاگرد معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے ہی افکار کو اخذ فرما کر یہ گمان کر بیٹھے کہ وہ خود ان نظریات کے موجد ہیں، شیطان نے انہیں ان گمراہ راستوں کو مزین دکھلایا تو انہوں نے نصوص قرآنی اور احادیث نبوی میں ایسی نکمی اور بے کار تاویلات کیں جن سے طبائع سلیمہ کراہت محسوس کرتی ہیں اور سماعت صحیحہ مسترد کر دیتی ہیں، اس طرح کی تاویلات تو ایک عقل مند شخص کے کلام کی بھی نہیں کی جاسکتیں، چہ جائیکہ خدائے پاک کے بلیغ و فصیح اور معجز کلام میں ایسی نکمی تاویلات کو راہ دی جائے یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جنہیں جامع کلمات کی گویائی سے سرفراز فرمایا گیا، کے کلام کی ایسی بھونڈی تاویلات زیر غور لائی جائیں۔ دراصل خدائے پاک نے موصوف کی خرد و بصیرت کو اندھا فرمادیا تھا، جس کی بناء پر وہ اتنی تمیز بھی نہ کر سکے کہ آیا ان تاویلات کی من حیث العربیۃ قرآن و سنت کے کلمات میں گنجائش ہے بھی یا نہیں؟ اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اعدائے دین اور دشمنان ملت نے واضح جہالت کے پردے ان کی آنکھوں پر ڈال دیئے تھے اور جس کو خدا نور سے نہ نوازے، واقعتاً وہ نورِ فہم و فراست سے سرفراز ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

ستم برآں! کہ ان تاویلات کو وہ دین کی خدمت خیال کرتے تھے اور تاویلات کے ذریعے کافروں اور مسلمانوں کو ایک مذہب کے پیرو بتلاتے تھے۔

اس طرح کی تاویلات سے موصوف نے قرآن پاک میں تحریف کی اور دین اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر دیا اور شریعت مطہرہ کے ستھرے خدوخال کو بدصورت و بدنما کر دیا، انہیں فاسد تاویلات کی بنیاد پر موصوف نے ''تفسیر القرآن'' کے نام سے اردو میں تفسیر تالیف کی، یہ تفسیر ''تفسیر القرآن'' کے بجائے ''تحریف القرآن'' کہلائے جانے کی مستحق ہے، بلکہ موصوف اپنی اس تحریف (بنام تفسیر) میں یہودی علماء سے بھی ایسی سبقت لے گئے کہ ان کو کہیں دور چھوڑ دیا، لیکن چونکہ نظم قرآن کی حفاظت کا خدائے پاک نے وعدہ فرما رکھا ہے، اس لیے موصوف اس نظم قرآنی میں تحریف وتغیر پر قادر نہ ہو سکے، وگرنہ ان کی شخصیت سے یہ تغیر وتحریف بھی کچھ بعید نہ تھا، اور قریب تھا کہ ان کو اس تحریف لفظی سے کوئی چیز نہ روکتی۔ اس طرح موصوف نے اہل یورپ اور اہل مغرب کی سازشی تحریکات کو بڑھاوا دینے کے لیے اپنا قیمتی دین فروخت کر دیا۔

پھر ان کی یہ تحریفات یہاں تک ہی منحصر نہ رہیں، بلکہ اس الحاد وزندقہ آمیز تاویلات کو انہوں نے اپنی تفسیر اور دیگر تالیفات وخطبات میں خوب پھیلایا۔

سر سید کے کردار کے متعلق یہ چند نمونے ہیں، اس کے مطابق اے ہوشمندو! باخبر مخاطب! انصاف فرمائیے۔ انصاف بہترین صفت ہے۔ میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر آپ سے سوال کرتا ہوں کہ دینی معاملات یا حمیت وطنی اور حریت وطن میں سے کوئی معاملہ ایسا ہے جس کو تباہ وبرباد کرنے کی اس ملحد وزندیق نے کوشش نہ کی ہو، کاش! کہ اس کے یہ کفریہ نظریات وافکار لوگوں تک نہ پھیلتے (حقیقت یہ ہے کہ) موصوف نے تو یہ ارادہ کر لیا تھا کہ لوگوں کو اپنے دین کے تابع بنا دیں اور لوگ ان کے منہ سے بکے ہفوات کو تسلیم کریں اور ان پر کاربند رہیں۔

اپنی بعض کتابوں میں موصوف نے حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تک کے افکار کا استہزاء کیا، اندازہ لگائیے کہ اس بیوقوف ملحد وزندیق کی بیوقوفی کہاں تک پہنچ گئی اور اس کا یہ اندھاپن اسے کن راہوں پر گامزن کر گیا کہ اپنی باطل تاویلات وتحریفات کو دقائق واسرار شمار کرنے لگا، یہاں تک کہ اپنی تفسیر میں صحابہ کرام کے متعلق یوں کہہ گیا کہ:

''اونٹ چرانے والے، چرواہوں کو ان حقائق کی کیا خبر اور کیا سمجھ ہو سکتی ہے، اسی واسطے شریعت اسلامی نے ان کے لیے باریک مثالوں کے بجائے ان کی فہم ودانست کے مطابق ادنیٰ سی مثالیں بیان فرمائیں''۔ (یتیمۃ البیان فی شیءمن علوم القرآن ص: ۶۱ تا ۶۴) تصنیف سید محمد یوسف البنوری رحمہ اللہ۔

بہر حال جو شخص کامل علم اور خوف خدا سے عاری ہو اور سلف صالحین کی تفاسیر کی پیروی نہیں کرتا ہو اور ایک منصوبہ کے تحت قرآن عظیم کی معنوی تحریف کے پیچھے لگا ہوا ہو اور مسلمانوں کے بجائے غیر مسلموں کی خوشنودی کا طالب ہو وہ یہی کام کریگا اور اسی طرح شریعت کو مسخ کرنے کی کوشش کریگا اور اپنی دنیا وآخرت کو اسی طرح برباد کریگا چنانچہ آخری عمر میں اس کے بیٹے نے سید احمد خان کو گھر سے نکالا وہ بیچارہ ایک دوست کے ہاں رہ رہا تھا اور وہیں مرگیا کفن دفن کے لیے مسلمانوں نے چندہ کیا گھر سے نکالنے کا قصہ تو ایک موٹی کتاب میں مذکور ہے جس کا نام نقش سرسید ہے اور کفن دفن کے لیے چندہ کا بیان تو دو سال پہلے جنگ اخبار نے شائع کیا تھا اللہ تعالیٰ انجام بد سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔

فکر سرسید کے چند اہم نکات

☆ ملائک اور شیطان کوئی الگ مخلوق نہیں، یہ انسان میں خیر اور شر کی قوتوں کے نام ہیں۔ جنات سے جنگلی اور وحشی انسان مراد ہیں۔

☆ کسی نبی سے کسی قسم کا معجزہ مافوق الفطرت اور خلاف عقل واقع نہیں ہوا۔

☆ قرآن مجید میں انبیاء سے منسوب محیر العقول واقعات محض قوائے انسانی کی قوت کا مظہر ہیں۔

☆ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا نہیں ہوئے کیونکہ قانون فطرت کے برخلاف ایسا نہیں ہوسکتا۔

☆ ٹٹ پونجیئے عربی مدرسوں سے ہماری کوئی قومی عزت نہیں۔ اس سے کابل، مال مردم خور، بے محنت اور خیرات کی روٹی کھانے والے ملانوں کا گروہ بڑھتا جائے گا۔

☆ اعلیٰ عہدے صرف لائق انگریزی دانوں کو دیئے جانے کی پالیسی میں سختی ہونی چاہیے۔

☆ خدا لارڈ میکالے کو بہشت نصیب کرے۔ اس سے زیادہ ہندوستان کو بھلائی پہنچانے والا کوئی اور نہیں۔

☆ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری اور نمک حلالی خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔

☆ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو ہندوستان میں رہتے ہیں، سب ایک ہی قوم ہیں۔ (بحوالہ افکار سرسید آخری ٹائٹل)

میں ایک بار پھر ان خود ساختہ مفسرین کو شاعر کا ایک شاعر یاد دلاتا ہوں شاعر نے کہا:

مشرقی و مغربی تعلیم حاصل کر مگر
بن کر علامہ وبالِ جہلِ نادانی نہ بن

مناسب تو یہ تھا کہ میں سرسید صاحب کی تفسیر کی غلطیاں نکال کر لوگوں کے سامنے رکھتا لیکن وہ غلطیاں اتنی ہیں کہ اس کا نکالنا اور اکٹھا کرنا میرے بس میں نہیں ہے اس لیے حضرت بنوریؒ کے کلام پر اکتفا کیا۔

مفسرین سے متعلق علامہ عنایت اللہ مشرقی کی رائے

اہل باطل کی تفاسیر میں علامہ عنایت اللہ مشرقی کی ایک تفسیر ''التذکرۃ'' کے نام سے ہے اور دوسری تفسیر ''احسن تفسیرا'' کے نام سے ہے اس دوسری تفسیر میں علامہ عنایت اللہ مشرقی کا ایک لمبا مقدمہ ہے اس میں انہوں نے سلف صالحین اور اہل حق مفسرین علماء کے بارے میں نہایت گھٹیا زبان استعمال کیا ہے اس مقدمہ کی چند عبارات ناظرین کو پیش کرتا ہوں پڑھیے اور

غور و خوض کیجئے کہ مفسرین کے بارے میں ان کی سوچ کیا ہے لکھتے ہیں:

مگر افسوس کہ اسلامی علماء اور متکلمین نے اتحاد عمل کو قطعاً نظر انداز کر دیا، وہ جو کچھ ان کے محدود، وقتی اور مقامی علم سے بن پڑا اس نادر الوجود کتاب کی تشریحات کر گئے، اعتقادی طور پر اپنی اپنی شرح کو قطعی اور آخری قرار دے کر لوگوں کو اپنے اپنے پیچھے لگا لیا اور باہمی ضد اور ہٹ دھرمی سے فرقہ بند بن کر کلام خدا کی حقیقت کو نظروں سے نہاں کر دیا انہوں نے آج تک کلام خدا کی تفسیر کے کوئی مشترک علمی اصول مقرر نہیں کیے، کوئی مشترک اساس بحث وتنقید کی پیدا نہیں کی۔ آج اگر کوئی طالب حقیقت اپنی بجھی ہوئی آگ کو سلگانے کی نیت سے کسی بڑی سے بڑی تفسیر کی طرف رخ کرتا ہے تو پہلا ورق کھولتے ہی اس میں انسانی باطل آرائی اور غلط گوئی، داستاں سرائی اور حقیقت پوشی آسماں سوالی اور زمین جوابی کی وہ حیا سوز بدعنوانیاں دیکھتا ہے کہ اس قصاب خانہ فہم وعقل کو دیکھ کر روح کانپ اٹھتی ہے۔

علامہ مشرقی مزید لکھتے ہیں:

''لیکن مالک زمین وآسمان کے کلام کے مطالب میں اسلامی مفسروں کی صدیوں سے رطب ویابس، سب رائے زنیاں اور قیاس رانیاں ایک عالمگیر قوم کی تاریخ نفع وانعام میں وہ ناقابل تلافی نقصان، اس کے اعمال میں وہ ناپید امثال شرارتیں ہیں کہ اس روئیداد کو سن کر بدن کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بعینہٖ یہی اہم باتیں ہیں جو ہر تفسیر اور ترجمے میں کالعدم ہیں، اسی مدعا کو دل میں ٹھان کر لوگ تفسیریں پڑھتے ہیں اور مایوس ہو ہو کر رہ جاتے ہیں کوئی مستقل اصول، کوئی مختصر گُر، کوئی کارگر بات موجودہ تفاسیر سے ان کے ہاتھ پلے نہیں پڑتی''۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی اپنی تفسیر کے بارے میں لوگوں سے رائے لینا چاہتا ہے لکھتا ہے:

''کیا تفسیر کے اس ظلمت انگیز چراغاں کے ہوتے ہوئے میں بھی فی الحقیقت آئندہ اوراق میں اپنی خوش اعتقادی کا ایک دخان خیز دیا لے آیا ہوں اور اس طرح پر قرآن کو سیاہ کرنے کا مجرم بنا ہوں، اس کا فیصلہ زمانہ آپ کرتا رہے گا (ماخوذ از مقدمہ احسن تفسیر ا)

عام مفسرین اور ان کی تفاسیر کے بارے میں علامہ عنایت اللہ خان مشرقی نے جو گندی زبان استعمال کی ہے وہ قارئین نے پڑھ لیا اور دیکھ لیا اب علامہ عنایت اللہ مشرقی امرتسری کی تفسیر ''التذکرۃ'' میں ان کی تحریف قرآن اور تحریف دین کو بھی پڑھیں۔ حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے یتیمۃ البیان میں جن مقامات پر گرفت فرمائی وہ ملاحظہ فرمائیں۔

عنایت اللہ مشرقی اور ان کی تفسیر ''التذکرۃ''

انہی باطل پرستوں کی تفاسیر میں سے ایک تفسیر عنایت اللہ مشرقی امرتسری کی بھی ہے، جس کا نام موصوف نے ''التذکرۃ'' رکھا ہے، اس شخص کے احوال تو اونچے پہاڑ پر جلتی آگ سے بھی زیادہ واضح ہیں، یہ شخص اس سر سید احمد خان کے راستے پر گامزن ہے، جس کا مختصر تذکرہ اصول اسلام کے منہدم کرنے کے بیان میں گزرا ہے، موصوف کی رائے مکمل طور پر سر سید دہلوی کے وضع کردہ باطل اصول کے موافق تھی، جب ان کی تفسیر ''التذکرۃ'' شائع ہوئی اور علمائے حق نے اس کو دیکھا تو بالاجماع ان کے کفر کا فتویٰ دیا، اہل حق علماء میں سے کوئی بھی اس فتویٰ کی تائید میں پیچھے نہیں رہا، اس ملحد نے تو سر سید سے بھی زیادہ باطل نظریات قائم کیے، کہتے ہیں کہ:

''اسلام اور صراط مستقیم تو یہ ہے کہ خدائے پاک کی کائنات میں ان بکھری نعمتوں سے نفع مند ہوا جائے، جو شخص ان نعمتوں سے متنفع ہوا، وہ مسلمان ہے اور جو ان نعمتوں سے محروم رہا، وہ کافر ہے''۔

اصحاب الجنۃ اور اصحاب النعیم (جنت والے اور نعمتوں میں رہنے والوں) کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو یہود و نصاریٰ کہتے ہیں''۔

ان باتوں پر استدلال وہ اس آیت سے کرتے ہیں ﴿إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ﴾ لکھتے ہیں کہ:

''اہل حکومت وسلطنت نصاریٰ ہیں اور وہ نیکوکار ہیں، اس لیے کہ زمین کی وراثت وسلطنت انہی لوگوں کے قبضہ میں ہے''۔

اس ملحد وزندیق کے نزدیک پل صراط، حساب وکتاب، حشر ومعاد، جنت ودوزخ کسی چیز کا کوئی تصور نہیں، بلکہ الٹا جنت، اس کے ذکر کردہ احوال، سمندر، نہریں اور محلات وغیرہ کا مذاق اڑاتا ہے۔

اور ''اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' سے مراد اس کے نزدیک اہل حکومت ہیں اور ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' میں بھی منعم علیہم، اس کے نزدیک یہی اہل حکومت ہیں، اور جس قوم کو فرماں روائی اور سلطنت حاصل نہ ہو، اس شخص کے نزدیک وہ ''ضالون'' یعنی گمراہ ہیں اور وہی لوگ ''مغضوب علیھم'' یعنی خداوند کریم کے غضب کے مستحق ہیں، یہاں تک کہ اس زندیق نے یوں بھی کہہ ڈالا کہ:

''نصاریٰ باوجود عقیدہ تثلیث کے مسلمان ہیں''۔

خلاصہ یہ کہ اس ملحد کے کفر کے اسباب بے شمار ہیں، جن کو اس مقام پر بیان نہیں کیا جاسکتا، اس ملحد نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا نام ''خاکساران'' رکھا تھا اور لوگوں کو اس کی امداد اور اس میں شمولیت کی دعوت دیتا تھا اور اس اکیڈمی کا مقصد بھی وہ خفیہ سازشیں تھیں جنہیں اس مقام پر بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ واللہ الھادی الی الحق۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں اس کا انتقال ہوا علامہ مشرقی کو بھی شاعر کا شعر سناتا ہوں

مشرقی ومغربی تعلیم حاصل کر مگر
بن کر علامہ وبالِ جہل ونادانی نہ بن

اہل باطل کی تفسیروں میں سے جن تفاسیر پر حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے یتیمۃ البیان

میں تنقید بلیغ فرمائی ہے ان میں مولانا محمد احسن اصلاحی کی تفسیر بھی ہے گو اس پر حضرت نے نسبتاً نرم تنقید کی ہے اور یہ تفسیر اس وقت مکمل بھی نہیں ہوئی تھی اور امین احسن اصلاحی کے احوال اتنے کھلے بھی نہیں تھے جتنے بعد میں کھل کر سامنے آ گئے میں نے آئندہ اس پر مکمل بحث کی ہے۔ چنانچہ حضرت محمد یوسف بنوری نے امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن کے متعلق یتیمۃ البیان میں فرمایا:

تفسیر تدبر قرآن اور مولانا امین احسن اصلاحی

سید محمد یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں کہ تفسیر ''تدبر قرآن'' یہ تفسیر اردو زبان میں شیخ امین احسن اصلاحی کا شاہکار ہے، مؤلف موصوف اپنی دیگر تالیفات کی وجہ سے کافی معروف شخصیت ہیں، موصوف استاذ مودودی کے قریب ترین افراد میں سے تھے اور ان کے دیگر حامیان کی فہرست میں سر فہرست تھے اور بیس سال کی طویل المدت رفاقت و امارت تسلیم کرتے ہوئے بعد ازاں استاذ مودودی سے علیحدگی اختیار کی، موصوف کی استاذ مودودی سے اس علیحدگی کا سبب ''مختلف مصالح اور مخصوص حکمت عملیوں کے پیش نظر شرعی احکام میں تغیر و تبدل کا جواز'' کا جو نظریہ مودودی صاحب نے اپنایا تھا، اس سے موصوف کا اختلاف تھا۔

مودودی صاحب نے یہ تصریح کی تھی اور یہ اعتقادی نظریہ بیان کیا تھا کہ: اسلام کے اساسی مقاصد دو قسموں پر مشتمل ہیں:

پہلی قسم: وہ اساسی مقاصد جس میں تغیر و تبدل کی کچھ گنجائش نہیں، جیسا کہ عقائد اسلامیہ مثلاً توحید، رسالت وغیرہ۔

دوسری قسم: ان مقاصد کی ہے جن میں مصالح اور حکمت عملی کے پیش نظر تغیر و تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ مودودی صاحب یوں بھی کہتے تھے کہ اس تغیر و تبدل کے شریعت اسلامیہ میں بے شمار نظائر بھی موجود ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں

اعلان فرمایا کہ ''الأئمة من قریش '' امام اور خلیفہ قریشی ہی ہوسکتا ہے اور قرآن کریم میں باری تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا کہ:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾

جس کا مقتضاء مختلف قبائل اور خاندانوں کے افراد کا باہمی فلسفہ مساوات تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مصالح کے پیش نظر چھوڑ دیا۔

موصوف مودودی کی مذکورہ بالا تحریر و تقریر پر میں نے رسالہ ''الأستاذ المودودی وشیء من حیاته وأفکاره''۔ میں بھر پور تنقید تحریر کی ہے۔ مزید تفصیل و بیان کے لیے وہیں مراجعت کی جائے۔ استاد مودودی نے جب اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کا آغاز فرمایا تو موصوف اصلاحی صاحب نے بھی چاہا کہ ایک تفسیر تالیف فرمادیں، کیونکہ موصوف مودودی صاحب کو علوم عربیہ اور بلاغت و بیان کے علوم میں کوتاہ خیال کرتے تھے اور خود کو ان خصائص وصفات میں ان سے بلند گردانتے تھے۔

تدبر قرآن کے چند قابل گرفت مباحث

چنانچہ ''تدبر قرآن'' کے نام سے ایک تفسیر تالیف کرنا شروع کردی، یہ تفسیر فی الحال تین ضخیم جلدوں میں سورۂ بنی اسرائیل تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، مجھ کو یہ امید تھی کہ شاید یہ تفسیر ان علمی اغلاط وخطاء سے پاک ہوگی، لیکن افسوس! جب میں نے موصوف کی تفسیر کا مطالعہ کیا اور مختلف مقامات کی ورق گردانی کی، تب میں نے کئی ایک ایسے مسائل پائے جن میں موصوف نے جمہور مفسرین، ائمہ اہل سنت والجماعت کی آراء سے مخالفت کی ہے، چنانچہ میری تمام تر امیدیں اکارت ہوگئیں اور پُر امید خوشیاں مکدر ہوگئیں، حالانکہ مجھے امید یہ تھی کہ یہ خوشیاں ہر قسم کی گندگی اور اس کے شوائب سے پاک ہوگی۔ چنانچہ درج ذیل آیات میں میں نے ان کی آراد کو جمہور

مفسرین کے مخالف پایا:

۱. ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾

۲. ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾

۳. ﴿وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾

۴. ﴿وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾

(تفصیل کے لیے ج:۱ص:۱۹۹۔ج:۱ص:۲۰۵،ج:۱ص:۶۸۰،ج:۲ص:۱۹۵ کی مراجعت کی جاسکتی ہے)

ان مقامات کو دیکھ کر میرا اعتماد و وثوق ختم ہو گیا، یہ تفسیر بحث و تفتیش کے ساتھ بالاستیعاب مطالعہ کی محتاج ہے، اگر مؤلف محترم خود ہی بے لاگ تنقید اور بے تعصب بحث کو راہ دیں تو ان قابل مؤاخذہ آراء سے رجوع فرمالیں گے۔ واللہ الھادی الی الحق

راقم الحروف فضل محمد یوسف زئی کہتا ہے کہ بعد میں امین احسن اصلاحی کی تفسیر پر میں بھر پور کلام کروں گا (ان شاء اللہ)

ایک گزارش:

حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے جناب مودودی صاحب اور جناب سر سید احمد خان صاحب اور جناب عنایت اللہ مشرقی صاحب اور جناب امین احسن اصلاحی صاحب اور ابوالکلام آزاد صاحب کی تفاسیر پر کھل کر اظہار خیال فرمایا ہے اور شبلی نعمانی پر بھی کلام کیا ہے اور بغیر خوف لومۃ لائم آپ نے حق کی حمایت میں نہ کسی کی شخصیت کی پرواہ کی اور نہ کسی کی سیاسی قیادت سے گھبرا کر لاگ لپیٹ سے کام لیا ہے اس سے ہماری نئی نسل کے اس دور کے علماء کی آنکھیں کھل جانی چاہیے کہ حضرت بنوری نے کس طرح حق کا برملا اعلان کیا اور پھر باقاعدہ اپنی مایہ ناز تصنیف یتیمۃ البیان میں اس کو اعلیٰ مقام دیا؟ آپ کے کھلے الفاظ اور فصاحت سے بھرے بیان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ باطل کے خلاف حضرت بنوری شیر کی طرح دھاڑتے چنگھاڑتے میدان

کارزار میں اتر آتے تھے اور مصلحت وحکمت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے رب کو راضی کرتے تھے اور امت محمدیہ کے اہل حق کی صف کی حفاظت فرماتے تھے۔

آج ہمیں چاہیے کہ ان کو اسی نظر سے دیکھیں جو اہل باطل کے مقابلے میں ان کی شان تھی۔

چوہدری غلام احمد خان پرویز کی تفسیر

بہر حال حضرت مولانا بنوری رحمہ اللہ نے اہل باطل میں سے دو بڑے مشہور اہل باطل کا تذکرہ اپنی کتاب یتیمۃ البیان میں نہیں کیا ہے شاید ان لوگوں کی تفاسیر بعد میں منظر عام پر آگئی ہونگی ان دو اہل باطل میں سے ایک چوھدری غلام احمد خان پرویز بی اے ہیں اور دوسرا مولانا وحید الدین خان ہیں چوھدری غلام احمد خان پرویز کی تفسیر کا نام انہوں نے معارف القرآن رکھا ہے اسی طرح غلام احمد پرویز کی ایک اور تفسیر ہے جس کا نام اس نے مطالب الفرقان رکھا ہے دونوں کی ابتداء میں پرویز صاحب نے تفسیر لکھنے کی وجوہات بیان کی ہیں اور سلف صالحین کی تفاسیر کے نقصانات بیان کر کے اس سے احتراز کا اعلان کیا ہے ان کی تفسیر معارف القرآن کی ابتداء میں ان کے ایک ہم خیال مداح مولوی اسلم جیراج پوری نے بھی ایک مقدمہ لکھا ہے کافی لمبا ہے اس میں انہوں نے سابقہ مفسرین کی تفاسیر میں سات نقائص کا ذکر کیا ہے لمبی چوڑی داستان ہے میں صرف اشارہ کے طور پر ان نقائص کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں وہ لکھتے ہیں

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسرین نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کیے ہیں (مقدمہ ص:۳۳)

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے، وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے، یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں اس طرح آیات والفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا، یعنی اس کو کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوتی ہے

(مقدمہ ص:۳۳)

(۳) اکثر تفاسیر میں آیات والفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے (ص:۳۴)

(۴) ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے الا ماشاء اللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں بعض بزرگ تو اس قسم کے گزرے ہیں جنہیں اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں۔ یعنی تقرباً الی اللہ خدام قرآن میں داخل ہو گئے بحالیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی، جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لیے مغفرت کی دعاء نکلے (مقدمہ ص:۳۴)

(۵) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں (مقدمہ:۳۵)

(۶) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں الغرض سینکڑوں الفاظ وآیات ہیں جن کی کئی کئی تفسیریں، یا، یا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں (مقدمہ ص:۳۵)

(۷) ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے جنت کا ذکر ہے تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے (مقدمہ ص:۳۵)

ان نقائص کے ذکر کرنے کے بعد اسلم جیراج پوری نے کئی کئی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن خود نور اور روشنی ہے اس کے سمجھنے کے لیے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں ہے قرآن خود بیان اور تبیان ہے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ قرآن ہر چیز کے لیے تفصیل ہے کسی اور چیز کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے یہ قرآن لاریب

کتاب ہے اور کتاب مُبین ہے کسی اور چیز کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔
الغرض قرآن فہمی کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی جس حقیقت کی تفصیل مطلوب ہو وہ قرآن ہی سے نکالی جائے کیونکہ قرآن کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ یعنی پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے بہرحال جیراج پوری صاحب نے اس طرح دیگر دسیوں آیات سے اپنا یہ مطلب نکالا ہے کہ قرآن کریم خود پورا ہے اس کے سمجھنے کے لیے کسی حدیث یا روایت کی ضرورت نہیں ہے پھر اس خرافاتی مقدمہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ اب میرے مخلص رفیق چوھدری غلام احمد خان پرویز بی اے جن کو اللہ نے قرآن فہمی کی توفیق عطا فرمائی ہے اسی نہج پر اپنی کتاب معارف القرآن پیش کر رہے ہیں جو کچھ انہوں نے سمجھا وہ قرآن ہی کی تعلیم ہے نہ کہ انسانی خیالات کیونکہ کسی خاص خیال کو لیکر قرآن میں گھسنا اور اس کی آیات کو اس کے مطابق موڑنا خالص الحاد ہے، جس کی سزا جہنم ہے (مقدمہ ص: ۴۵، ۴۶)

محمد اسلم جیراج پوری ۱۰ اپریل جامعہ نگر دہلی۔

چوھدری پرویز صاحب کا مقدمہ تفسیر

چوھدری غلام احمد خان پرویز نے اپنی خود ساختہ تفسیر معارف القرآن کی ابتداء میں خود ایک لمبا مقدمہ تفسیر لکھا ہے۔ چند باتیں ملاحظہ فرمائیں اور باقی کا اندازہ لگائیں۔

ماضی پرستی

اس عنوان کے تحت پرویز صاحب لکھتے ہیں:

”مذہب پرست طبقہ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی ماضی پرستی ہے جو انہیں اپنے تصورات کے تنگ دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتی اس (ماضی پرستی) کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ پہلے سمجھا گیا اس سے زیادہ اب سمجھا نہیں جاسکتا ہے جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اس پر ایک حرف کا اضافہ نہیں ہوسکتا ہے“۔ (مقدمہ ص: ۵۰)

قرآن فہمی

اس عنوان کے ضمن میں پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن کریم کو کسی خاص زمانہ کے ساتھ مقید نہیں کیا جا سکتا اور کوئی شخص اسے اپنے خیالات کی روشنی کے تابع بھی نہیں کر سکتا تو پھر اسے سمجھا کیسے جا سکتا ہے قرآن کی رو سے اس کا جواب کچھ مشکل نہیں قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس تفسیر میں وہ کسی خارجی روشنی (یعنی احادیث) کا محتاج نہیں وہ علم خداوندی کا نور مبین ہے اور نور کو کسی انسانی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی''۔ (مقدمہ ص:۵۱)

پرویز صاحب آگے لکھتے ہیں: ''سعادت مند نوجوانوں کے دل میں قرآن کا شوق پیدا ہوتا ہے تو وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم قرآن کو کس طرح سمجھیں، میں نے اس مشکل کی صحیح وجہ اور اس کا حل معلوم کرنے میں غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ چاہتے ہیں کہ مختلف مباحث و مسائل بیک نظر ان کے سامنے آجائیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے قرآن کریم کو اس شکل میں پیش کیا جائے کہ اس کے سمجھنے میں تردد اور کاوش نہ ہو اور ہر مسئلہ کے متعلق قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم کو اس طرح یکجا جمع کیا جائے کہ وہ ایک مربوط و مسلسل مضمون کی صورت اختیار کر لے۔ یہ چیزیں ہماری مروجہ تفاسیر میں نہیں مل سکتی اس لیے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ایک آیت کا الگ الگ مطلب بیان کرتی جاتی ہے جس سے آیات کا مطلب سمجھ میں آجائے تو آجائے لیکن قرآن کریم کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آسکتی''۔

(مقدمہ معارف القرآن ص:۵۳) غلام احمد پرویز ۱۵ جون ۱۹۴۱ء)

بہر حال چوھدری غلام احمد خان پرویز نے بھی اپنی تفسیر کے لیے وہی جدید طریقہ اختیار کر لیا جو ان کے پیشرو اہل باطل نے اختیار کیا تھا اور جو ان کے بعد اہل باطل اختیار کر رہے ہیں۔

چوھدری غلام احمد خان پرویز نے مطالب الفرقان کے نام سے بھی ایک تفسیر لکھدی ہے جس کا

پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا ہے اس تفسیر اور اس کی سنہ اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں چوھدری غلام احمد پرویز صاحب بالکل گمراہ ہو چکا تھا میں اس تفسیر کے مقدمہ سے چند عبارات نقل کرتا ہوں پھر اس کی اس تفسیر سے ان کے گمراہ کن عقائد نقل کروں گا مقدمہ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں وہ لکھتے ہیں:

آغازِ سخن

پرویز صاحب کہتے ہیں میں قرآن کریم کا ادنیٰ طالب العلم ہوں، میں نے اپنی ساری زندگی اس کتاب عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کی ہے، جب میں ''ساری عمر'' کہتا ہوں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں کرتا۔ پانچ چھ برس کی عمر سے کہ جب مجھے مکتب میں بٹھایا گیا، اس وقت تک، کہ میرا رہرو عمر بہتر سے بھی زیادہ منازل طے کر چکا ہے، بجز ان دنوں کے جب میں کسی وجہ سے معذور ہو گیا ہوں، شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب قرآن مجید میری نگاہوں کے سامنے نہ رہا ہو۔ عمر کے پہلے حصہ میں اس کا مطالعہ مروجہ قدامت پرستانہ طریق سے کیا۔ اس کے بعد جب حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور پرکھنے کا شعور بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا تھا وہ مجھے حقیقت سے بہت دور لے گیا تھا۔ اس سے خود اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات ابھرنے شروع ہوئے جن کا اطمینان بخش جواب کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔ برسوں تک میں ریب وتشکیک کی انہی پُر خار وادیوں میں، وقفِ کرب واضطراب، سرگرداں وحیراں پھرتا رہا۔ اسی دشت نوردی میں مجھے اس کا علم واحساس بھی ہوا کہ ہمارا نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ مذہب گزیدہ کیوں ہو رہا ہے میری قسمت نے یاوری کی، اور بتائید ایزدی، یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ قرآن مجید کے سمجھنے کا صحیح طریق کیا ہے، قرآن کریم نے اپنے آپ کو نور (روشنی) کہا ہے۔ اور روشنی اپنے وجود کی دلیل آپ ہوتی ہے، اسے تلاش کرنے کے لیے خارجی چراغوں کی ضرورت نہیں ہوتی، لہٰذا قرآن خود قرآن ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن

نازل کرنے والے (خدا) نے کہا ہے کہ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمہ ہے''۔ (بحوالہ مطالب الفرقان)

تبصرہ:

راقم الحروف فضل محمد یوسف زئی کہتا ہے کہ اہل حق نے قرآن کی آیت ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ سے احادیث مقدسہ کی حجیت کو ثابت کیا ہے کہ اللہ نے قرآن عظیم کی تفسیر کی ذمہ داری خود لے لی ہے اور یہ تفسیر احادیث سے ہوتی ہے کیونکہ قرآن اگر خود قرآن کے لیے تفسیر بن جائے تو ہر آیت کے لیے دوسری آیت تفسیر ہوگی جو دوسری آئے گی اس کے لیے کسی اور کی ضرورت ہوگی اس طرح تسلسل لازم آئے گا جو باطل ہے کیونکہ وہ محال ہے باقی یہ جو مشہور ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا کہ بعض قرآن اپنے بعض کی تفسیر کرتا ہے تو اس سے معروف تفسیر مراد نہیں ہے کیونکہ اس طرح تفسیر قرآن میں موجود نہیں ہے ہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جہاں اجمال آیا ہے اس کی دوسری جگہ تفصیل آئی ہے یا جہاں ابہام آیا ہے اس کی دوسری جگہ وضاحت آئی ہے تو یہ اجمال و تفصیل اور ابہام اور وضاحت کا فرق ہے، اگر قرآن خود قرآن کے لیے تفسیر ہے تو پھر ان اہل باطل کے لیے تفسیر کا موقع کہاں سے آیا ہے جب کلام خداوندی خود بیان ہے اور خود تفسیر ہے تو پھر تو سب کچھ پہلے سے موجود ہے پھر جاوید احمد غامدی نے کیوں تفسیر لکھدی پرویز نے کیوں لکھدی عنایت اللہ مشرقی نے کیوں لکھدی امین احسن اصلاحی نے کیوں تفسیر لکھدی عبداللہ چکڑالوی نے کیوں تفسیر لکھدی جبکہ ان سب کا دعویٰ ہے کہ قرآن کے لیے کسی خارجی تفسیر کی قطعاً گنجائش نہیں ہے یہ عجیب لوگ ہیں کہتے ہیں کہ قرآن کو احادیث کے ذریعہ سے تفسیر کی ضرورت نہیں ہے اور پھر خود اتر کر قرآن عظیم کی خود ساختہ گمراہ کن تفسیر بالرائی کرنے لگ جاتے ہیں اگر قرآن عظیم خود بیان ہے خود نور مبین ہے خود تفصیل اور تفسیر ہے تو پھر یہ لوگ اس کی تفسیر کے پیچھے دوڑ کر کیوں آئے؟

اور جب تفسیر کرنے لگے تو تحریف کیوں کی سیدھی سیدھی تفسیر کرتے تحریف نہ کرتے، لیکن احادیث کو چھوڑ کر صحیح تفسیر کون کرسکتا ہے تحریف ہی کرنا پڑے گا۔ چنانچہ چوھدری غلام احمد پرویز کی تحریفات کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ کریں۔

غلام احمد پرویز کے نزدیک دوزخ کی آگ کامفہوم

چوھدری غلام احمد پرویز کے خرافات بہت ہیں ان خرافات کا مرکزی نقطہ جس سے سارے خرافات پیدا ہوئے ہیں وہ پرویز صاحب کا یہ عقیدہ ہے کہ عالم آخرت اور اخروی زندگی حسی اور مادی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ ایک تصوراتی ذہنی خیالی تشبیہاتی اور تمثیلاتی تصور اور خیال ہے اس عقیدہ کے نتیجے میں پرویز صاحب نے آخرت کی دسیوں چیزوں کا وہ تصور مسترد کر دیا ہے جس کا تذکرہ قرآن وحدیث میں موجود ہے اس غلط نظریہ کی وجہ سے عالم آخرت سے متعلق سینکڑوں قرآنی آیات اور ہزاروں احادیث کا انکار لازم آتا ہے چنانچہ پرویز صاحب دوزخ کی آگ کے بارے میں قرآن کی آیت ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ﴾
(سورۃ بقرہ: آیت: ۲۴) کے تحت لکھتے ہیں:

''اَلــنَّـار'' سے حسد کی آگ مراد ہے دشمنی اور غصہ کی آگ مراد ہے اور انتقام کی آگ مراد ہے
(مطالب الفرقان ص: ۳۲۶)

''جَهَنَّم'' زمانہ قدیم میں یروشلم کے جنوب میں ایک وادی تھی جس میں ''مولوک'' دیوتا کا مندر تھا وہاں انسانوں کو زندہ جلا کر اس دیوتا کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی عبرانی زبان میں وادی کو جی کہتے ہیں اور جس شخص کی طرف وہ وادی منسوب تھی اس کا نام ہنوم تھا اس بناء پر اس وادی کو جس میں انسانوں کو جلا کر قربان کیا جاتا تھا جی ہنوم یا جہنم کہا جاتا تھا اخروی زندگی کی ماہیت اور نوعیت کا سمجھ لینا ہمارے شعور کی موجودہ سطح کے لیے ممکن ہی نہیں اتنی بات بہر حال واضح ہے کہ جہنم کسی گڑھے کا نام نہیں جس میں آگ جلائی گئی ہو یہ قلب سوزاں کی کیفیت کا نام ہے

(مطالب الفرقان مؤلفہ پرویز ص: ۳۲۷)

"الناس" سے واضح ہے کہ اس سے مراد عوام ہیں یعنی وہ لوگ جو مذہبی پیشواؤں اور قومی لیڈروں اور حکمرانوں کے پیچھے چلتے ہیں۔

"الحجارۃ" آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اس جہنم کا ایندھن الناس والحجارۃ ہونگے۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے انسان اور پتھر اور پتھروں سے مراد لی جاتی ہے وہ بت جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے الحجارۃ کا مادہ حجر ہے جس کا بنیادی معنی روکنا اور منع کرنا ہے اس اعتبار سے حجر ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو "ذی حجر" کہا ہے یعنی ارباب دانش وبینش جو بڑے چالاک اور ہوشیار ہوں یہی لوگ ہیں جو مذہبی پیشوا قومی لیڈر اور ارباب اقتدار بن کر خدا کی طرف جانے والے راستوں میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں بنابریں "وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" کے معنی ہوں گے عوام اور ان کے لیڈر۔

(مطالب الفرقان مؤلفہ پرویز ص: ۳۲۸، و ۳۲۹)

"اَلْجَنَّۃ" جنت کے معنی باغ کے ہیں قرآن کریم میں ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ اس دنیا کی جنت بھی بتایا گیا ہے اور اخروی زندگی کی جنت بھی، ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اخروی زندگی اور اس کی کیفیات کی کنہ اور حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے ہیں اسی لیے قرآن کریم نے اس کو تمثیلات اور تشبیہات کے پیکروں میں پیش کیا ہے اس لیے ان الفاظ کے وہ معنی نہیں لینے چاہیے جن معانی میں ہم انہیں اپنی محسوس دنیا میں استعمال کرتے ہیں قرآن نے یہ بتانے کے لیے کہ جنت کسی مقام کا نام نہیں ہے کہا ہے کہ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (مطالب الفرقان ص: ۳۳۲، ۳۳۳)

جنت میں ازواج

اس عنوان کے تحت چوہدری غلام احمد خان پرویز نے لکھا ہے کہ جنت اخروی تو کوئی محسوس اور

مادی چیز نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی مقام ہے تو وہاں ازواج سے مراد ''ہم آہنگ ہم پیالہ، وہم نوالہ رفقاء ہونگے اس میں مرد عورتیں سب شامل ہونگے لیکن وہاں میاں بیوی کے تعلقات اور جنسی خواہشات کی تکمیل کا کوئی تصور نہیں ہوگا کیونکہ وہاں کوئی مادی چیز نہیں ہوگی صرف کیفیات ہونگی۔

جنت میں حُور

غلام احمد پرویز نے جنت کی حوروں کا بھی انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حور سے مراد موٹی آنکھوں والا انسان ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت ہو تو یہ موٹی موٹی آنکھوں والے مرد اور عورتیں اخروی جنت میں ساتھ ساتھ ہونگے آپس میں رفقاء ہونگے اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا

(مطالب الفرقان ص: ۳۳۸، و۳۳۹)

البتہ غلام احمد پرویز دنیوی جنت کا تصور پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اعمال صالحہ کرتے ہیں ان کو اسی دنیا میں حسی مادی جنت ملے گی جس میں باغات اور نہریں ہونگی اس نظریہ کے پیش نظر غلام احمد پرویز نے دسیوں آیات اور سینکڑوں احادیث کا انکار کیا ہے معلوم ہوا یہ بڑا بدبخت انسان گزرا ہے لیکن برصغیر میں اس جیسے جتنے گمراہ انسان آئے ہیں سب کا دادا سرسید احمد خان ہے گمراہی کا گندہ نالہ اسی کی طرف سے بہہ نکلا ہے۔

چنانچہ غلام احمد پرویز سرسید احمد خان کی تعریف میں یوں لکھتے ہیں:

''سرسید نے صدیوں کے جمود کی سلوں کو توڑا اور آنے والوں کے لیے فکر وتدبر کا راستہ صاف کیا اس کا یہ کارنامہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے بعد آنے والے قرآنی فکر میں کتنا ہی کیوں نہ آگے بڑھ جائیں اس ''سابق اول'' کے احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتے۔

(بحوالہ برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ ص: ۲۹۳)

تصور نماز اور پرویز

کہتے ہیں قیام صلوۃ سے مرسوم عبادت مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی معاشرہ کو

اطاعت الٰہی کے لیے منظّم کرنا (مذکورہ کتاب ص:٦٩٦)

معجزات کا انکار

پرویز لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا قرآن کریم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حسی معجزہ ثابت نہیں ہوتا۔ (مذکورہ کتاب:ص:٦٩٨)

مرکز ملت

پرویز نے اسلم جیراج پوری کا تصور مرکز ملت کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اختیارات اور اس کی تشریح مرکز ملت کے سپرد کردیے ہیں۔ (مذکورہ کتاب:ص:٦٩٩)

پرویز نے قرآن عظیم کی تمام مروجہ اصطلاحات کو نئے معانی ومفاہیم کا جامہ پہنایا مثلاً، خدا، عبادت، اسلام، ملائکہ، جنات، زکوۃ، روزہ، حج، قیامت، دوزخ، آخرت، ایمان بالغیب کا مروجہ مفہوم ہی یکسر بدل ڈالا پرویز کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام کا کوئی وجود نہیں ہے اور نہ وہ انسان اول ہے۔

ملائکہ بشمول جبریل امین سب کائنات کی بے جان قوتیں ہیں جنت وجہنم کا حقیقی وجود نہیں ہے۔ پرویز حشرِ اجساد اور قیامت کے دن کو نہیں مانتا پانچ ارکان اسلام نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کو اپنے حقیقی معنوں میں نہیں مانتا اسی طرح اسلامی نظام کو ہر زمانے میں ناقابل نفاذ سمجھتا ہے۔ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ حضرت مریم کی ایک مرد سے شادی ہوگئی تھی وہ معراج کا مطلقاً انکار کرتا ہے۔ (مذکورہ کتاب:ص:٦٩٩، ٧٠٠)

عرش کا انکار

پرویز صاحب عرش کے متعلق لکھتے ہیں عرش کا معنی چھت یا کسی بلند عمارت کے ہیں بادشاہوں

کے تخت کو بھی عرش یا کرسی کہا جاتا ہے لیکن جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنی کسی تخت کے نہیں بلکہ خود حکومت و تمکّن کے ہونگے یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اقتدار و اختیار جس سے نظام کائنات قائم ہے یہی معنی استویٰ علی العرش کے ہیں۔ (معارف القرآن مؤلفہ پرویز ص:۲۸۷)

تبصرہ:

انہیں کفریہ عقائد کی بنیاد پر علمائے کرام نے متفقہ طور پر غلام احمد پرویز کو دائرہ اسلام سے خارج مانا ہے علماء دیو بند بریلوی اور علماء اہل حدیث کا اس میں مکمل طور پر اتفاق ہے لہذا دور حاضر کے مسلمانوں مرد و خواتین اور خاص کر جوانوں سے میں گزارش کرتا ہوں کہ چوہدری غلام احمد خان پرویز کی کتابوں کے قریب بھی نہ جائیں۔اور اپنے ایمان وعقائد کی حفاظت کریں۔

غلام احمد پرویز مزید لکھتے ہیں کہ قرآن میں جہاں جہاں اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے (کتاب مذکور ص:۷۰۴) قرآن کریم میں بجز چند تفصیلی احکام دین کے اصول بیان ہوئے ہیں ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجتماعی نظام (امام وقت) اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی احکام خود مرتب کریگا احکام کا نام شریعت ہے۔ (مذکورہ کتاب ص:۷۰۴)

قرآن نے زکوۃ کا حکم دے کر اس کی شرح وقیود کو غیر متعین چھوڑ دیا ہے تاکہ ہر زمانہ کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود متعین کرتی رہے (مذکورہ کتاب ص:۷۰۴)

صراط مستقیم پر چلنے کا نام نماز ہے یعنی نشو ونما دینے والے کے قانون ربوبیت کے پیچھے پیچھے چلو (یہی نماز ہے)

گھوڑ دوڑ میں پہلے نمبر پر رہنے والے گھوڑے کے عین پیچھے پیچھے چلنے والا مُصَلّی (نمازی) ہے اسی طرح قانون ربوبیت کے پیچھے چلنے والا نمازی ہے (کسی نماز کی ضرورت نہیں ہے) سجدہ سے مراد قانون خداوندی کی اطاعت ہے (سجدہ کی ضرورت نہیں) رکوع کے معنی قانون

خداوندی کے سامنے جھک جانا ہے (نماز کے رکوع وسجدہ کی ضرورت نہیں)
حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں قرآن کا اعلان ہے ''وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً'' یعنی پرندے حضرت داؤد کی مجلس ذکر میں حاضر ہوتے تھے پرویز کہتا ہے کہ طیر سے قبیلہ طیر کے منتشر افراد مراد ہیں (مذکورہ کتاب: ص:۱۰۷)

تبصرہ:

چوہدری غلام احمد پرویز ۱۹۸۵ء میں مرگیا تھا۔ ان کفریات قارئین کے سامنے دوٹوک الفاظ میں بالکل واضح ہیں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے مجھے جب ان کی تفسیر القرآن میں ان کی غلطیوں کے نکالنے کی ضرورت پڑی تو میں حیران رہ گیا کہ یہ شخص تو قرآن میں بہت عمدہ عقائد کا اظہار کر رہا ہے توحید کا اعلان کر رہا ہے ان پر علماء نے کفر کا فتویٰ کیسے لگایا ہے پھر مجھے ان کی تفسیر مطالب الفرقان ملی اس میں انہوں نے اپنے کفریات بھر دیئے ہیں اس کے بعد مجھے برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ نام کی کتاب ملی اس کو جب میں نے دیکھا تو بہت مواد ملے جو میں نے ہدیہ ناظرین کر دیا ہے جس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں اپنی تفسیروں کے مقدمات میں بھی انہوں نے بہت غلط انداز اختیار کیا ہے۔ میں چوہدری غلام احمد پرویز کے لیے بھی وہی شعر سناتا ہوں

مشرقی ومغربی تعلیم حاصل کر مگر
بن کے علامہ وبالِ جہل ونادانی نہ بن

مولانا وحید الدین خان کی تفسیر

مولانا وحید الدین خان صاحب اب بھی زندہ ہے اور اس نے قرآن کی تفسیر لکھی ہے جس کا نام انہوں نے ''تذکیر القرآن'' رکھا ہے اس نے بھی عام مفسرین کے منہج کو چھوڑ رکھا ہے بلکہ اس وقت وہ عام مسلمانوں کی ہمدردی کے بجائے ہندوستان کے متعصب ہندو تنظیموں شیوسینا، آر

ایس ایس اور ہندو پریشد کی حمایت اور ہمدردی میں لگا ہوا ہے کبھی کبھی ان کے بتوں کے سامنے بھی آداب بجالاتے ہیں پٹنہ میں اس نے سرسوتی بت کے سامنے سر جھکایا اور قشقہ لگایا ماہنامہ زندگی نے اس کو تصویر کے ساتھ شائع کیا تھا یہ شخص پاکستان کا بہت بڑا دشمن ہے اس کا ایک ماہنامہ پرچہ الرسالہ کے نام سے شائع ہوتا ہے جس میں پاکستان اور اسلام کے خلاف بہت کچھ چھپتا ہے اس کی تفسیر میں انہوں نے قرآن عظیم کے عموم کو نظر انداز کیا ہے صرف تذکیر ودعوت کو قرآن کا محور قرار دیا ہے عام مفسرین کی شرائط تفسیر کو وحید الدین خان اس طرح ٹھکراتے ہیں، کہتے ہیں اہل فن نے قرآن کی تفسیر کے لیے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتائی ہے۔ لغت، نحو، صرف، اشتقاق، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم قرأت، علم عقائد، اصول فقہ، اسباب نزول، علم ناسخ ومنسوخ، علم فقہ، روایات، علم وہبی، یہ تمام غیر ضروری شرائط ہیں حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک ایمان، دوسرے عربی زبان۔

(بحوالہ الرسالہ جون ۱۹۸۱ء)

وحید الدین خان پاک وہند میں اس وقت جہاد کا نمایاں دشمن ہے قرآن عظیم سے جہاد کی آیات ہٹانے سے عاجز ہے ورنہ وہ اس کے لیے بھی تیار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مسلمان نوجوانوں کو وحید الدین خان وغیرہ کے غلط نظریات سے بچائیں آمین۔

تفسیر میں مولانا حمید الدین فراہی کا نظریہ

مولانا حمید الدین فراہی ۱۸۶۲ء میں ہندوستان کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں ''پھریہا'' میں پیدا ہوئے ''فراہی'' کی نسبت اسی پھریہا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے علاقے میں حاصل کی قرآن حفظ کیا، اور عربی زبان زیادہ تر علامہ شبلی نعمانی سے سیکھی پھر کچھ عرصہ کے لیے مولانا عبدالحئی لکھنوی کے درس میں شریک ہوئے لیکن طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے لکھنو چھوڑ کر لاہور آ گئے اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے پاس

عربی سیکھنے کے لیے پہنچے جب عربی ادب اور دینی علوم کی تحصیل سے فراغت ہوئی تو ۱۳۰۰ھ میں انگریزی سیکھنے کے لیے علی گڑھ میں داخل ہوئے تعلیم سے فراغت کے بعد سب سے پہلے ''مدرسۃ الاسلام'' کراچی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے پھر کراچی چھوڑ کر ۱۹۰۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ہوئے پھر یہاں سے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پرنسپل مقرر ہوئے آخر کار یہاں سے بھی استعفیٰ دیکر مدرسۃ الاصلاح ضلع اعظم گڑھ آ گئے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک یہی رہے اور یہی پر انتقال ہو گیا (بحوالہ برصغیر میں قرآن فہمی کا تنقیدی جائزہ ص: ۱۰۵)

یاد رہے مولانا شبلی نعمانی مولانا فراہی کے پھوپھی زاد بھی تھے اور نگران استاد بھی تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی کے عمومی حالات

مولانا حمید الدین فراہی کے خاص شاگرد امین احسن اصلاحی صاحب نے فراہی صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں پر عقیدت کے ساتھ اظہار خیال فرمایا ہے مولانا فراہی کی تفسیر نظام القرآن کی ابتداء میں مولانا امین احسن اصلاحی نے فراہی کی زندگی پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''عربی اور دینی علوم سے فارغ ہونے کے بعد کم وبیش بیس سال کی عمر میں مولانا انگریزی زبان کی تحصیل کے لیے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے سر سید احمد خان نے خود انگریز پرنسپل کو سفارشی خط لکھا اور مولانا فراہی کی اہمیت کا ذکر کیا علی گڑھ میں مولانا نے انگریزی اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ خاص توجہ کے ساتھ فلسفہ جدیدہ کی تحصیل کی اور اس میں امتیاز حاصل کیا اس زمانہ میں علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر انگریز مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ تھے مولانا نے فلسفہ کے درس تو ان سے ضرور لیے لیکن وہ ان سے خوش نہیں تھے (بحوالہ تفسیر نظام القرآن ۱۰،۱۱)

امین احسن اصلاحی مزید لکھتے ہیں کہ غالباً اسی دوران ۱۹۰۰ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے عرب سرداروں سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لیے سواحل عرب اور خلیج فارس کا سفر کیا اس سفر میں ان کو ترجمانی کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت پیش

آئی جو بیک وقت عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کا ماہر ہو اس کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا۔

علی گڑھ میں قیام

اس سفر سے واپسی کے بعد مولانا علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر ہوئے علی گڑھ میں اس زمانہ میں عربی کے پروفیسر مشہور جرمن مستشرق ہارویز تھے یوسف ہارویز نے مولانا سے عربی زبان کی تکمیل کی اور مولانا نے یوسف ہارویز سے عبرانی زبان سیکھی اور اس میں اس حد تک ترقی کر لی کہ عبرانی کتابوں سے براہ راست استفادہ کرنے لگے اور بعد میں اپنی قرآنی تحقیقات میں اس سے پورا فائدہ اٹھایا (تفسیر نظام القرآن ص:۱۲)

تدبر قرآن

اصلاحی صاحب لکھتے ہیں: ''یوں تو مولانا فلسفی بھی تھے، متکلم بھی تھے، عربی اور فارسی کے بے نظیر ادیب اور شاعر بھی تھے لیکن یہ ساری چیزیں مولانا کے ہاں ضمناً تھیں۔ اصلی چیز جو مولانا کے دل و دماغ اور علم و عمل دونوں پر حاوی تھی، وہ قرآن تھا، قرآن کی ایک ایک آیت بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر انہوں نے اس طرح غور کیا تھا جس طرح اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر غور کرنے کا حق ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے انہوں نے نہ صرف قرآن پر غور کرنے کا حق ادا کیا بلکہ ان ساری چیزوں کو بھی نہایت تنقید کی نگاہ سے پڑھا جو قدیم و جدید دونوں راستوں سے ان کو مل سکیں اور جو قرآن کے سمجھنے میں کسی نوعیت سے بھی معین ہو سکتی تھیں۔ کلام عرب کا ہر شعر جو قرآن میں سند کے کام آ سکتا تھا مولانا کی نگاہ میں تھا۔ خطبائے جاہلیت کا ہر خطبہ جو قرآن کے کسی مقام کی تفہیم میں معین ہو سکتا تھا مولانا کے علم میں تھا توریت اور تالمود پر وہ عالمانہ نظر رکھتے تھے اور عبرانی سے واقف ہونے کے سبب ان سے براہ راست فائدہ اٹھاتے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ کے اس سارے حصہ کو وہ اچھی طرح پڑھے ہوئے تھے جس کا کسی نوعیت سے بھی قرآن سے تعلق تھا۔ حدیث اور فقہ کے ذخیرہ کو انہوں نے قرآن کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھا تھا۔ فلسفہ جدید کی ان تمام

شاخوں کا بھی انہوں نے نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا، جو قرآن کے اجتماعی وسیاسی اور مابعد الطبیعی اصولوں کے سمجھنے اور ان کے موازنہ اور مقابلہ میں کارآمد ہو سکتی تھیں۔

مولانا نے قرآن مجید پر غور کرنے کا کام باضابطہ طور پر، جیسا کہ انہوں نے اپنے مقدمہ نظام القرآن میں خود ظاہر فرمایا ہے، اس زمانہ سے شروع کیا ہے جب وہ علی گڑھ میں بحیثیت ایک طالب علم کے مقیم تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سرسید مرحوم مغربی نظریات سے مرعوبیت کے سبب سے قرآن مجید کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں اور انگریزوں کے لائے ہوئے افکار ونظریات سے مرعوب تھا، بری طرح ان من مانی تاویلات کا شکار ہو رہا تھا۔ مولانا نے اس فتنہ کو جہاں ان انگریزوں کے تسلط کا ایک قدرتی نتیجہ خیال کیا وہاں اس حقیقت پر بھی ان کی نظر گئی کہ مذہبی علوم خصوصاً قرآن کے سمجھنے اور سمجھانے کا جو طریقہ مسلمانوں میں رائج اور مقبول رہا ہے وہ بالکل ہی غلط اور فرسودہ ہے اور اس غلط اور فرسودہ طریقہ نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو فکری اعتبار سے اس قدر کمزور اور منفعل بنا دیا کہ وہ بڑی آسانی سے ہر فتنہ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے مولانا کے دل میں یہ ڈالا کہ قرآن مجید پر غور کرنے کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حکمت قرآن کے دروازے کھلیں تا کہ مسلمان مغرب کی فاسد عقلیت سے مرعوب ہونے کے بجائے قرآن کی صالح عقلیت سے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ مولانا نے تفسیروں کے واسطہ سے قرآن کے سمجھنے کا مقبول عام طریقہ چھوڑ کر قرآن پر براہ راست غور کرنے کا طریقہ اختیار کیا'' (تفسیر نظام القرآن ص:۱۴، و۱۵)

مولانا حمید الدین فراہی اور علم حدیث

اصلاحی صاحب لکھتے ہیں: ''یہاں ایک فتنہ کی طرف بھی دو لفظوں میں اشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔ بعض منکرین حدیث کی طرف سے یہ بات بار بار ظاہر کی گئی کہ خدانخواستہ انکار حدیث میں مولانا حمید الدین فراہی بھی ان کے ہم مذہب تھے۔ اس فتنہ کا آغاز مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم

کے ایک مضمون سے ہوا جس میں ضمناً انہوں نے مولانا فراہی مرحوم کے متعلق ایسی بات لکھ دی تھی جو غلط فہمی پر مبنی اور غلط فہمی پیدا کرنے والی تھی۔ اسی بات کو منکرین حدیث لے اڑے اور اس کو انہوں نے انکار حدیث کے ثبوت میں پیش کرنا شروع کر دیا کہ صرف ہم ہی حدیث کے منکر نہیں ہیں بلکہ مولانا حمید الدین فراہی جیسا بلند پایہ محقق اور مفسر بھی حدیث کا منکر تھا۔ میں نے مولانا عبید اللہ مرحوم کے مذکورہ مضمون کے لکھنے کے کچھ ہی دنوں بعد رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں تفصیل کے ساتھ مولانا سندھی کے اس بیان کی تردید کر دی تھی اور اپنے مضمون میں وضاحت کے ساتھ وہ سارے پہلو بیان کر دیے تھے جن کے سبب سے مولانا عبید اللہ مرحوم کو یہ غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میرے اس مضمون سے جہاں تک مولنا عبید اللہ صاحب اور دوسرے صاف ذہن رکھنے والے اہل علم کا تعلق ہے مولانا فراہی کی نسبت یہ غلط فہمی دور ہوگئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے مجھے لاہور میں ملنے کا موقع ملا تو اثنائے گفتگو میں میرے اس مضمون کا ذکر بھی چھڑا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا سندھی نے اس وقت اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان کے مضمون سے ان کے ایک محبوب دوست (مولانا فراہی مرحوم) کے متعلق غلط فہمی پھیلی۔ لیکن میرے مضمون کو انہوں نے غالباً اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے کافی خیال کیا، اس وجہ سے خود اس مسئلہ پر لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی (ص:۱۶)

میں نے چھ سال ان کی صحبت میں رہ کر حدیث کے متعلق ان کا نقطہ نظر جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ سنت کو قرآن کے بعد اسی طرح دین کا دوسرا ماخذ سمجھتے ہیں جس طرح سارے صحیح العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں البتہ وہ علمائے محققین کی طرح روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ تفسیری روایات کے بارے میں وہ خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ محتاط تھے۔ ان روایات کو وہ ہرگز قبول نہیں کرتے تھے جو صریحاً قرآن کے خلاف پڑتی تھیں۔ تفسیر میں وہ اصل الاصول خود قرآن کے الفاظ، اس کے سیاق وسباق اور اس کے نظم کو قرار دیتے تھے۔ اس کے بعد تبعاً وہ احادیث وروایات کو لاتے تھے۔ اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے باوجود مجھے نہیں معلوم کہ انہوں

نے کسی آیت کی تاویل کسی صحیح حدیث کے خلاف کی ہو۔ اگر کہیں ان کو کسی صحیح روایت سے مجبوراً اختلاف کرنا پڑا ہے تو انہوں نے تنقید احادیث کے اصول سامنے رکھ کر اس پر تنقید کی ہے اور اپنے اختلاف کے وجوہ دلائل کے ساتھ بیان کیے ہیں''۔ (تفسیر نظام القرآن ص:۱۸)

جس طرح احناف عام ضرورت کے مسائل میں اور مالکیہ صحابہ کے عمل کے مقابل میں اخبار آحاد کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے اسی طرح فراہی بھی مذکورہ صورتوں میں اخبار آحاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

اپنی تصنیفات میں عربی زبان استعمال کرنے کی وجہ

امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے مولانا فراہی سے سوال کیا کہ آپ اپنی تمام چیزیں عربی میں کیوں لکھتے ہیں؟ جبکہ اس ملک کے لوگوں کی عام زبان اردو ہے اور ان کی بھاری اکثریت آپ کے افکار سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی؟ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ میرے نزدیک ساری خرابی کی جڑ یہ ہے کہ ہمارے علماء، فکری اور عملی دونوں اعتبار سے بالکل غلط راہ پر جا پڑے ہیں جب تک ان کی اصلاح نہ ہو کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی ہے میں پہلے ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں چونکہ میرے پیش نظر تمام عالم اسلام کے علماء ہیں اس وجہ سے میں نے عربی کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے یہی زبان تمام عالم اسلام کے علماء کی مشترکہ زبان ہے (ص:۲۱)

انکار خدا اور فراہی صاحب

امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ مولانا فراہی سے سوال کیا کہ آپ پر کوئی دور بے قیدی اور آزادی کا بھی گذرا ہے؟ فرمایا نہیں، پھر فرمایا کہ جس زمانہ میں، میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا اس زمانہ میں ایک مرتبہ میرے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوا تھا کہ خدا ہے یا نہیں؟ فرماتے تھے کہ اس سوال پر کوئی دو گھنٹے تک میں برابر غور کرتا رہا بالآخر میں یہ فیصلہ کر کے اٹھا کہ خدا ضرور ہے اس کے بعد پھر مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا۔ (تفسیر نظام القرآن ص:۲۲)

تبصرہ:

مندرجہ بالا عبارات اور تفصیلات جناب امین احسن اصلاحی نے جناب حمید الدین فراہی کے متعلق ان کی تفسیر نظام القرآن کے مقدمہ میں لکھی ہیں اس کے نقل کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ دیکھنے اور پڑھنے والا واضح طور پر سمجھ لے کہ جناب فراہی کون تھے کن کن غیر مسلموں سے اس نے پڑھا ہے اور کن کن غیر مسلموں کو انہوں نے پڑھایا ہے علی گڑھ کے آزاد ماحول میں وہ سرسید کے کس طرح قریب تھے اور وہ سرسید کے لیے کتنا منظور نظر تھے فراہی صاحب نے علماء سے کس طرح کنارہ کشی اختیار کی تھی اور غیر مسلموں کی کس طرح خدمت کی تھی پھر وہ مفسرین کے بارے میں کس نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور احادیث کے بارے میں کس طرح کمزور عقیدہ رکھتے ہیں حتی کہ انکار خدا کے خطرناک بحث میں جا پڑتے ہیں۔

یہ تو فراہی کے شاگرد خاص امین احسن اصلاحی صاحب کے مقدمہ تفسیر نظام القرآن سے چند عبارات تھیں آگے خود حمید الدین فراہی صاحب نے اپنی تفسیر نظام القرآن کے لیے ایک لمبا مقدمہ لکھا ہے جو سولہ دفعات اور عنوانات پر مشتمل ہے میں ان سے چند عبارات قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ فراہی صاحب کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے فراہی صاحب نے قرآن کی کوئی مستقل مسلسل تفسیر نہیں لکھی ہے بلکہ سورت فاتحہ سورت ذاریات سورت تحریم سورت قیامہ سورت مرسلات سورت عبس سورت شمس سورت تین سورت عصر سورت فیل سورت کوثر سورت کافرون سورت اخلاص چند سورتوں کی تفسیر لکھی ہے اور اس میں جگہ جگہ راہ حق سے ہٹ کر اپنا نیا راستہ اختیار کیا ہے وہی غلط راستہ اس کے شاگرد امین احسن اصلاحی اور پھر جاوید احمد غامدی نے اختیار کیا ہے میں چونکہ جاوید احمد غامدی کی لکھی ہوئی تفسیر ''البیان'' میں ان کی غلط روش کو واضح کرنا چاہتا ہوں لہذا اگر کوئی غلطی ان تینوں اشخاص کی مشترکہ غلطی ہوگی تو میں ان دو اشخاص کی غلطی کی نشاندہی بھی کروں گا اب سردست علامہ فراہی کی تفسیر نظام القرآن کی ابتدا میں ان

کے اپنے مقدمے میں جو قابل گرفت اصول ہیں وہ قارئین کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ عرض کروں کہ جناب حمید الدین فراہی صاحب سے متعلق اگر میں کچھ لکھتا ہوں تو وہ ان کے اپنے مضامین اور تفسیری تشریحات کی بنیاد پر لکھتا ہوں یا ان کے خاص شاگرد امین احسن اصلاحی صاحب کی تفصیلات کی بنیاد پر لکھتا ہوں میرے زمانے سے فراہی صاحب کا زمانہ بہت قدیم ہے میں ذاتی طور پر ان کی ذات کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھ سکتا ہوں البتہ میرے سامنے ان کی تفسیر نظام القرآن ہے وہ اردو میں ہے اور اردو بھی آسان ہے اس کا لکھا ہوا نظریہ میں نقل کرتا ہوں اور اس پر تبصرہ کرتا ہوں اس پر کسی کو شکوہ نہیں ہونا چاہیے یہ دین اسلام ہے اس میں غلطی کرنے والے کی غلطی پر گرفت کرنا اسلام کی تعلیمات میں سے ہے گونگا شیطان بننے سے بچنے کے لیے میں مجبور ہوں کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اور واضح طور پر وہ غلط ہے اس کا اظہار کروں باقی حمید الدین صاحب پر کس نے کفر کا فتویٰ لگایا اور کس نے رجوع کیا اور کس نے ان کا تزکیہ کیا اس سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔

علامہ فراہی کا مقدمہ قرآن

فراہی صاحب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت سے میں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیات قرآن کے باہمی تعلق کو واضح کروں اور قرآن مجید کی ایک ایسی سادہ وصاف تفسیر لکھوں جو ان تمام اختلافات سے بالکل پاک ہو جو ہمارے اندر عہد نبوت کے بعد پیدا ہوئے ہیں میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ نظم (ربط) کی تلاش میں، میں نے کسی شخص کی پیروی نہیں کی ہے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی بخشی بصیرت میری رہنمار ہی ہے۔ (مقدمہ تفسیر نظام القرآن ص:۳۱)

مولانا فراہی عام مفسرین سے الگ انداز اختیار کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں:

”بعض علماء نے اپنی کتابوں کی بناء روایات پر رکھی ہے مثلاً ابن جریر طبری، ان کی تفسیر کے متعلق

عام خیال یہ ہے کہ اس کے مثل کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی لیکن اس میں اکثر حدیثیں ضعیف ہیں مرفوع احادیث کا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں بلکہ بطور تائید کے پیش کیا کرتا ہوں پہلے ایک آیت کی تفسیر، میں اس کے ہم معنی دوسری آیات سے کرتا ہوں اس کے بعد تبعاً اس سے متعلق صحیح احادیث کا ذکر کرتا ہوں۔ (مقدمہ تفسیر نظام القرآن ص:۴۰)

تفسیر کے خبری مآخذ

اس عنوان کے تحت علامہ فراہی لکھتے ہیں کہ بعض مأخذ اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع کی، اصل واساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے باقی فرع کی حیثیت سے تین چیزیں ہیں۔

(۱) احادیث

(۲) قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات

(۳) گزشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں

اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ میں سے ان روایات کو نہ لے جو اصل کو ڈھانے والی ہوں اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت، یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت۔ اس طرح کی روایات کے بارے میں ہم کو نہایت محتاط رہنا چاہیے۔ صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہیے جو قرآن کی تصدیق وتائید کریں۔ مثلاً جو آثار حضرت ابن عباسؓ سے منقول

ہیں وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت قریب ہیں۔ پس اس طرح کی روایات کی طرف ہم ضمناً اشارہ کریں گے۔

اسی طرح اہل کتاب کی جو روایات ہمارے ہاں پھیلی ہوئی ہیں ان کے مقابل میں خود اہل کتاب کی تاریخ قابل ترجیح ہے۔ (مقدمہ تفسیر نظام القرآن ص:۴۴)

علامہ فراہی کے نزدیک معروف ومنکر کا تصور

علامہ فراہی کے نزدیک معروف ومنکر کا تصور عام علماء اسلام کے برعکس ہے وہ لکھتے ہیں ''معروف وہ ہے جس کو عرب نے معروف مانا ہو اور منکر وہ ہے جس کو انہوں نے منکر قرار دیا ہو عرب زمانہ جاہلیت میں ایسے جنگلی نہیں تھے کہ خیر وشر میں ان کو کوئی امتیاز ہی نہ ہو۔ یونانیوں اور ہندوستانیوں کے روشن ترین دور میں ان قوموں کے ادب کا جو حال تھا، اہل عرب کا ادب اخلاقی اعتبار سے ان سے بھی بدرجہا اونچا تھا۔ جن لوگوں نے ان کی تاریخ بگاڑی ہے اگر ان کی مہملات سے قطع نظر کر کے تم ان کے کلام پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ان کا اخلاقی معیار کتنا بلند تھا۔

(مقدمہ تفسیر نظام القرآن)

تبصرہ

میں نے حمید الدین فراہی صاحب سے متعلق امین احسن اصلاحی کے لمبے مقدمے سے اور اسی طرح خود حمید الدین فراہی کے لمبے مقدمے سے چند عبارات قارئین کے سامنے پیش کی ہیں میرا مقصد یہ ہے کہ لوگ حمید الدین فراہی کی اصلی حقیقت کو پہچان لیں جو لوگ ان کو ایک معصوم امام کے درجہ میں مانتے ہیں وہ اس حقیقت کو پالیں کہ حمید الدین فراہی صاحب کی حقیقت کیا ہے اور اس نے اپنے پیروکاروں کو کیا نظریہ دیا ہے۔ میں خود اقرار کرتا ہوں کہ حمید الدین فراہی صاحب بہت پرانے علماء میں سے ہیں اور ایک گہرے عالم ہیں لیکن جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اور مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے میں اس کے ساتھ کیا کروں؟ کیا اس کو چھپاؤں؟ یا ظاہر

کروں؟ اگر ظاہر کروں تو ان کے مداحین اور بہت سارے خوش فہمی میں مبتلا بے خبر لوگ مجھے برا کہیں گے اور اگر ان کے نظریات کو چھپاؤں تو قیامت میں خدا کو کیا جواب دونگا علماء اگر خاموش رہیں گے تو عوام تو تباہ ہو جائیں گے۔

بس آپ خود دیکھ لیں کہ فراہی صاحب کن خطرناک راستوں سے گزرے ہیں انہوں نے علی گڑھ میں ایسے استادوں سے پڑھا جن میں یہودی بھی ان کے استاد رہے پھر اسی ادارہ میں انہوں نے کئی یہودی طلبہ کو پڑھایا سرسید احمد خان سے ان کے گہرے تعلقات تھے بلکہ یہ ان کے منظور نظر تھے پھر لارڈ کرزن کے ساتھ ان کے طویل اسفار اور رفاقت نظر انداز کرنے والی چیزیں نہیں ہیں ایک لمحہ کے لیے ان تمام خطرناک چیزوں کو چھوڑ دیجئے صرف فراہی صاحب کی تحریرات کو دیکھ لیجئے۔ اور فیصلہ کیجئے کہ وہ کس رُخ پر جارہے ہیں آئندہ ان کی تحریرات آرہی ہیں۔ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی نے ان کو منکر حدیث قرار دیا تھا پھر ان پر ایک دور ایسا آیا کہ وہ انکار خدا پر اتر آئے، میں نہیں کہتا ہوں کہ یہ ان کا دائمی عقیدہ بنا تھا لیکن اگر وہ امام معصوم تھے تو اتنی پستی میں کیوں چلے گئے کہ انکار خدا کر بیٹھے پھر یہ بھی دیکھئے کہ وہ تمام مفسرین کے طرز تفسیر کو فرسودہ قرار دیتے ہیں اور صحیح احادیث کا انکار کر جاتے ہیں مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں جو تین کذبات کا ذکر ہے بخاری اور مسلم نے اس روایت کو صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے فراہی صاحب بطور مثال اس کو حقارت کے ساتھ ٹھکراتے ہیں پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ فراہی صاحب احادیث کو تفسیر قرآن کے لیے فرع کا درجہ دیتے ہیں اور قوموں کے ثابت شدہ حالات اور گزشتہ یہود ونصاریٰ کے مشکوک روایات احادیث کے برابر لا کر رکھتے ہیں حالانکہ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن عظیم کی تفسیر کے لیے سب سے مقدم چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مقدسہ ہیں قوموں کے حالات اور سابقہ کتابوں اور صحائف کو تو کسی نے تفسیر قرآن کے لیے ذریعہ نہیں کہا ہے یہ تو مجمل مہمل اور مشکوک اشیاء ہیں جس کو تفسیر کے قریب نہیں لایا جا سکتا ہے۔

پھر فراہی صاحب نے معروف اور منکر کے تعارف کے لیے شریعت کے بجائے عرب قوم کو معیار

بنایا ہے حالانکہ امت اس پر متفق ہے کہ معروف وہی چیز ہے جس کو شریعت محمدیہ نے معروف کہا ہے اور منکر وہی ہے جس کو شریعت نے منکر جانا ہے گزشتہ اوراق میں یہی ساری چیزیں ہیں نے قارئین کے سامنے رکھ دی ہیں فراہی صاحب نے قرآن کو قرآن کے لیے تفسیر قرار دیا ہے تو ادباً عرض ہے کہ ہر عالم اور طالب علم فراہی صاحب کی تفسیر نظام القرآن کو پڑھیں تو ان کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ فراہی صاحب نے کوئی تفسیر پیش نہیں کی ہے بلکہ ایک آیت سے متعلق اس کے مشابہ دیگر آیات کو اکٹھا کیا ہے آپ کا طرز یہ ہے کہ آپ پہلے ایک مضمون بناتے ہیں اور پھر اس مضمون کی تائید کے لیے آیات ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی قرآن کے ذریعہ سے تفسیر ہے۔

مثال کے طور پر تفسیر نظام القرآن کی ابتداء میں فراہی صاحب نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی تفسیر لکھی ہے اس میں فراہی صاحب نے فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ کا ربط بتایا ہے اور پھر کسی نہ کسی مناسبت سے چھوٹی بڑی سترہ آیات کا بطور تفسیر ذکر فرمایا ہے اور سابقہ صحیفوں میں سے چھ عبارات پیش فرما کر دس صفحات پر مشتمل بسم اللہ کی تفسیر مکمل فرمائی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ تفسیر ہے یا کیا ہے پوری بحث میں احادیث میں سے کوئی حدیث پیش نہیں کی ہے نہ کسی صحابی کا قول اور نہ کسی تابعی کا قول ذکر کیا ہے نہ کسی مفسر کا نام لیا ہے اور نہ کسی تفسیر کا حوالہ دیا ہے یہ ان کی تفسیر کا نقشہ ہے اور اس میں اگر مختلف مقامات میں راہ راست سے ہٹ کر موٹی موٹی غلطیاں بھی کریں تو پھر سر پیٹنے کے سوا کیا ہوگا اب ظاہر ہے اس سے امت کے علماء وطلباء اور عوام کیا استفادہ کریں گے؟ سورۃ الفیل میں ''کیدھم'' کی تائیدات کو ڈھونڈ کر پیش کیا ہے اور انسٹھ اشعار کا ڈھیر لگایا ہے اور کہا ہے یہ تفسیر ہے اور اس میں بڑی بڑی فحش غلطیاں کی ہیں جو عن قریب آنے والی ہیں۔

حمید الدین فراہی صاحب کے شُذوذ کا ذکر

اب میں حمید الدین فراہی صاحب کے نوادِرات اور شذوذ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ حضرت فراہی صاحب نے جو عام مفسرین کے طرز تفسیر کو فرسودہ قرار دیا ہے تو خود انہوں نے اپنی تفسیر میں کیا گل کھلائے ہیں چودہ سورتوں پر مشتمل اس تفسیر کو میں حرفاً حرفاً نہیں پڑھ سکا اس میں جادۂ حق سے ہٹ کر بہت کچھ لکھا ہوگا مگر ان سورتوں کی تفسیر میں فراہی صاحب نے جو موٹی موٹی غلطیاں کی ہیں اور عام مفسرین سے بالکل الگ راستہ اختیار کیا ہے اور صحیح احادیث و مستند تاریخ سے راہ فرار اختیار کیا ہے میں اس کو قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں میں ان کی پوری عبارت نقل نہیں کر سکتا ہوں البتہ غلطی کی نشاندہی کر کے مقصودی عبارات اور صفحات کا حوالہ نقل کروں گا ''وباللہ التوفیق''۔

سورۃ ذاریات کی تفسیر میں موٹی موٹی غلطیاں

(۱)　مولانا فراہی صاحب نے سورۃ ذاریات کی ابتدائی آیات کی مناسبت سے ہواؤں کو مد نظر رکھا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ نظم قرآن کے پیش نظر آیندہ واقعات کو ہواؤں کے ساتھ جوڑ دیں اس جوڑنے میں فراہی صاحب نے بڑی غلطیاں کی ہیں چنانچہ اپنی تفسیر کے صفحہ ۱۶۰ پر اس نے ایک موٹی سرخی لگائی ہے جو یہ ہے۔

''قوم لوط کی ہلاکت غبار انگیز ہوا کے ذریعہ سے ہوئی''۔

اس سرخی اور اس عنوان کی وضاحت علامہ فراہی اس طرح کرتے ہیں، قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب کنکر پتھر برسانے والی تند ہوا بن گئی اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے　(تفسیر نظام القرآن ص: ۱۶۰)

اس کے بعد فراہی صاحب نے مزید لکھا کیونکہ ان کی (قوم لوط کی) تباہی تند ہوا سے ہوئی تھی جس نے ریت اور سنگ ریزوں سے ان کو ڈھانپ دیا اور اس ریت اور سنگ ریزوں کی اتنی مقدار ان کے اوپر لا ڈالی کہ ان کے نیچے ان کی بستیاں بھی ڈھک گئیں (تفسیر نظام القرآن ص:۱۶۱)

تبصرہ:

اس تفسیر اور اس نقشہ پیش کرنے میں مولانا فراہی نے قرآن کی کئی آیات سے اور کئی احادیث سے انحراف کیا ہے اور تمام مفسرین سے الگ ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے پتھر ہوا سے کہاں پیدا ہو گئے تھے؟ وہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں پہلے سے باقاعدہ بنائے گئے تھے جس پر نشانات لگے ہوئے تھے قرآن کریم کی آیت ہے ﴿لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ . مُسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ﴾ (ذاریات) سوال یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب تفسیر کس نے کی ہے کیا احادیث سے یہ تفسیر ثابت ہے یا صحابہ نے یہ تفسیر کی ہے یا تابعین میں سے کسی نے یہ تفسیر کی ہے یا صرف فراہی صاحب کا اختراع ہے۔

(۲) مولانا فراہی نے اپنی تفسیر میں سورۃ ذاریات کی آیت ۴۰ میں فرعون کی تباہی کا ذکر کیا ہے اور یہ سرخی اور عنوان لگایا ہے:

فرعون اور اس کی قوم کی تباہی پُروا ہوا سے ہوئی

اس عنوان کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ فراہی لکھتے ہیں کہ ''یہ پُوربی آندھی رات بھر چلتی رہی اور صبح کو تھم گئی ہوا کے زور نے سمندر کا پانی مغرب کی طرف خلیج سویز میں ڈال دیا اور مشرقی خلیج خلیج عقبہ کو بالکل خشک چھوڑ دیا پھر جب آندھی تھم گئی تو پانی اپنی جگہ پر پھیل گیا اور موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرنے والی جماعت غرق ہوگئی خلاصہ اس ساری تفصیل کا یہ نکلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تُند ہوا کے ذریعہ سے نجات بخشی اور فرعون اور اس کی فوجوں کو نرم ہوا کے ذریعہ سے ہلاک کر دیا۔ (تفسیر نظام القرآن ص:۱۶۳)

تبصرہ:

یہاں کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے ہر دیکھنے پڑھنے والا دیکھ سکتا ہے کہ علامہ فراہی نے بات کہاں سے کہاں تک پہنچادی پورے قرآن میں فرعون کی غرقابی کا ذکر پانی کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے اور صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر لاٹھی ماری جس سے پانی پہاڑوں کی طرح تھم کر کھڑا ہو گیا اور درمیان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ گزر گئے قرآن کی آیت ملاحظہ ہو ﴿فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ﴾ (شعراء:۶۳) ترجمہ: پھر ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ مار اپنے عصا سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی ہر پھانک جیسے بڑا پہاڑ (ترجمہ شیخ الہند)

اس میں ہواؤں کا ذکر کہاں ہے علامہ فراہی صاحب نے اس نئی تفسیر کے ذریعہ قرآن کی کئی آیات کی تصریحات سے انحراف کیا اور دسیوں احادیث کا انکار کر دیا اور بعینہٖ وہی نظریہ پیش کر دیا ہے جو سر سید احمد خان نے معجزات کے انکار کے سلسلہ میں پیش کیا ہے سر سید نے کہا کہ فرعون کی غرقابی سمندر میں مدو جزر کی وجہ سے ہوئی تھی علامہ فراہی نے شاید تورات سے یہ نظریہ اخذ کیا ہوگا منسوخ و مشکوک کتابوں سے استفادہ کرنے کا حشر ایسا ہی ہوتا ہے قارئین دیکھیں اور مجھے معذور سمجھیں کہ میں علامہ فراہی کو امام معصوم کہہ دوں یا کچھ اور کہہ دوں یا کیا لکھ دوں؟ قوم نوح کی ہلاکت کے لیے فراہی صاحب نے یہ عنوان باندھا ہے:

(۳) قوم نوح کی تباہی تند ہوا کے ذریعہ سے واقع ہوئی

اس عنوان کی وضاحت میں علامہ فراہی لکھتے ہیں نوح علیہ السلام کی قوم کی تباہی سے متعلق اس سورت میں کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے صرف اتنی بات اجمالاً کہی گئی ہے کہ جس طرح دوسری قوموں کو اللہ تعالیٰ نے عذاب میں پکڑا اسی طرح نوح علیہ السلام کی قوم کو بھی پکڑا لیکن قرآن اور تورات میں ان کی تباہی سے متعلق جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت

واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصل دخل ہوا کے تصرفات ہی کو رہا ہے اس میں طوفان کا لفظ خاص طور پر لائق غور ہے طوفان کے لغوی معنی دوران یعنی گردش کرنے اور چکر کھانے کے ہیں عام استعمال میں اہل عرب اس سے تند ہوا مراد لیتے ہیں جو تیزی سے چکر کھاتی اٹھتی ہے

(تفسیر نظام القرآن ص:۱۶۶)

تبصرہ:

علامہ فراہی نے قوم نوح کے عذاب کی نوعیت میں قرآن عظیم کی دسیوں آیات کو نظر انداز کیا اور کئی احادیث کا انکار کیا اور قوموں کی تاریخ، مفسرین کی تصریحات اور اجماعی عقیدہ کو پاش پاش کر کے رکھ دیا قوموں میں عاد پر ہوا کا عذاب آیا تھا اس میں واضح طور پر ہوا کا ذکر قرآن عظیم میں جا بجا موجود ہے اگر قوم نوح پر ہوا کا عذاب آیا تھا تو کم از کم قرآن عظیم میں کسی ایک جگہ اس کا ذکر تو ہوتا جب کوئی ذکر نہ ملا تو فراہی صاحب نے طوفان کے لغوی معنی بیان کرنے شروع کر دیئے اور جاہلیت کے اشعار کے طُومار کھول دیئے اصل میں سورۃ ذاریات کی ابتداء میں ﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا﴾ میں ہواؤں کا ذکر آ گیا ہے فراہی صاحب چونکہ قرآن کے نظم کو مد نظر رکھتے ہیں اور ربط کی کوشش کرتے ہیں اس لیے جن قوموں کے عذاب اور تباہی کا ذکر سورۃ ذاریات میں آیا ہے ان کے عذاب کو ہواؤں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے حالانکہ ربط اور نظم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص قرآن کے نقشہ کو مسخ کرنا شروع کر دے اور حقائق کو چھوڑ کر غیر ثابت شدہ خیالی حقائق کو مسلط کرنے کی ناپاک جسارت کرے میرے خیال میں فراہی صاحب اور ان کا گروہ نظم قرآن پر جوز ور لگا رہے ہیں یہ کوئی منصوصی حکم نہیں ہے یہ تو ایک انسان اور قرآن کے مفسر کے ذہنی نکات ہیں اچھے ہیں تو بہت اچھی بات ہے ورنہ یہ کسی قرآن وحدیث سے ثابت شدہ واجب الاتباع حق نہیں ہے میں نے شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دو دفعہ تفسیر قرآن پڑھی ہے اور سورۃ فاتحہ سے سورۃ والناس تک تمام سورتوں اور آیات کا ربط سیکھا ہے لیکن

ایسی چیز تو نہیں ہے کہ اگر کہیں نظر نہ آئی تو ہم قرآن میں یا واقعات واحکامات میں ہیر پھیر اور نسخ مسخ شروع کر دیں علامہ فراہی نے پوری سورۃ ذاریات کی اٹھتر صفحات پر مشتمل تفسیر میں ایک جگہ بھی کسی حدیث کو تفسیر میں پیش نہیں کیا نہ کسی حدیث کا نام لیا بس نظم قرآن کے پیچھے لگے ہیں اور اس میں قرآن عظیم میں ناشائستہ کھینچا تانی کرتے چلے گئے ہیں۔ میں پھر صاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ قرآن میں ربط کوئی منصوص چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ربط پیدا کرتا ہے تو بہت اچھا لیکن اس سے کسی حکم میں تغیر نہیں آنا چاہیے۔

سورۃ تحریم کی تفسیر میں فراہی صاحب کی غلطیاں

جب کوئی عالم دین جمہور امت کا راستہ چھوڑ دیتا ہے تو پھر سرگردان پھرتا رہتا ہے اور ان سے عجیب عجیب اقوال واعمال وافعال ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں مولانا حمید الدین فراہی صاحب ایک گہرا عالم ہیں لیکن جمہور کے راستے پر چلنا ان کو طبعاً پسند نہیں ہے وہ ہمیشہ ایسے راستوں پر چلنا پسند کرتے ہیں جو جمہور کے رخ پر نہ ہوں اس لیے ان کے شذوذ ونوادرات کا ایک سلسلہ جاری ہوا اور لوگوں نے خوب اس کا تماشا دیکھا اور شاعر نے کہا

نَزَلُوْا بِمَكَّةَ فِیْ قَوَافِلِ نَوْفَلِ
وَنَزَلْتُ بِالْبَيْدَاءِ اَبْعَدَ مَنْزِلِ

شاعر نے اپنی بدقسمتی کو بیان کیا اور کہا کہ سارے لوگ نوفل کے قافلوں کے ساتھ ہو کر مکہ پہنچ گئے حج وعمرہ کیا اور میں دور دراز مقام بیداء کے صحرا میں جا اترا اور الگ تھلگ رسوا ہو گیا۔ یہاں سورۃ تحریم میں بھی علامہ حمید الدین فراہی نے جمہور مفسرین سے الگ راستہ اختیار کیا اور کئی غلطیاں کیں۔

فراہی صاحب کی پہلی غلطی

سورۃ تحریم کی تفسیر میں حمید الدین فراہی صاحب نے پہلی غلطی آیت ایک اور آیت دو کے شان نزول کے بارہ میں کی ہے لکھتے ہیں

آیات ا۔۲ کا شانِ نزول

عورتیں اپنی نزاکت اور ذکاوتِ حس کے سبب سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض کھانے کی چیزیں ناپسند کرتی ہیں۔ یہ عام نسوانی فطرت امہات المؤمنین میں بھی موجود تھی۔ ان میں سے بعض کو بعض چیزیں طبعاً نامرغوب تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کو شہد (جیسا کہ روایت میں وارد ہے) ناپسند رہا ہو۔ بالخصوص شہد کی بعض قسمیں اپنی بُو اور مزے کی تلخی کے سبب سے ایسی ہوتی بھی ہیں کہ ہر شخص ان کو پسند نہیں کرسکتا۔ محمد ﷺ کو شہد بہت مرغوب تھا۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کی ازواج میں سے بعض کو یہ چیز ناپسند ہے تو آپ نے ترک فرمادیا۔ اور اس کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

الف: آپ میں غایت درجہ ایثار کا جذبہ تھا۔

ب: کمزوروں بالخصوص عورتوں اور یتیموں کے معاملے میں آپ غایت درجہ مہربان تھے۔

ج: آپ بالطبع عمدہ اور پاکیزہ چیزوں کو پسند فرماتے تھے اور بدبودار اور ناگوار چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے۔ یہ چیز آپ کے دین میں حلت و حرمت کی علامات میں سے بھی تھی۔ اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اپنی ازواج کی دلداری کے طور پر آپ نے شہد کھانا ترک فرمادیا ہو۔

علاوہ ازیں بعض اور اسباب بھی اس کے محرک ہوئے ہوں گے۔ جب صحابہ کو آپ کے اس ارادہ کا حال معلوم ہوا ہوگا تو آپ کی پیروی میں انہوں نے بھی شہد کا استعمال ترک کردیا ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو حکم دیا کہ اپنا یہ عہد توڑ دیں اور ''نقضِ عہد'' کی گرانی جو ایسی حالت میں قدرتاً ہر طبیعت محسوس کرتی، اس کا ازالہ یہ کہہ کر فرمادیا کہ ﴿وَاللّٰهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ (تفسیر نظام القرآن: ص ۲۱۰)

تبصرہ:

قارئین غور سے دیکھیں اور پڑھیں جناب فراہی صاحب سورۃ تحریم کے اس پیچیدہ اور حل طلب

مقام پر کس طرح چشم پوشی کر کے چلے گئے نہ کسی واقعہ کا ذکر کیا نہ کسی حدیث کا ذکر کیا یہ آیات جو اپنے اندر گہرے حقائق اور واقعات رکھتی ہیں اور انہیں واقعات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اتریں ہیں گویا فراہی صاحب کے نزدیک اس وقت کچھ بھی نہیں ہوا تھا نہ ماریہ قبطیہ کا کوئی قصہ پیش آیا تھا نہ حضرت زینب کے ہاں شہد کا کوئی واقعہ تھا نہ حضرت حفصہ کا کوئی قصہ تھا اور نہ حضرت عائشہ کا کوئی واقعہ تھا بس فراہی صاحب نے اپنے ذہن سے ایک مضمون تیار کر لیا اور یہاں لکھدیا کہ ازواج مطہرات میں سے کسی کو شہد پسند نہ تھا ان کی دلداری کے لیے نبی اکرم نے شہد کھانے سے قسم کھالی تو صحابہ نے بھی نبی اکرم کی پیروی میں شہد کھانا چھوڑ دیا فراہی صاحب یہ ایسا غلط نظریہ ہے جس کا تذکرہ نہ مفسرین نے کیا ہے اور نہ یہ مفروضہ کسی صحابی یا تابعی نے بیان کیا ہے صرف فراہی صاحب نے اپنی رائے پیش کی اور پھر کہا ایسا ہوا ہوگا اور ویسا ہوا ہوگا جمہور کا ساتھ چھوڑنے پر اسی طرح مار پڑتی ہے۔ صحاح ستہ کی کئی احادیث سے فراہی صاحب نے راہ فرار اختیار کیا۔

فراہی صاحب کی دوسری غلطی

علامہ فراہی نے سورۃ تحریم کی آیت تین چار اور پانچ کی تفسیر وتشریح میں بھی جمہور مفسرین سے الگ راستہ اپنایا اور ان آیات کی تفسیر میں ایسا مجمل مبہم گڈ مڈ تفسیر کی جس کو دیکھ کر پڑھنے والا تشویش میں پڑ جاتا ہے کہ مولانا کیا کہنا چاہتے ہیں اور کیا لکھنا چاہتے ہیں چنانچہ سرخی اور عنوان کو پڑھ لیجئے اور پھر ان کی تفسیر پڑھ لیجئے اور داد دیجئے۔

آیات تین تا پانچ کا شان نزول

مولانا ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آیت ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ ــــ اَبْکَارًا﴾ میں ایک دوسرے مگر پہلے سے بالکل مختلف ملتے جلتے ہوئے واقعہ کا بیان ہوا ہے۔ اور ''اذ'' کے بعد بالعموم مماثل واقعات ہی کا بیان ہوتا ہے۔ پہلے محمد

صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کا وہ پہلو بیان کیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کی غایت درجہ دلداری فرماتے تھے۔ پھر اسی سے ملتے جلتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے دوسرے پہلو کو بے نقاب کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان کو اپنا محرمِ اسرار بھی بناتے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ میاں بیوی کے باہمی تعلقات محبت میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ اسی چیز کو حاصل ہے۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے اپنے رازوں کو چھپاتا ہے تو اس نے اس کا درجہ بہت گرادیا ہے۔ وہ میاں بیوی کے فطری تعلق کو صرف ایک حیوانی خواہش کی تشفی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور بس۔

علاوہ ازیں اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ سوکنوں میں محبت، جو عورت کی سب سے اعلیٰ مگر کمیاب صفت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں بالعموم اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ میں، بوجہ ان کے کمال عقل اور ان کی پاکیزگی نفس کے، پورے طور پر موجود تھی۔ چنانچہ یہ باہمی محبت ہی تھی جس نے آپ میں رازداری کے تمام پردے اٹھادیے تھے اور ایک نے دوسرے سے ایک راز کی بات بے تکلف ظاہر کردی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی (ص:۲۱۲)

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ لغزش جو بر بنائے محبت و اخلاص صادر ہوئی اپنے محرک کے اعتبار سے بہت سی نیکیوں پر فضیلت کا درجہ رکھتی ہے　(تفسیر نظام القرآن ص:۲۱۲)

تبصرہ:

قارئین اس تفسیر کو پڑھیں اور دیکھیں کہ فراہی صاحب کس چیز کی تفسیر لکھ رہے ہیں اور کیا لکھ رہے ہیں کسی مفسر نے یہ طرز نہ اپنایا ہے نہ اس طرح کوئی تفسیر لکھی ہے یہ فراہی صاحب کا ذہنی اختراع ہے سوچنا چاہیے قرآن عظیم کے اتنے گہرے مقام میں فراہی صاحب نے نہ کسی حدیث کا ذکر کیا ہے اور نہ کسی مفسر کی تفسیر کا حوالہ دیا ہے نہ قرآن کے پہلے مخاطبین صحابہ کرام کا نام لیا ہے نہ کسی

تابعی کا نام لیا ہے۔ پھر عام مفسرین یہاں کچھ اور لکھ رہے ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر ہے مگر فراہی صاحب کچھ اور لکھ رہے ہیں جس سے قطعاً معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ قرآن عظیم کی ان آیات کی تفسیر ہے اگر میں اشارہ نہ کروں تو کیا کروں اور اگر اشارہ کروں تو احباب ناراض ہو جائیں گے کہ امام معصوم جناب فراہی صاحب کی جناب میں گستاخی ہوگئی۔
احباب کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس مقام پر تفسیرِ عثمانی کو دیکھیں تا کہ ان آیات کی تفسیر کھل جائے۔

فراہی صاحب کی تیسری غلطی

مولانا فراہی نے آگے جا کر آیت ﴿اِنْ تَتُوْبَا فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا﴾ میں جمہور امت سے بالکل الگ راستہ اختیار کیا اور بڑی غلطی کا ارتکاب کیا چنانچہ سرخی اور عنوان لگا کر لکھتے ہیں:

صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا کی لغوی تحقیق

دنیا کی تمام زبانوں میں عموماً اور عربی زبان میں خصوصاً خاص خاص الفاظ خاص خاص معانی کے لیے آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک کلی معنی کے تحت بھی ہوتے ہیں۔ جو لوگ زبان کی ان خصوصیات سے ناواقف ہیں وہ زبان کے فہم سے محروم رہتے ہیں۔
مثلاً ''میل'' (جھکنا، ہٹنا) ایک کلی مفہوم ہے۔ اس کے تحت عربی میں بہت سے الفاظ ہیں۔ مثلاً زیغ، جور، ارعواء، حیادۃ، انحراف وغیرہ، لیکن یہ سب میل عن الشیء یعنی کسی چیز سے ہٹنے اور پھرنے کے لیے آتے ہیں۔ پھر اسی کے تحت فیء، توبۃ، التفات اور صغو وغیرہ کے الفاظ ہیں جو سب کے سب میل الی الشیء یعنی کسی چیز کی طرف مائل ہونے اور جھکنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کے باریک فرقوں سے ناواقف ہیں وہ زبان کے سمجھنے میں خود بھی غلطیاں کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی غلطیوں میں ڈالتے ہیں۔
اس نکتہ کے واضح ہو جانے کے بعد عربی زبان کے ایک عالم سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ ''

صغت قلوبکما ''کے معنی انابت قلوبکما ومالت الی اللہ ورسولہ (یعنی تم دونوں کے دل اللہ اور اس کے رسول کی طرف جھک چکے ہیں) کے ہوں گے۔ کیونکہ صغو کا لفظ کسی شے کی طرف جھکنے کے لیے آتا ہے، کسی شے سے مڑنے اور ہٹنے کے لیے نہیں آتا۔ لفظ کی یہ حقیقت اس کے تمام مشتقات میں بھی موجود ہے۔ میں نے یہاں تفسیر تمام اشعار لسان العرب سے نقل کیے ہیں۔ اور جگہ جگہ بعض مفید اشارے بھی کردیے ہیں۔ جن لوگوں کو حق کی تلاش ہے ان کے لیے یہ شواہد بس کرتے ہیں۔ وہ ان کو پاکر پوری طرح مطمئن ہوجائیں گے اور گھڑنے والوں نے روایات وآثار میں جو زہر ملادیا ہے اس سے ہلاک نہ ہوں گے۔ گھڑنے والوں نے جب کتاب الٰہی میں لفظی تحریف کی راہیں بند دیکھیں تو معنوی تحریف ہی کے لیے انہوں نے کچھ دروازے کھول لیے دیکھو صغیٰ کے معنی زاغ کے کردینے کے لیے کیا کیا کوششیں کی گئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ حق کو باقی رکھتا ہے اور باطل کو برابر چھانٹتا رہتا ہے (تفسیر نظام القرآن ص: ۱۲۰)

تبصرہ:

فراہی صاحب نے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا میں صغا یصغو کی خوب لغوی تحقیق کی ہے اور کہا ہے کہ اس کا معنی مائل ہونے کا ہے اور یہ مائل ہونا اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے۔ اس پر فراہی صاحب نے قرآن کی آیات اور عرب شاعروں کے اشعار کا ڈھیر لگایا اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا کہ یہاں ان کے قلوب کا میلان ان کی محبت تھی اور ان ازواج کے دل اللہ اور اس کے رسول کی طرف محبت میں جھک چکے تھے۔

یہ عجیب تفسیر ہے صرف لغت میں میلان کے معنی کی وجہ سے فراہی صاحب نے تمام مفسرین کی تفاسیر کو نظر انداز کیا ساری احادیث کو ٹھکرادیا اور ایک نئی ذہنی تفسیر پر زور دیا اور اس کے خلاف جانے والوں کو تحریف معنوی کا مرتکب ٹھہرایا میں جواب میں زیادہ گہرائی میں نہیں جانا چاہتا میں صرف یہ کہتا ہوں کہ فراہی صاحب نے تمام مفسرین وصحابہ وتابعین اور واقعات کو جب مسترد

کر دیا تو انہوں نے خود کونسی تفہیم و تفسیر پیش کر دی؟ ان کی تفسیر تو قرآن عظیم کے ظاہری الفاظ اور ظاہری آیات کا بالکل منافی ہے نظم قرآن کس طرف ہے آیات کا مضمون کس طرف جا رہا ہے اور فراہی صاحب کس طرف جا رہے ہیں بس جو جمہور مفسرین کے راستوں کو چھوڑ کر نیا راستہ اختیار کرتا ہے اور احادیث اور شان نزول کے واقعات کو مسترد کرتا ہے ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔

نَزَلُوا بِمَكَّةَ فِي قَوَافِلِ نَوْفَلٍ
وَنَزَلْتُ بِالْبَيْدَاءِ اَبْعَدَ مَنْزِلٍ

لوگ نوفل کے قافلوں کے ساتھ مکہ جا پہنچے اور میں دور دراز صحرائے بیدا میں جا اترا۔

اب مفسرین کی ان تصریحات کو پڑھ لیجئے جن میں انہوں نے "فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا" کی تفسیر فرمائی ہے چنانچہ تفسیر مظہری ج ۹ ص: ۳۴۰ پر قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں "اَیْ زَاغَتْ وَمَالَتْ" یعنی تمہارے دل ٹیڑھے ہو گئے اور ایک طرف کو مائل ہو گئے اسی طرح تفسیر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور عام مفسرین نے یہی معنی لیا ہے تفسیر عثمانی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان کلمات کی تفسیر یوں فرمائی ہے:

یہ عائشہ و حفصہ کو خطاب ہے کہ اگر تم توبہ کرتی ہو تو بے شک توبہ کا موقع ہے کیونکہ تمہارے دل جادۂ اعتدال سے ہٹ کر ایک طرف کو جھک گئے ہیں لہذا آئندہ ایسی بے اعتدالیوں سے پرہیز رکھا جائے۔　　(تفسیر عثمانی ص:۷۴۳)

علماء حق اور عام مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے اور قرآن عظیم کی آیات کا مطلب بھی سمجھ میں آ جاتا ہے اس کو چھوڑ کر فراہی صاحب نے جو مبہم مجمل تفسیر کی ہے اس سے بالکل پتہ نہیں چلتا کہ یہ قرآن کی ان آیات کی تفسیر ہے حالانکہ انہوں نے عام مفسرین کو قرآن میں اس جگہ تحریف معنوی کا طعنہ بھی دیا ہے اور تحریف لفظی کا الزام بھی لگایا ہے مفسرین صغت قلوبکما کی تفسیر اي زَاغَتْ وَمالتْ سے کرتے ہیں اس کو فراہی صاحب تحریف کہتے ہیں۔

فراہی صاحب کی چوتھی غلطی

جناب حمید الدین فراہی صاحب نے سورۃ تحریم کی تفسیر میں ﴿اِنْ تَتُوْبَا فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ میں شرط کے لیے جو مقدر جزا مانا ہے وہ ''فلا جرمَ'' ہے یہیں سے فراہی صاحب کی غلطی شروع ہو جاتی ہے آیندہ اس کی عبارت میں ناظرین پڑھ لیں گے دیگر مفسرین نے اس شرط کے لیے مقدر جزا اس طرح مانا ہے کہ اگر تم دونوں توبہ کرتی ہو تو بے شک توبہ کا موقع ہے تفسیر مظہری نے اس طرح مقدر مانا ہے ''وجواب الشرط محذوف'' ای اتیتما بالواجب یعنی تم پر جو واجب تھا کہ توبہ کرو وہ تم نے کر لیا کیونکہ تمہارے دل راہ اعتدال سے ہٹ گئے تھے تفسیر عثمانی کی عبارت میں نے اس سے پہلے نقل کی ہے جس سے پوری حقیقت واضح ہوگئی ہے اب سارے مفسرین نے اسی طرح قرآن عظیم کی اس آیت کو سمجھایا ہے مگر فراہی صاحب نے ایک الگ راستہ اختیار کیا ہے اور شواہد واشعار سے اپنا مطلب نکال کر چوتھی غلطی کا ارتکاب کیا ہے مفسرین اور محدثین اور صحابہ کرام فرماتے ہیں کچھ نقصان ہوا ہے فراہی صاحب کہتے ہیں کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ فراہی صاحب کا خیال قرآن کی آیات کے خلاف ہے اور صحابہ کرام واحادیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہے پھر احادیث کو جھوٹا قرار دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں: ان مثالوں پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح کے اسالیب قد کے بعد جو جملہ ہوا کرتا ہے وہ اس امر کی آسانی اور سہولت کو بیان کرتا ہے جو ''ان'' کے بعد کہی جاتی ہے۔ یعنی اسلوب کے محذوف کو اگر کھول دیا جائے تو تقدیر کلام یہ ہوتی ہے کہ اگر ایسا ایسا ہوا تو کچھ حرج نہیں، یا کوئی اشکال نہیں، یا یہ معمولی بات ہے کیوں کہ ایسا ایسا ہو چکا ہے۔ پس اس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا جوئی کے لیے خدا سے توبہ کرو، جس طرح پیغمبر تمہاری دلداری فرماتا ہے، تو یہی بات تم سے متوقع ہے کیونکہ تمہارے دل تو اس کی طرف مائل ہی ہیں۔

یہ ایک بالکل واضح اور صاف تاویل ہے جس میں نہ کسی قسم کا اشکال ہے نہ کوئی شائبہ تکلف ہے۔

پھر نہیں معلوم یکسر جھوٹی روایات پر بھروسہ کر کے (جو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، حالانکہ ان کا دامن ان سے پاک ہے) لوگوں نے لفظ کے ٹھیک معنی اور کلام کے صحیح مدعا سے اعراض کیوں جائز سمجھا۔ (تفسیر نظام القرآن علامہ فراہی)

سورۃ عبس میں فراہی صاحب کی غلطیاں

جناب حمید الدین فراہی صاحب نے سورۃ عبس کی ابتدائی آیات کی تفسیر وتوضیح میں کئی غلطیاں کی ہیں۔

فراہی صاحب کی پہلی غلطی

فراہی صاحب نے پہلی غلطی یہ کی ہے کہ سورت عبس کے شان نزول میں جتنی روایات صحابہ کرام یا تابعین مفسرین نے ذکر فرمائی ہیں سب کو نا قابل اعتماد قرار دیا ہے ان روایات کا کچھ حصہ ناظرین کے سامنے رکھتا ہوں تاکہ پوری بات سمجھ میں آجائے صاحب تفسیر مظہری سورۃ عبس کی ابتداء میں شان نزول سے متعلق لکھتے ہیں: ذَكَرَ الْبغوی رحمه اللّٰهُ ان ابْن اُمِّ مكتوم اَتٰی رسول اللّٰهِ صلی اللّٰهُ علیه وسَلَّمَ وَهُوَ يُنَاجِیْ عُتبة بن رَبِيْعَة وابَاجَهل بن هشَام والعبَّاس بن عبدالمطلب وَاُبَی وَاُمَيَّةَ اِبْنَیْ خلَفٍ يَدْعُوْهُمْ اِلَی اللّٰهِ يرجوهُمْ اسلامَهُمْ فقال ابن ام مكتوم يارسُولَ اللّٰهِ اقرائنی القرآن وَعَلمنی مِمَّا علَّمَكَ اللّٰهُ فجعَلَ يناديْه ويكرر النِّدَاء ولايَدْرِیْ انَّهٗ صَلی اللّٰهُ عليه وسلَّمَ مقبل علی غَيْرِهٖ حتیٰ ظهرت الكرَاهَةُ فی وجهه صلی اللّٰهُ عليه وسلَّمَ لِقَطْعِ كَلَامِهٖ وَقَالَ فِیْ نَفْسِهٖ يَقُوْلُ هٰؤلَاءِ الصَّنَادِيْدُ اِنَّمَا اتباعه العميانُ والعبيدُ والسفلةُ فَعَبَسَ وجههٗ وَاَعْرَضَ عَنْهُ واقبل عَلَی الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كان يُكَلِّمُهُمْ فانزلَ اللّٰهُ تعالیٰ عَبَسَ مُحَمَّدٌ اَیْ كَلَحَ وَتَوَلّٰی اَعْرَضَ وَجْهَهٗ الخ (ج۱۰ص:۱۹۷)

ترجمہ: امام بغوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آئے کہ آپ عتبہ بن ربیعہ اور ابوجہل بن ہشام اور عباس بن عبدالمطلب اور ابی بن خلف اور امیہ بن خلف سے گفتگو فرما رہے تھے اور آنحضرت کو امید تھی کہ یہ لوگ اسلام قبول کرلیں گے اس لیے آپ ان کو دعوت دے رہے تھے اسی دوران عبداللہ بن ام مکتوم نے کہا یارسول اللہ! مجھے قرآن پڑھا دیجئے اور جو کچھ علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے وہ مجھے بھی سکھا دیجئے وہ اونچی آواز سے بار بار آنحضرت کو پکار رہے تھے ان کو معلوم نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہیں آنحضرت کے کلام کے منقطع ہونے کی وجہ سے آپ کے چہرہ انور پر بوجھ ظاہر ہوا اور دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ قریش کے یہ سردار کہیں گے کہ اس نبی کے ماننے والے تو اندھے غلام اور گرے پڑے لوگ ہیں آنحضرت کے چہرہ انور پر بل آگئے اور آپ نے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا اور ان سرداران قریش کی طرف متوجہ ہوگئے جن سے آپ گفتگو فرما رہے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے اس طرح قرآن اتارا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ محمد نے تیوری چڑھالی اور منہ موڑ لیا اس وجہ سے کہ ان کے پاس ایک نابینا آ گیا تھا۔

﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ وهو ابن ام مكتوم المذكور كذا اخرج الترمذى والحاكم عن عائشة وفيه قال ابن ام مكتوم اترىٰ عما اقوله بأسا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا، واخرج مثله عن انس وكذا روى ابن ابى حاتم عن ابن عباس وفيه فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد ذالك اذا رأه يكرمه ويقول مرحباً بمن عاتبنى فيه ربى ويقول له هل لك من حاجة وفيما روى الترمذى والحاكم عن عائشة ان النبى صلى الله عليه وسلم استخلفه على المدينة مرتين فى غزوتين وذكر الاعمى فى الأية اشعار بعذره فى الاقدام على قطع كلام النبى صلى الله عليه وسلم

ترجمہ: وہ نابینا عبداللہ بن ام مکتوم تھے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اسی طرح ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہ سے یہ حدیث بیان کی ہے اس میں مزید یہ تفصیل ہے کہ ابن ام مکتوم نے کہا یا رسول اللہ آپ میرے ایک سوال کرنے میں حرج محسوس کریں گے یا نہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ حضرت انس سے بھی اسی طرح روایت ترمذی اور حاکم نے نقل کیا ہے اسی طرح ابن ابی حاتم نے بھی حضرت ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے اس میں مزید یہ مذکور ہے کہ اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ابن ام مکتوم کو دیکھتے تو آپ کا اکرام فرماتے اور یہ فرماتے کہ خوش آمدید ہو اس شخص کے لیے جس کے بارے میں میرے رب نے میرا عتاب کیا ہے پھر آپ فرماتے کہ کیا آپ کی کوئی ضرورت ہے؟ حضرت عائشہ سے ترمذی اور حاکم نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو غزوات میں دو دفعہ ابن ام مکتوم کو مدینہ منورہ پر اپنا خلیفہ مقرر فرمایا (تاکہ آپ کی دلجوئی ہو) قرآن کریم میں اعمیٰ نابینا کا لفظ اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے کاٹنے پر معذور سمجھا جائے (کہ یہ نابینا تھا ان کو صحیح ادراک نہ تھا)

یہ تصریحات و تفسیرات مفسرین اور صحابہ کرام نے اس واقعہ سے متعلق بیان فرمائی ہیں اب آیئے اور فراہی صاحب کے خیالات ورجحانات وتردیدات کو ملاحظہ فرمائیں۔

فراہی صاحب کی دوسری غلطی

فراہی صاحب فرماتے ہیں پس آپ ﷺ نے جو کچھ کیا غیرت حق اور مصلحت دعوت و تبلیغ کے تقاضے سے کیا لیکن اسی سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ آنحضرت جوش تبلیغ و دعوت میں اپنے حدود سے کسی قدر آگے نکل گئے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آپ کو متنبہ کر دیا کہ آپ اپنے فرض سے زیادہ ذمہ داری اٹھالی ہے۔ اور کلام کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے بظاہر

عتاب مترشح ہوتا ہے، لیکن عتاب کا اصلی رخ کفار و منکرین کی طرف ہے محمد ﷺ کی طرف نہیں۔ آپ کی تو اس میں تعریف کی گئی ہے اور ساتھ ہی آپ کے صحابہ کی بھی دلداری کی گئی ہے۔ عتاب کا روئے سخن بظاہر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن خفگی کا تمام زور منکرین و معاندین پر پڑ رہا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اس عتاب کے اندر شفقت والتفات کی نہایت جان نواز ادائیں پنہاں ہیں۔ تعجب ہے کہ سورۃ کا یہ مفہوم نہایت واضح ہونے کے باوجود مفسرین سے مخفی رہ گیا ہے اور وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں میں پڑ گئے۔ ہم آگے کی فصلوں میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔　(ص:۳۲۲)

تبصرہ:

فراہی صاحب کا کلام عجیب ہے ابتداء میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا وہ غیرت حق اور مصلحت تبلیغ کے تقاضے سے کیا پھر کہتے ہیں کہ آنحضرت جوش تبلیغ میں تبلیغ کی حدود سے آگے نکل گئے اس لیے اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ آپ نے اپنے فرض سے زیادہ ذمہ داری اٹھالی۔ اسلوب کلام سے عتاب مترشح ہوتا ہے لیکن عتاب کا سارا زور کفار منکرین پر پڑ رہا ہے آنحضرت کی تو لطیف انداز سے تعریف کی گئی عتاب اور خفگی کا سارا زور منکرین و معاندین پر پڑ رہا ہے افسوس ہے کہ یہ تفسیر اور یہ مطلب تمام مفسرین پر مخفی رہ گیا اور وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں میں پڑ گئے بہر حال فراہی صاحب کا مطلب غلط ہے تفسیر بھی غلط ہے مفسرین پر الٹا الزام بھی غلط ہے۔ ان کی تفسیر تو ایک مبہم چیستان ہے۔

حمید الدین فراہی صاحب کی تیسری غلطی

میں نے اوپر عربی عبارات کو ترجمہ کے ساتھ نقل کر دیا ہے جس سے سورت عبس کا شان نزول اور سورت کا مطلب واضح ہو جاتا ہے لیکن فراہی صاحب ان روایات کو نقل کر کے سب کو مسترد کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم وارشاد کی

درخواست کی تھی اور آپ نے اس سے اعراض فرمایا اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔

اس قول کو وہ لوگ بعض اکابر سلف سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی قریشی سردار سے باتیں کر رہے تھے کہ اسی بیچ میں ابن ام مکتومؓ نے پہنچ کر درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ ان کی یہ بے موقع درخواست آپ کو ناگوار ہوئی اور اس پر یہ آیت اتری۔ بعض لوگ انہی حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مجلس میں ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ جیسے سرداران قریش شریک تھے۔ بعض لوگ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عتبہ بن ربیعہ، عباس بن عبدالمطلب، ابوجہل بن ہشام سے باتیں کر رہے تھے کہ ابن ام مکتوم نے آکر درخواست پیش کی کہ " علمنی مما علمک الله (اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم بخشا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھایئے) آپ کو ان کی بے محل مداخلت ناگوار ہوئی اور اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔ بعض لوگ حضرت ضحاکؒ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت اشراف قریش میں سے کسی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ابن ام مکتومؓ پہنچے اور انہوں نے اسلام کے متعلق بعض باتیں پوچھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ابن ام مکتومؓ ایسے وقت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے کہ آپ عتبہ وشیبہ سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک اور روایت ابو مالک سے ہے کہ آپ کی گفتگو امیہ بن خلف سے تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابی بن خلف سے باتیں کر رہے تھے۔ ان تمام روایات پر غور کرنے سے ایک امر واضح ہے کہ یہ سب روایتیں ایسے لوگوں سے مروی ہیں جن میں سے کوئی بھی شریک واقعہ نہیں تھا۔ بس اگر ان کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی ان کی نوعیت استنباط کی ہوگی، خبر کی نہ ہوگی۔ پھر ان میں باہم دگر اس قدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت صرف اوہام کی رہ جاتی ہے۔ واہمہ نے ایک طویل اختراع کی اور جھٹ اس کے لیے ایک قصہ کا جامہ تراش لیا گیا اور اس کی نسبت ان لوگوں کی طرف کر دی گئی جن کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ باعتبار سند یہ تمام روایتیں نہایت ضعیف ہیں، ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔

اور قرآن مجید سے بوجوہ ذیل ان کا غلط ہونا آشکارا ہے۔

آیت کے الفاظ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا کو دیکھ کر تیوری چڑھائی یا اس کے سامنے ترش رو ہوئے (جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے) اور اگر آپ ایسا کرتے بھی تو ایک نابینا کو اس ترش روئی کا کیا احساس ہوسکتا تھا؟ آپ کی آزردگی کا باعث محض ان کا آنا تھا کیوں کہ اس سے ان سرکشوں کو موقع مل رہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر طعن کریں اور آپ کی مخالفت کا ایک بہانہ پیدا کرلیں۔

لیکن یہ ساری مشکلات تفسیری روایات کی پیدا کردہ ہیں۔ جن لوگوں کی نظر قرآن مجید کے سیاق وسباق اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی پر ہے ان کے نزدیک اس تاویل اور ان تمام ضعیف روایات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ (تفسیر نظام القرآن ص:۳۲۲)

تبصرہ:

فراہی صاحب اور ان کی پارٹی کے تمام افراد کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن میزان ہے اس کے ظاہر پر عمل کرنا ہوگا لیکن یہاں سورت عبس میں ان حضرات نے ظاہر آیات کو نظر انداز کیا اسی طرح صحابہ کی تفسیر اور احادیث کی روایات کو مسترد کیا اس سے صرف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ حضرات قرآن کی تفسیر میں کسی حدیث کے پیش کرنے سے بدکتے ہیں اس لیے یہاں صحابہ وتابعین کی واضح تفسیر کو ترک کردیا اور اپنی طرف سے ایک مجمل ومبہم تفسیر کو پیش کیا اور کفار قریش کو عتاب کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ان جیسے مقامات میں فراہی صاحب اور امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید احمد غامدی صاحب ایک ہی انداز پر اس طرح گفتگو کرتے ہیں کہ یہ روایات ایسے راویوں سے منقول ہیں جن میں سے کوئی بھی شریک واقعہ نہیں تھا۔ فراہی صاحب کی یہ بات غلط ہے کہ حدیث کی روایت کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود شریک واقعہ ہو فراہی برادران ایک دوسرا ضابطہ بھی بناتے ہیں کہ اگر کوئی روایت صحیح بھی ہوجائے تو اس کی ایک حیثیت اخبار کی ہوتی ہے

اور دوسری حیثیت استنباط کی ہوتی ہے اس خود ساختہ خانہ ساز ایجاد بندہ ضابطہ سے یہ حضرات احادیث کو ٹھکراتے ہیں حالانکہ یہ ضابطہ کوئی ضابطہ نہیں ہے۔

حمید الدین فراہی نے سورۃ تین میں الگ راستہ اختیار کیا

سورۃ تین میں بھی فراہی صاحب نے عام مفسرین سے الگ راستہ اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ ''التِیّــن'' سے مراد جبل تین ہے یعنی یہ درخت نہیں بلکہ ایک پہاڑ کا نام ہے فراہی صاحب کے اس جداگانہ نظریہ پر ہمیں کوئی اشکال نہیں ہے نہ اس کو تنقید کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں کیونکہ بعض مفسرین نے اس کا ذکر کیا ہے اور تین کو درخت کے بجائے کسی مقام یا پہاڑ کو قرار دیا ہے لیکن ہمیں اس پر تحفظات ہیں کہ فراہی صاحب نے یک طرفہ فیصلہ کیا ہے اور مفسرین کی تفاسیر کو بالکل نظر انداز کیا ہے بلکہ ظاہر قرآن جو متبادر الی افہام العوام ہے اس کو چھوڑ دیا کیونکہ عوام انجیر کا لفظ سن کر انجیر ہی کو سمجھ جاتے ہیں اس سے ایک غیر متبادر معنی کی طرف چلے جانے پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فراہی صاحب نے قرآن کے ظاہر لفظ سے انحراف کیا ہے اور قطعی فیصلہ سنایا ہے کہ اس کے علاوہ انجیر کا کوئی اور معنی ممکن ہی نہیں۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں آئندہ فصلوں میں جب جزاء کے وہ واقعات بیان ہونگے جو ان مقامات میں پیش آئے ہیں تو ان سے معلوم ہوگا کہ تین اور زیتون مقامات ہی کے نام ہو سکتے ہیں اس کے سوا کوئی اور شکل ممکن نہیں ہے تورات میں بھی ایسے اشارات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مراد مقامات ہی ہیں۔ (تفسیر نظام القرآن ص:۳۹۱)

فراہی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ تین ایک خاص مقام کا نام ہے عرب اس کو اسی نام سے جانتے تھے تین انجیر کو کہتے ہیں چونکہ یہاں انجیر بکثرت پیدا ہوتی تھی اس وجہ سے یہ تین ہی کے نام سے مشہور ہو گیا (ص:۳۹۱)

بعض نے کہا تین کا یہ پہاڑ حلوان اور ہمدان کے درمیان ہے جبل تین اگلوں کے قول کے مطابق

کچھ ایسا دُور بھی نہیں بلکہ عراق کی پڑوس میں ہے (۳۹۲)

فراہی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کے قول سے بھی ہماری تائید ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ''التِیْــن'' سے مراد حضرت نوح کی وہ مسجد ہے جو کوہ جودی پر بنی ہوئی ہے حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہین کہ تین اور زیتون دو پہاڑ ہیں (ص:۳۹۲)

فراہی صاحب مزید لکھتے ہیں تین وہ پہلا مقام ہے جہاں انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا اور سزا کا معاملہ پیش آیا (ص:۳۹۵)

تبصرہ:

فراہی صاحب کی ان تصریحات سے مجھے اختلاف ہے اور صرف اتنا عرض ہے کہ ایک معروف مفہوم اور انجیر کا معروف معنیٰ پھل سے ہٹ کر مقامات کے پیچھے پڑ جانے کی کیا ضرورت ہے پھر ان مقامات کا تعین بھی مشکل ہے پھر ان مقامات کی بزرگی ثابت کرنا بھی مشکل ہے جس کی قسم کھائی گئی ہے نیز عام مفسرین معروف انجیر ہی کو مراد لیتے ہیں اور اس پر قسم کھانے کی معقول وجوہات بھی بیان کرتے ہیں چنانچہ قاضی ثناء اللہؒ تفسیر مظہری میں تین کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قال ابن عباس والمجاهد والحسن البصری وابراهیم وعطاء ومقاتل والکلبی تِیْنکُمُ الَّذِیْ تَأکُلُوْنَه وَزَیْتونکُمْ هٰذَا الَّذِیْ تَعْصِرُوْنَ مِنْهُ الزَّیْتَ خَصَّ التِّیْنَ بِالْقَسَمِ لِاَنَّهٗ فَاکِهَةٌ مخلقة لاعجم لها شبیهة بفاکهةِ الْجَنَّةِ قیل فی الحدیث انّه یقطع الْبَوَاسِیْر وینفع من النقرس رواه الثعلبی وابونعیم فی الطب باسناد مجهول (تفسیر مظہری ج۱۰:۲۹۶)

یعنی حضرت ابن عباس اور مجاہد اور حسن بصری اور ابراہیم اور عطاء اور مقاتل اور کلبی سب نے کہا کہ ''والتین'' سے مراد تمہارا وہی انجیر ہے جس کو تم کھاتے ہو اور تمہارے زیتون سے مراد تمہارا وہی زیتون ہے جس کو نچوڑ کر تم تیل حاصل کرتے ہو اور انجیر کو قسم کھانے

کیلئے اس وجہ سے خاص کیا کہ یہ ایسا پھل ہے جس میں پیدائش کے وقت سے گھٹلی نہیں ہے تو یہ جنت کے پھلوں کے مشابہ ہے ایک ضعیف روایت میں ہے کہ انجیر کا پھل بواسیر کے لیے مفید ہے اور یہ نقرس گھٹیا کا بھی علاج ہے ثعلبی اور ابونعیم نے ایک مجہول اسناد کے ساتھ اس روایت کو باب الطب میں نقل کیا ہے (تفسیر مظہری ج ۱۰: ۲۹۶)

حکایت

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ رحمہ اللہ نے ہمیں اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ میں کوہ طور پر گیا تھا وہاں ایک انگریز عورت بھی آئی تھی اس نے مجھ سے پوچھا کہ زیتون اور بلد امین اور طور سینین پر اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے تو یہ مبارک اور مقدس چیزیں ہیں لیکن اس انجیر میں کیا خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر قسم کھائی ہے میں نے کہا کہ دنیا میں جتنے پھل ہیں اس کے درختوں پر پھول آتے ہیں پھر پھل لگتے ہیں انجیر میں پھول نہیں ہوتے ہیں پھولوں پر شہد کی مکھیاں آکر اس کے رس کو چوس لیتی ہیں انجیر کا رس نہیں چوس سکتی ہیں تو سارے پھل ٹچ ہیں انجیر اَن ٹچ ہے۔

اس عورت نے کہا وری گڈ وری گڈ تھینکیو وری مچ۔

بہرحال تمام مفسرین اور اہل لغت کے ہاں التین جس کی قسم سورت تین میں اللہ تعالیٰ نے کھائی ہے وہی معروف انجیر کا پھل ہے لیکن فراہی صاحب سب کو مسترد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جبل تین ہے اس کے سوا کوئی شکل ممکن ہی نہیں ہے حالانکہ ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم قرآن کے ظاہر سے ادھر اُدھر نہیں جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کیوں گئے؟

سورۃ الفیل کی تفسیر میں فراہی صاحب کی غلطیاں

سورۃ الفیل کی تفسیر میں بھی فراہی صاحب نے عام مفسرین اور مشہور روایات کا راستہ چھوڑ دیا ہے اور اپنے ذہن کا ایجاد کردہ طریقہ پیش کیا ہے جس کی وجہ سے سورۃ الفیل کی تفسیر میں انہوں نے کئی

غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔

پہلی غلطی:

فراہی صاحب نے سب سے پہلی غلطی یہ کی ہے کہ انہوں نے ﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ﴾ کے خطاب میں قریش مکہ کو مخاطب بنایا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطبت کو مسترد کر دیا ہے چنانچہ اس نے ایک عنوان باندھا ہے اور پھر بڑے دعوے سے یہ کہا ہے کہ مخاطب قریش اور مکہ کے لوگ ہیں نبی علیہ السلام نہیں ہیں۔

اس سورت کا مخاطب کون ہے؟

فراہی صاحب لکھتے ہیں ہمارے نزدیک اس سورت کے مخاطب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا۔ یا اس کو بطریق تواتر سن کر اس پر یقین رکھتے تھے یہ زبان کا ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں واحد کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے۔ (تفسیر نظام القرآن ص:۴۶۶)

علامہ فراہی صاحب مزید لکھتے ہیں:

سوال:

ممکن ہے تمہارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب مشہور یہی ہے کہ " الم تر کیف " میں روئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور یہاں کوئی چیز اس بات کو ماننے سے مانع بھی نہیں ہے تو ایک مشہور بات کو چھوڑ کر اس کا مخاطب ایک جماعت کو کیوں سمجھا جائے؟ یہ سوال خود فراہی صاحب نے اٹھایا ہے اور جواب بھی خود دیا ہے۔

جواب:

" اَلَمْ تَرَ " کا استعمال زیادہ تر عام خطاب کے لیے ہے بغیر کسی قرینہ کے اس کو خاص خطاب کے مفہوم میں لینا اس کے عام استعمال کے خلاف ہے یہاں واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ جن لوگوں

نے واقعہ کا مشاہدہ کیا ہے انہی کو مخاطب مانا جائے۔ آگے فراہی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ چونکہ قرآن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے اس وجہ سے اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو کم از کم کسی کلام کی ابتداء میں خطاب پیغمبر ہی سے ہونا چاہیے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے (ص:۴۶۸) بہر حال گزشتہ تصریحات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس سورۃ میں مخاطب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ قریش ہیں ان وجوہ سے ضروری ہے کہ ''رَبُّکَ'' میں ضمیر خطاب کا مخاطب انہی (قریش) کو سمجھا جائے (ص:۴۷۰)

تبصرہ:

میں حیران ہوں کہ فراہی صاحب جیسے عالم وفاضل شخص کو کیا ہو گیا کہ اس بے علمی کے میدان میں اتر کر اپنی وقعت کو گرا دیا ہے۔ ان کی یہ منطق سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس واقعہ میں نبی علیہ السلام موجود نہیں تھے بلکہ مکہ کے قریش موجود تھے فراہی صاحب نے جاہلیت کے اشعار سے بے جا استدلال بھی کیا ہے تعجب اس پر ہے کہ ان کو کہاں سے معلوم ہوا کہ نزول قرآن کے وقت وہی لوگ موجود تھے جنہوں نے ابرھہ کی تباہی کا مشاہدہ کیا تھا فراہی صاحب نے بے سند اور بے مقصد جزئیات کو جوڑ کر تمام مفسرین کو غلط قرار دیا اور پھر ایک بدترین غلط راستے کو اختیار کیا ''رَبُّکَ'' کا مبارک خطاب پورے قرآن میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن فراہی صاحب یہاں یہ اعزاز قریش کو دے رہے ہیں جبکہ اہل مکہ وقریش اس وقت مسلمان بھی نہیں تھے اور نہ قرآن نازل ہوا تھا۔

مفسرین یہاں اس خطاب کے بارے میں یوں تصریح فرماتے ہیں:

"اَلَمْ تَرَ" خِطَابٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاِسْتِفْهَامُ لِلْاِنْكَارِ وَاِنْكَارُ النَّفْيِ اِثْبَاتٌ وَالْغَرَضُ مِنْهُ التَّقْرِيْرُ يَعْنِيْ قَدْ رَأَيْتَ يَا مُحَمَّدُ وَهُوَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ لَّمْ يَشْهَدْ تِلْكَ الْوَقْعَةَ لٰكِنْ شَاهَدَ اٰثَارَهَا وَسَمِعَ بِالتَّوَاتُرِ اَخْبَارَهَا فَكَاَنَّهٗ

رَاٰهَا وَجَازَ اَنْ يَّكُوْنَ الرُّؤْيَةُ بِمَعْنَى الْعِلْمِ (تفسیر مظہری ج ۱۰ ص: ۳۴۱)

ترجمہ: ''اَلَمْ تَرَ كَيْفَ'' اس میں خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور یہاں استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات کا فائدہ دیتا ہے اس سے مقصود استفہام تقریری ہے مطلب یہ ہوا کہ اے محمد! آپ نے یقیناً یہ واقعہ دیکھ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ اس واقعہ کے وقت موجود نہیں تھے لیکن آپ نے اس کے نشانات دیکھ لیے اور تواتر کے ساتھ اس کے واقعات واخبار سن لیے گویا کہ آپ نے خود دیکھ لیا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہاں رؤیت کا لفظ علم کے معنی میں ہو یعنی کیا آپ نہیں جانتے ہو بلکہ جانتے ہو کہ اس طرح واقعہ ہو گیا ہے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

یعنی ہاتھی والوں کے ساتھ تیرے رب نے جو معاملہ کیا وہ تم کو ضرور معلوم ہو گا کیونکہ یہ واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے چند روز پیشتر ہوا تھا اور غایب شہرت سے بچہ بچہ کی زبان پر تھا اسی قرب عہد اور تواتر کی بناء پر اس کے علم کو رؤیت سے تعبیر فرما دیا۔

(تفسیر عثمانی: ص ۸۰۳)

شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں یعنی وہ لوگ چاہتے تھے کہ اللہ کا کعبہ اجاڑ کر اپنا مصنوعی کعبہ آباد کریں یہ نہ ہوسکا اللہ نے ان کے سب داؤ پیچ غلط اور کل تدبیریں بے اثر کردیں کعبہ کی تباہی کی فکر میں وہ خود ہی تباہ وبرباد ہو گئے (ص: ۸۰۳)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اصحاب فیل کا پورا قصہ اپنی تفسیر میں یوں بیان کرتے ہیں فرماتے ہیں اصحاب فیل کا قصہ مختصر یہ ہے کہ بادشاہ حبشہ کی طرف سے یمن میں ایک حاکم ''ابرھہ'' نامی تھا اس نے دیکھا کہ سارے عرب کعبہ کا حج کرنے جاتے ہیں چاہا کہ ہمارے پاس جمع ہوا کریں۔

اس کی تدبیر یہ سوچی کہ اپنے مذہب عیسائی کے نام پر ایک عالیشان گرجا بنایا جائے۔ جس میں ہر طرح کے تکلفات اور راحت ودلکشی کے سامان ہو۔ اس طرح لوگ اصلی اور سادہ کعبہ کو چھوڑ کر

اس مکلّف و مرصع کعبہ کی طرف آنے لگیں گے۔ اور مکہ کا حج چھوٹ جائے گا چنانچہ ''صنعا'' میں (جو یمن کا بڑا شہر ہے) اپنے مصنوعی کعبہ کی بنیاد رکھی اور خوب دل کھول کر روپیہ خرچ کیا اس پر بھی لوگ ادھر متوجہ نہ ہوئے۔ عرب کو خصوصاً قریش کو جب اس کی اطلاع ہوئی، سخت خشمگیں ہوئے کسی نے غصہ میں آکر وہاں پاخانہ پھیر دیا، اور بعض کہتے ہیں کہ بعض عرب نے آگ جلائی تھی ہوا سے اڑ کر اس عمارت میں لگ گئی۔ ''ابرہہ'' نے جھنجھلا کر کعبہ شریف پر فوج کشی کر دی بہت سا لشکر اور ہاتھی لے کر اس ارادہ سے چلا کہ کعبہ کو منہدم کر دے درمیان میں عرب کے جس قبیلہ نے مزاحمت کی اسے مارا اور مغلوب کیا حضرت کے دادا عبد المطلب اس وقت قریش کے سردار اور کعبہ کے متولی اعظم تھے ان کو خبر ہوئی تو فرمایا لوگو اپنا بچاؤ کر لو، کعبہ جس کا گھر ہے وہ خود اس کو بچا لے گا۔ ابرہہ نے راستہ صاف دیکھ کر یقین کر لیا کہ اب کعبہ کا منہدم کر دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ کیونکہ ادھر سے کوئی مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔ جب وادی ''محسر'' (جو مکہ کے قریب جگہ ہے) پہنچا تو سمندر کی طرف سے سبز اور زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی ٹکڑیاں نظر آئیں۔ ہر ایک کی چونچ اور پنجوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں تھیں۔ ان عجیب و غریب پرندوں کے غول کنکریاں لشکر پر برسانے لگے۔ خدا کی قدرت سے وہ کنکر کی پتھریاں بندوق کی گولی سے زیادہ کام کرتی تھیں۔ جس کے لگتی، ایک طرف سے گھس کر دوسری طرف سے نکل جاتی اور ایک عجیب طرح کا سمّی مادہ چھوڑ جاتی تھی۔ بہت سے وہیں ہلاک ہو گئے۔ جو بھاگے وہ دوسری بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر مرے۔ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریف سے پچاس روز پہلے ہوا۔ بلکہ بعض کہتے ہیں کہ خاص اسی روز آپ کی ولادت با کرامت ہوئی۔ گویا یہ ایک آسمانی نشان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد کا تھا۔ اور ایک غیبی اشارہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی فوق العادۃ حفاظت فرمائی ہے۔ اس گھر کے سب سے مقدس متولی اور سب سے بزرگ پیغمبر کی حفاظت بھی اسی طرح کریگا اور عیسائی یا کسی دوسرے مذہب کو یہ موقع نہ دیگا کہ وہ کعبہ اور کعبہ کے سچے خادموں کا استیصال کر سکیں۔ (تفسیر عثمانی ص:۸۰۳)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تفسیر کی پوری عبارت میں نے اس لیے نقل کی تا کہ معلوم ہو جائے کہ عام اہل حق مفسرین کی تفاسیر کے مضامین اسی طرح ہیں ناظرین اس کو دیکھیں اور پھر حمید الدین فراہی صاحب کی تفسیر کو دیکھیں کہ وہ کہاں جارہے ہیں اور کیا لکھ رہے ہیں چنانچہ وہ عام مفسرین پر تنقید بھی کرتے ہیں اور اپنی منفرد متوحش تفسیر کا اثبات ودفاع بھی کرتے ہیں چونکہ ان کے نزدیک ابرھہ پر سنگباری ابابیل پرندوں نے نہیں بلکہ مکہ کے قریش نے کی تھی پرندے تو صرف گوشت کھانے کے لیے آئے تھے وہ بھی چڑیاں تھیں چنانچہ لکھتے ہیں:

''پھر خیال کرو تم نے اپنے زور بازو سے ان کو (ابرھہ والوں کو) مغلوب نہیں کیا بلکہ اس کے لیے اس خدا کی تلوار بے نیام ہوئی جو اس گھر کا محافظ ہے خدا نے ان کے دلوں میں اپنا رعب ڈالا اور ان کو ایسی کنکریوں سے سنگسار کیا جن کے زخموں نے ان کے جسموں کو گلا ڈالا تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے ان کی لاشوں کے انبار دیکھے پھر خدا نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ چڑیاں بھیجیں جنہوں نے عظیم الجثہ ہاتھیوں اور سر بلند بادشاہوں کا گوشت نوچا اور تمہاری مقدس وادی کو بدبو سے پاک کیا

(تفسیر نظام القرآن ص:۴۷۱)

حمید الدین فراہی کی دوسری غلطی

علامہ فراہی لفظ (تـرمِيهِـمْ) کی غلط تفسیر کر رہے ہیں کہتے ہیں ہم فصل اول میں بیان کر آئے ہیں کہ یہاں خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں ہے بلکہ افراد اہل مکہ کی طرف ہے اور ''تَـرْمِيهِمْ'' کا لفظ ''عَـلَيهِـمْ'' کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے یا مستقل جملہ مستانفہ ہے۔ حال کی صورت میں یہ معنی ہونگے کہ اے مخاطب! دیکھ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ چڑیاں بھیجیں اور حال یہ تھا کہ تو ان پر پتھر پھینکتا تھا۔ استیناف کی شکل میں یہ معنی ہونگے کہ تم ان پر پتھر پھینکتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کھانے کے بھُس کی طرح بنایا (ص:۵۰۳)

تبصرہ:

قارئین حضرات! ذرا اس علامہ کی تفرد پسندی کو دیکھئے تَرۡمِیۡهِمۡ کی ضمیر قریش کی طرف لوٹا رہا ہے کہ قریش کے لوگ ابرھہ والوں پر سنگ باری کر رہے تھے اور ''اَرۡسَلَ عَلَیۡهِمۡ طَیۡرًا'' میں اس ضد پر کھڑا ہے کہ یہ چڑیاں گوشت خواری کے لیے آئی تھیں اور ابرھہ کے لشکر اور ہاتھیوں کے جسموں کو ان چڑیوں نے نوچ کر ختم کر دیا اور مفسرین غلط کہتے ہیں کہ پرندے آئے تھے اور سنگ باری کر کے ابرھہ کے لشکر کو تباہ کر دیا اور سیلاب آکر ان کے جسموں کو بہا لے گیا فراہی کہتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے بڑے اجسام کو سیلاب بہا لے گیا اور اس سیلاب سے پھر مکہ کیسے بچ گیا اور لاشیں کہاں چلی گئیں؟

اصل حقیقت

یہاں اصل حقیقت کچھ اور ہے علامہ فراہی کی قرآن عظیم کے بیان کردہ معجزات کے بارے میں یہ کوشش رہی ہے کہ وہ معجزات کے مافوق الفطرت حیثیت کو چھپائے اور ہر معجزہ کے لیے ایک ظاہری سبب پیدا کر دے یہاں ان کی تفسیر نظام القرآن ص: ۴۹۰ کو آپ پڑھ لیں تو آپ کو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ فراہی صاحب اقرار و انکار کو ملا کر کس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے جس طرح سورۃ ذاریات میں فراہی صاحب نے قوم لوط قوم نوح قوم فرعون پر آنے والے سارے عذابوں کے لیے ایک ظاہری سبب ہوا قرار دیا ہے یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ بعینہٖ یہی صورت واقعہ فیل میں بھی نظر آئی قریش سنگ باری کر کے ابرھہ کی فوج کو خانہ کعبہ سے دفع کر رہے تھے اللہ تعالیٰ نے اسی پردہ میں ان پر آسمان سے سنگ باری کر دی۔

(تفسیر نظام القرآن ص: ۴۹۰)

یہ بعینہٖ سرسید احمد خان کا طریقہ ہے کہ ہر معجزہ کے لیے ایک ظاہری سبب بتا کر معجزہ کا انکار کرتا ہے یہاں ابابیل کی سنگ باری ایک مافوق الفطرت معجزاتی کرشمہ تھا اس سے راہِ فرار اختیار کرنے

کے لیے فراہی صاحب نے ظاہری سبب پیدا کر دیا کہ یہ سنگ باری قریش کی طرف سے ہوئی تھی اس طرح اس نے قرآن عظیم میں کھلی تحریف کی اور تفسیر بالرائے جیسے حرام کام کا ارتکاب کیا ان کی اس تحقیق پر تو چھوٹے بچے بھی ہنستے ہیں ان کے اس غلط راستے پر چل کر امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد غامدی نے بھی اندھا پن اختیار کیا اور اسی روش پر چلے فراہی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ معلوم ہے کہ وہ کوہ پیکر ہاتھیوں اور مقتولوں کی لاشوں کو کھانے کے لیے خدا نے سمندر کی جانب سے چڑیوں کے جھنڈ بھیجے اگر یہ لاشیں پڑی رہتیں تو ایک مدت تک کے لیے مکہ نا قابل سکونت ہو جاتا (تفسیر نظام القرآن ص:۴۹۱)

غلط راستے پر چلنے کے بارے میں شاعر نے کہا ہے

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی کیں راہ کہ تُو میروی بترکستان است

اے دیہاتی! مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ تک نہیں پہنچ سکو گے کیونکہ جس راستے پر چل رہے ہو یہ ترکستان کو جانکلتا ہے۔

یاد رہے فراہی صاحب کی اس عربی تفسیر کا ترجمہ امین احسن اصلاحی نے کیا ہے وہ ص:۴۹۰ پر اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے مجبوراً لفظ آیات کا ترجمہ معجزہ کیا ہے یہ متکلمین کی اصطلاح والا معجزہ نہیں ہے۔ بہر حال تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ ﴿طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ اور ﴿تَرْمِيْهِمْ﴾ کے متعلق لکھتے ہیں طَيْرًا اَبَابِيْلَ صِفَةُ طَيْرٍ اَیْ كَثِيْرَة مُتَفَرِّقَة تبع بعض جماعة جماعة اُخْرٰی يقال جاء تک الخيل اَبَابِيْلًا مِنْ هٰهُنَا وَمِنْ هٰهُنَا "تَرْمِيْهِمْ" ای اَصْحَابَ الْفِيْلِ صفة اخرى للطير (مظہری ج۱۰ص:۳۴۵)

ترجمہ: طیرا ابابیل میں ابابیل طیر کے لیے پہلی صفت ہے مطلب یہ کہ یہ پرندے متفرق طور پر بہت زیادہ آئے تھے جماعت در جماعت آگے پیچھے آرہے تھے عرب کہتے ہیں کہ گھوڑے ابابیلوں کی طرح آئے یعنی ادھر سے بھی آئے اُدھر سے بھی آئے "ترمیھم" یہ ابابیل پرندے اصحاب الفیل کو پتھر مار رہے تھے یہ لفظ طیرا کے لیے دوسری صفت ہے (تفسیر مظہری)

فراہی صاحب مفسرین اور اہل تاریخ پر غصہ ہو رہے ہیں

فراہی صاحب لکھتے ہیں کہ ابرہہ کے حملہ کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ عربوں سے ناراض ہو گیا تھا اس وجہ سے اس نے مکہ پر حملہ کر دیا لیکن حملہ کے اس سبب اور اہل مکہ کے فرار اور ابرھہ وعبدالمطلب کی گفتگو سے متعلق جو حالات اور واقعات بیان کیے گئے ہیں سب یک قلم بے بنیاد ہیں از روئے سند ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں ہے یہ تمام روایات ابن اسحاق پر ختم ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے تھے (ص:۴۸۴)

علامہ فراہی مزید رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں خود واقعات کی نوعیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام باتیں دشمنوں کی گڑھی ہوئی ہیں ان میں عربی غیرت وحمیت کی علانیہ تحقیر اور قریش کے غیور سردار عبدالمطلب کی بیباکانہ توہین کا پہلو بالکل نمایاں ہے نیز ابرھہ کے کریکٹر کو بہت شاندار دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ایک شخص پر ایک کنیسہ کی توہین کا الزام تراش کر بیت اللہ الحرام پر اس کے حملے کو جائز ثابت کیا گیا ہے اس پوری داستان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذلت ودنائت اور بے غیرتی وپست ہمتی کا کوئی ایسا الزام نہیں ہے جو عربوں پر عموماً اور قریش اور ان کے سردار (عبدالمطلب) پر خصوصاً نہ تھوپا گیا ہو بیان کیا جاتا ہے کہ جب ابرھہ نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا تو قریش کے سردار عبدالمطلب بجائے اس کے کہ قوم کو ساتھ لیکر اس گھر کی حفاظت کے لیے اٹھتے قوم کو لیکر پہاڑوں میں جا چھپے انہوں نے کہا کہ اس گھر کا رب خود اس کی حفاظت کر لے گا اس کے بعد خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک دعا مانگی اور تمام اہل مکہ کے ساتھ پہاڑیوں میں چلے گئے لیکن دنیا کے پردے میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی عبادت گاہ کو خدا کا گھر نہ سمجھتی ہو پھر اس سے اس بے حمیتی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ بغیر کسی مدافعت کے اپنا معبد دشمنوں کے حوالہ کر کے پہاڑیوں میں جا چھپے گی اس طرح بے حمیتی کا گمان تو ہم دنیا کی ادنیٰ قوموں کی

نسبت بھی نہیں کر سکتے ہیں تو قریش اور بنی اسماعیل کی نسبت کس طرح کر سکتے ہیں (ص:۴۸۵)

تبصرہ:

یہ فراہی صاحب کی غلط بیانی ہے عرب قبائل نے اپنے اپنے علاقوں میں ابرہہ کے لشکر کا خوب مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہوسکے پھر مجبور ہوکر اہل مکہ نے جو کنارہ کشی کا فیصلہ کیا اس پر فراہی صاحب کیوں غصہ کرتے ہیں۔ فراہی صاحب نے زور قلم دے کر خوب مقالہ لکھ ڈالا لیکن ان کے پاس کوئی نقل اور دلیل نہیں ہے مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے انہوں نے روایات کی مضبوط بنیادوں پر لکھا ہے۔

ابابیل سے متعلق حمید الدین فراہی کی غلط رائے

علامہ فراہی نے یہ طے کیا ہے کہ اہل تاریخ محدثین مفسرین کی آرا کچھ بھی ہوں وہ اس پر اطمینان کے ساتھ قائم رہیں گے کہ ''اَلَمْ تَرَ کَیْفَ'' میں خطاب اہل مکہ قریش کے ساتھ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب نہیں ہیں دوسرا فراہی صاحب نے یہ طے کیا ہے کہ ابرہہ کے لشکر پر سنگ باری ہوا کے ذریعہ سے آسمان سے ہوئی تھی ابابیل نے سنگ باری نہیں کی تھی البتہ ابابیل لاشوں کو نوچنے اور گوشت کھانے کے لیے آئے تھے۔ تیسرا فراہی صاحب نے یہ طے کیا ہے کہ اہل مکہ نے ابرہہ کا خوب مقابلہ کیا تھا مکہ کو چھوڑ کر بھاگنے کی باتیں ان کی توہین بھی ہے اور ان کو انتہائی بے غیرت و بے حمیت قرار دینا بھی ہے۔

فراہی صاحب کے اس نظریہ اور اس طے شدہ منصوبوں کے خلاف اگر کوئی ان کو نظر آتا ہے تو فوراً طیش میں آجاتے ہیں اور مفسرین و محدثین اور اہل تاریخ پر گستاخانہ حملے کرتے ہیں حالانکہ فراہی صاحب کے پاس کوئی منقول دلیل نہیں ہے کوئی حدیث نہیں ہے کوئی مستند تاریخ نہیں ہے صرف ان کا عقلی اجتہاد ہے اور جاہلیت کے اشعار کے اشارات ہیں پوری سورت فیل کی تفسیر میں فراہی صاحب نے جاہلیت کے انٹ شنٹ اشعار کا ڈھیر لگا کر ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا ہے اور یہود و نصاریٰ کی محرف

کتابوں کے کئی حوالے نقل کر دیے تا کہ اپنے شاذ نظریات کو ثابت کر سکے مگر تعجب ہے کہ اس پوری سورت کی تفسیر و تشریح و توضیح میں ایک حدیث کا ذکر بھی نہیں کیا ہے فراہی صاحب کے اس شاذ راستوں کے اپنانے سے جب ان پر اعتراض ہوتا ہے تو کبھی کبھی وہ ان اعتراضات کو نقل کر کے عجیب جوابات بھی دیتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ہم نے کہا کہ چڑیاں مکہ کو مقتولین کی لاشوں سے صاف کرنے کے لیے آئی تھیں حالانکہ مشہور روایت ہے کہ وہ اصحاب فیل کو سنگسار کرنے کے لیے بھیجی گئی تھیں۔ (ص:۴۹۲)

آگے فراہی صاحب کے لمبے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک فریق کا خیال ہے کہ چڑیاں اصحاب فیل کی لاشوں کے کھانے کے لیے آئی تھیں دوسرے فریق کا خیال ہے کہ چڑیاں اصحاب فیل پر پتھر مارنے کے لیے آئی تھیں یہ پتھر ان کی چونچوں اور چنگلوں میں ہوتے تھے یہ پتھر سواروں کے جسموں میں گھس جاتے تھے پھر ایک سیلاب آیا اور مقتولین کی لاشوں کو بہا لے گیا۔ فراہی صاحب فریق اول کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں اور فریق ثانی کی رائے پر اشکالات کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے چڑیوں کی شکل وصورت ان کا رنگ ان کی چونچوں کی زرد گونی ان کا لاشوں پر گرنا سب کچھ بیان کیا ہے ظاہر ہے کہ ان کا بیان عینی شہادت پر مبنی ہوگا (جس طرح فریق اول ہے) باقی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چڑیاں چونچوں اور چنگلوں میں پتھر اٹھائے ہوئے تھیں تو یا تو انہوں نے اوپر سے پتھر برستے ہوئے دیکھے اور دور سے یہ گمان کر لیا کہ یہ چڑیاں پھینک رہی ہیں یا ''تَرْمِيهِمْ'' کی ضمیر کا مرجع انہوں نے ''طَيْرًا'' کو سمجھا اور پھر اصل واقعہ کی تحقیق کیے بغیر آیت کی جو تاویل ان کے ذہن میں آئی اسی سانچہ میں انہوں نے قصہ کو بھی ڈھال لیا اس کے بعد جب یہ سوال سامنے آیا کہ ہاتھیوں اور مقتولین کی متعفن لاشیں جن سے تمام وادی مکہ اٹ گئی تھی کس طرح دور کی گئیں''۔

تو اس کا جواب یہ دیدیا کہ اللہ تعالیٰ نے سیلاب بھیجا اور وہ سب بہا لے گیا حالانکہ اس جواب کے

بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جو بے پناہ سیلاب ان تمام ہاتھیوں اور اتنی بے شمار لاشوں کو بہالے گیا آخر اس کی زد سے وادی مکہ کے باشندے کیسے بچ گئے؟ آگے بڑھ کر ان لوگوں کو ایک اور اشکال بھی پیش آیا ہے وہ یہ کہ ان چڑیوں کے چنگلوں اور چونچوں سے جو پتھر گرتے رہے ہونگے ظاہر ہے وہ سیدھے گرتے رہے ہونگے پھر ان ہاتھیوں کو کیسے لگے ہونگے جو ہودجوں اور سواروں سے بالکل ڈھکے ہوئے تھے اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ یہ پتھر سواروں کے جسموں سے گزر کر ہاتھیوں کے جسموں تک پہنچ جاتے تھے۔ (تفسیر نظام القرآن ص:۴۹۴)

یہ سوالات و جوابات خود فراہی صاحب کے بنائے ہوئے ہیں کیونکہ وہ قطعاً اس بات کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ابابیل کی طرف سے اصحاب الفیل پر سنگ باری ہوئی تھی چنانچہ آگے مزید لکھ کر فیصلہ سناتے ہیں:

''اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دوسرے فریق کی رائے تمام تر اس فرض پر مبنی ہے کہ سنگ باری چڑیوں کی جانب سے ہوئی یہ چیز ایک مرتبہ فرض کر لینے کے بعد واقعہ کا پورا سلسلہ آپ سے آپ اسی ڈھانچہ میں ڈھل گیا (خلاصہ یہ کہ) یہ رائے ذاتی مشاہدہ یا مشاہدہ کرنے والوں کے بیانات پر مبنی نہیں ہے (تفسیر نظام القران:۴۹۵)

فراہی صاحب مزید فیصلہ سناتے ہیں لکھتے ہیں:

''الغرض تمام قرائن وحالات کی شہادت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کی طرح اصحاب فیل پر بھی تند ہوا کا آسمانی عذاب بھیجا جس نے ان پر ہر طرف سے گرد وغبار کے ساتھ کنکریوں اور پتھروں کی بارش کی یہ سب اللہ تعالیٰ کے فرشتوں یا دوسرے لفظوں میں اس کی مخفی افواج کی کار فرمائی ہے (ص:۴۹۸)

تبصرہ:

فراہی صاحب نے خواہ مخواہ ایک طوفان کھڑا کر رکھا ہے انسٹھ اشعار میں ایک شعر بھی ایسا نہیں

ہے جس میں یہ لکھا ہو کہ پرندے گوشت کھانے کے لیے آئے تھے یا انہوں نے لاشوں کو نوچ کر کھالیا۔ شاعروں کے اشعار میں صرف ابابیل اور ابرہہ اشرم کے واقعہ کا بیان ہوا ہے اور پتھروں کے مارنے کا تذکرہ ہے جناب فراہی صاحب کو ان کے عقیدت مند ''امام فراہی'' کہتے ہیں لیکن ان کے اس غیر معقول تفردات اور شواذ کو دیکھ کر بچے تو ان پر ہنسیں گے ہم ہنسنے کے بجائے ان پر افسوس ہی کر سکتے ہیں امام یا حجۃ اللہ شیخ الحدیث یا شیخ التفسیر کہنا تو بہت دور کی بات ہے ان کی ان تفردات اور کچی باتوں نے ان کا علمی مقام بھی مخدوش بنا کر گرا دیا ہے۔

حمید الدین فراہی اور رمی جمرات

سورت الفیل کی تفسیر میں حمید الدین فراہی صاحب نے بلا وجہ رمی جمرات کو محل بحث بنایا ہے اور اس میں جمہور کے راستے سے اُلگ ہو کر رمی جمرات کا عجیب پس منظر پیش کیا ہے آپ نے اپنی تفسیر میں سورت فیل کے ذیل میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔

منیٰ میں رمی جمرہ کی حقیقت

رمی جمرات کے بارے میں حمید الدین فراہی صاحب کا موقف یہ ہے کہ موسم حج میں حجاج کرام جو جمرات پر کنکریاں مارتے ہیں یہ عربوں کی اس سنگ باری کی سنت ہے جو انہوں نے ابرہہ کے لشکروں پر پتھر برسائے تھے وہ لکھتے ہیں: ''بہت سے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ منیٰ میں رمی جمرہ واقعہ فیل ہی کی یادگار ہے لیکن ضعیف روایات نے اس حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ روایت ہے کہ مینڈھا حضرت ابراہیم کے ہاتھ سے چھوٹ بھاگا انہوں نے اس کو سات کنکریاں ماریں اور پھر پکڑ لیا اس کے بعد سے یہ رمی کی سنت قائم ہوئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ جس وقت انہوں نے بیٹے کی قربانی کا قصد کیا تو شیطان نے ان کو بہکانا چاہا اس وقت انہوں نے اس کو کنکریاں ماریں تو رمی جمرہ کی سنت اس واقعہ کی یادگار ہے۔

(تفسیر نظام القرآن ص:۵۰۹)

علامہ فراہی مزید لکھتے ہیں لیکن صحیح روایات میں سنت رمی جمرہ کی اصل کا کوئی ذکر نہیں ہے اس وجہ سے ہم نے استنباط کی راہ اختیار کی ہے صحیح وثابت چیزوں سے استنباط اس صریح روایت سے زیادہ بہتر ہے جو ثابت نہ ہو۔

استنباط نمبر ا: کلام جاہلیت میں رمی جمرات کا کوئی ذکر نہیں لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس کے متعلق کوئی صحیح روایت نہیں ہے (تفسیر نظام القرآن: ص: ۵۱۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز ہے جو واقعہ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔

استنباط نمبر ۲: چونکہ ابرہہ کی فوج مُحسّر میں تھی اور وہ مکہ کی طرف بڑھ رہی تھی اس وجہ سے لازماً اس کا مقدمۃ الجیش محصب میں رہا ہوگا جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں اس قدر تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات بہت لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ سنت رمی عربوں کی اس سنگساری کی یادگار ہو جو انہوں نے ابرہہ کے مقدمۃ الجیش یا اس کے ہاتھیوں پر کی تھی اور جس کے پردہ میں خدا نے آسمان سے ان پر سنگباری کی (ص:۵۱۲)

استنباط نمبر ۳: اگر رمی کی اصل وہ ہوتی جو لوگوں نے سمجھی ہے یعنی شیطان کو سنگسار کرنا، تو قربانی رمی سے فارغ ہونے کے بعد تیسرے یا چوتھے دن ہونی چاہیے تھی حالانکہ قربانی رمی کے پہلے ہی دن ہوتی ہے پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شیطان دوسرے اور تیسرے دن کیوں سنگسار کیا جاتا ہے۔ ہاں اگر اس کو واقعہ فیل کی یادگار مانا جائے تو تمام گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں۔

(وہ اسطرح کہ) ابرہہ کی فوج پر پہلے روز جو سنگباری ہوئی ہوگی اس سے ایک حد تک فوج آگے بڑھنے سے رک گئی ہوگی لیکن ابھی کچھ دم خم باقی رہا ہوگا اس وجہ سے دوسرے دن مکہ پر حملہ کرنا چاہا ہوگا لیکن حجاج نے آگے بڑھ کر پھر پتھراؤ کر کے روک دیا ہوگا یہی واقعہ تیسرے روز بھی پیش آیا ہوگا یہاں تک کہ حجاج کی سنگ باری نے اور دست غیب نے پوری فوج کو بالکل پامال کر دیا

(تفسیر نظام القرآن ص:۵۱۳)

استنباط نمبر ۴: جس ستون پر پہلے روز رمی کی جاتی ہے وہ سب سے بڑا ہے اور فوج کے حالات کے لحاظ سے یہی ہونا بھی چاہیے (یعنی فوج بڑی تھی تو ستون بھی بڑا لگا دیا گیا) (پھر) پہلے دن کی شکست اور پامالی نے مقدمۃ الجیش کے حملہ آوروں کی تعداد بہت گھٹا دی ہو گی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ دوسرے ستون کا حجم پہلے کے مقابلہ میں کم ہو کہ واقعہ کی پوری تصویر یادگار کے آئینہ میں محفوظ رہے ان باتوں کو شیطان کے حالات سے کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی جو شیطان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہکانے آیا تھا اس کی یادگار میں یہ ترتیبی تفاوت بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے (تفسیر نظام القرآن ص: ۵۱۳)

استنباط نمبر ۵: رمی کے وقت جس شخص کا تصور یہ ہو گا کہ وہ شیطان کو کنکریاں مار رہا ہے وہ اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ یا کوئی خاص جوش محسوس نہیں کریگا وہ جانتا ہے کہ وہ یہ کنکریاں ایک پتھر پر پھینک رہا ہے ہاں اگر اس رمی کو واقعہ اصحاب فیل کی یادگار سمجھا جائے تو اس صورت میں ہمارے تصورات کا رخ بالکل دوسرا ہو گا (یعنی یہ تصور ہو گا کہ ہم نے ایک طاقتور دشمن کو تباہ و برباد کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کی اب ہم فتح کا اظہار کر رہے ہیں)

تبصرہ:

سب سے پہلے تو فراہی صاحب نے یہ نقصان کیا کہ رمی جمرات کے بارے میں جمہور کے مشہور شاہراہ کو چھوڑ کر الگ تھلگ پگڈنڈیوں میں گھسنا شروع کر دیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ آج کل جو ہم کنکریاں مارتے ہیں یہ ابراہیم علیہ السلام کی یادگار نہیں ہے بلکہ یہ ان عربوں کی یادگار ہے جنہوں نے ابرہہ کے لشکر پر پتھر برسائے تھے اول تو انہوں نے یہ غلطی کی کہ ابرہہ پر ابابیل کی سنگ باری کے بجائے قریش اور اہل مکہ کی سنگ باری قرار دیدی دوسری غلطی یہ کی کہ قرآن کی نص صریح ''تَرْمِيهِمْ'' سے انحراف کیا اور کہا کہ اس میں ضمیر مؤنث طیرا کے بجائے قریش کی طرف راجع ہے حالانکہ پوری سورت فیل میں قریش کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تیسری غلطی یہ کی کہ

کنکریوں کے پس منظر میں جو روایات منقول ہیں اس کو ضعیف کہہ کر مسترد کر دیا اور پھر کہہ دیا کہ اب میں استنباط کر کے ثابت کروں گا کہ سنگ باری کس کی طرف سے ہوئی تھی پھر کبھی کہتا ہے کہ عربوں کی طرف سے ہوئی تھی کبھی کہتا ہے کہ آسمان سے ہوا کے ذریعہ سے ہوئی کبھی کہتا ہے کہ اس وقت کے حاجیوں نے یہ سنگ باری کی تھی چنانچہ فراہی صاحب نے اس موقع پر آٹھ استنباطات لکھ دیئے ہیں جن میں سے میں نے صرف پانچ کا ذکر کیا ہے پھر فراہی صاحب کا ان قیاسات کو استنباط کہنا بھی محل نظر ہے یہاں ان کی طرف سے مفروضوں پر مبنی قیاسات ہیں کسی چیز سے استنباط کی کوئی صورت نہیں ہے صرف اپنے دماغی خیالات کو ذکر کیا ہے کہ ایسا ہوا ہوگا ویسا ہوا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ جب روایات کی ایک بنیاد موجود ہے چاہے کمزور ہی ہو لیکن امت نے سلفاً وخلفاً اس کو قبول کیا ہے تو فراہی صاحب کو حق نہیں پہنچتا کہ اس کو غلط کہہ دیں اور اپنے مفروضوں کو مسلط کریں آخر فراہی صاحب کے پاس بھی کوئی دلیل تو ہونی چاہیے تھی۔ اب میں ان روایات کا ترجمہ نقل کرنا چاہتا ہوں جو رمی جمرات کے بارے میں منقول ہیں:

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جب اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لیے منیٰ میں قربان گاہ کی طرف لے جا رہے تھے تو ابلیس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں ایک بار وسوسہ ڈالا (کہ خواب کی بنیاد پر بیٹے کو کیسے ذبح کرتے ہو؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں ماریں اس کے بعد ابلیس غائب ہوگیا پھر دوسرے اور تیسرے مقام پر نمودار ہوگیا وہاں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں ماردیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے اس عمل کو حاجیوں کے لیے بطور یادگار رکھا اب حاجیوں کی طرف سے شیطان سے نفرت اور رحمان سے عقیدت کی بنیاد پر یہ پتھر مارے جاتے ہیں۔

(مرقات ملا علی قاری بحوالہ تحفۃ المنعم شرح مسلم ج ۴ ص: ۴۲۶)

مجمع الزوائد ج ۸ ص: ۲۲۰ باب رمی الجمار میں ابوالطفیل سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں

ابن عباس سے پوچھا کہ آپ کی قوم کا دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا ومروہ کے درمیان سعی فرمائی تھی اور یہ سنت ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ میری قوم نے سچ کہا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حج کے احکام بجالانے کا حکم ہوا تو صفا مروہ کے درمیان سعی کے دوران شیطان نمودار ہوا اور سعی میں ابراہیم علیہ السلام سے آگے نکلنے کی کوشش کی مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے آگے نکل گئے پھر حضرت جبریل علیہ السلام حضرت ابراہیم کو جمرہ عقبہ کے پاس لے گئے ابراہیم علیہ السلام کے سامنے شیطان نمودار ہوا حضرت ابراہیم نے اس کو سات کنکریاں ماردیں تو شیطان غائب ہوگیا پھر شیطان جمرۂ وسطیٰ کے پاس حضرت ابراہیم کے سامنے آیا حضرت ابراہیم نے وہاں بھی شیطان پر سات کنکریاں ماردیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو منہ کے بل پچھاڑ دیا۔ پھر حضرت جبریل امین حضرت ابراہیم کو جمرہ قصوا یعنی دور والی تیسری جمرہ کے پاس لے گئے وہاں پھر شیطان نمودار ہوگیا حضرت ابراہیم نے وہاں بھی شیطان کو سات کنکریاں ماردیں: رواہ احمد والطبر انی ورجالہ ثقات یعنی مسند احمد اور طبرانی نے اس روایت کو ثقہ راویوں سے نقل کیا ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۲۱)

مسند احمد کی ایک اور روایت عربی الفاظ کے ساتھ پیش خدمت ہے ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے۔

وعن ابن عباس رضی الله عنه : ان رسول اللهِ صلی اللّٰهُ عَليه وسلَّم قال: ان جبْرِيلَ ذَهَبَ بِاِبْرَاهِيمَ عَلَيهِ السَّلَامُ اِلٰى جَمْرَةِ الْعَقَبَةِ فَعَرَضَ لَهُ الشَّيْطَانُ فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حَصياتٍ . فَسَاخ ثُمَّ اَتَى الْجَمْرَةَ الْوُسْطٰى فَعَرَضَ لَهُ الشَّيْطَانُ فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حصياتٍ فَسَاخَ ثُمَّ اَتَى الْجَمْرَةَ الْقُصوىٰ فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حصياتٍ فَسَاخَ (رواه احمد وفيه عطاء بن السائب وقد اختلط))

(مجمع الزوائد: ج ۸: ص: ۲۲۲)

زمین میں دھنسنے اور گڑنے کو ساخ کہتے ہیں مجمع الزوائد نے ان روایتوں کو کئی اسناد کے ساتھ حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے ان تصریحات کے بعد جناب فراہی صاحب کے قیاسات اور

خودساختہ استنباطات کی طرف جانا بالکل مناسب نہیں ہے۔لیکن ان لوگوں کو چونکہ احادیث کے ساتھ خدواسطے بیر ہے تو اس کا علاج تو کسی کے پاس نہیں ہے۔ اب فراہی صاحب کے استنباطات پر میں ذرا تنبیہ کرنا چاہتا ہوں:

استنباط نمبر ا میں فراہی صاحب نے ان روایات کا انکار کیا ہے جو اوپر میں نے نقل کردی ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں ہیں اگر یہ روایات کمزور بھی ہوں تو پھر بھی فراہی صاحب کے مفروضوں پر مبنی استنباطات سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔

استنباط نمبر ۲ میں فراہی صاحب رمی کی سنت کو عربوں کی سنت کی یادگار بتا کر اس کو ترجیح دیکر خوش ہو جاتے ہیں میں کہتا ہوں کہ علماء امت اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور یادگار قرار دیتے ہیں جب یہ موجود ہو تو فراہی صاحب کے اجتہاد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

استنباط نمبر ۳ میں فراہی صاحب نے قربانی اور شیطان پر کنکر مارنے کی ترتیب پر اشکال کر کے اپنے موقف پر استدلال پیش کیا ہے میں کہتا ہوں کہ امور حج کا واضح نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اپنے مناسک حج مجھے دیکھ کر سیکھو تو اس کے بعد فراہی کی منطق کو نہ ہم مانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔

استنباط نمبر ۴ میں فراہی صاحب نے ستونوں کے بڑے اور چھوٹے ہونے کو ابرھہ کے لشکر کے ساتھ جوڑا ہے اس میں فراہی صاحب نے غلطی کی ہے ابرھہ کا لشکر مزدلفہ کی طرف سے مکہ جارہا تھا نیز وہ وادی محسر سے آگے بڑھ بھی نہیں سکا تھا تو فراہی صاحب کی بات بالکل غلط ہے کہ پہلے دن لشکر زیادہ تھا اس لیے اس کی یادگار میں جمرہ عقبہ کا ستون بڑا بنایا گیا اس کو اگر قیاس بنانا ہی تھا تو یوں کہتا کہ پہلے دن شیطان موٹا تھا اس لیے جمرہ عقبہ کا ستون موٹا ہے فراہی صاحب نے احادیث کو چھوڑا مفسرین کو چھوڑا تو بچوں کی طرح باتیں بنانے لگے ہیں۔

سورت کوثر کی تفسیر میں فراہی صاحب کی شاذ رائے

جناب فراہی صاحب کو عام مفسرین سے الگ راستے کو اختیار کرنے کا شوق ہے سورت الکوثر میں مفسرین کوثر کے تین معنی لیتے ہیں (١) کوثر جنت میں ایک نہر کا نام ہے یعنی حوض کوثر مراد ہے (٢) کوثر سے مراد قرآن عظیم ہے (٣) کوثر سے مراد خیر کثیر ہے جو دین اسلام کی تمام بھلائیوں کو شامل ہے کوئی متعین بھلائی مراد نہیں ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ ان احتمالات میں بہترین احتمال وہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے الکوثر سے مراد حوض کوثر ہے علامہ جار اللہ زمخشری نے بھی صحیح مسلم کی حدیث کے حوالہ سے لکھا ہے کہ الکوثر سے مراد وہ نہر ہے جو جنت میں ہے جو حوض کوثر ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

وَعَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَرَأَهَا حِيْنَ اُنْزِلَتْ عَلَيْهِ فَقَالَ: اَتَدْرُوْنَ مَا الْكَوْثَرُ؟ اِنَّهُ نَهْرٌ فِي الْجَنَّةِ وَعَدَنِيْهِ رَبِّيْ فِيْهِ خَيْرٌ كَثِيْرٌ (مسلم)

(کشاف ج٤: ٨٠٧)

فراہی صاحب کے نزدیک الکوثر سے خانہ کعبہ مراد ہے

علامہ فراہی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کوثر کی تاویل میں تین قول نقل کیے ہیں:

(١) کوثر جنت میں ایک نہر ہے حضرت عائشۃ ابن عباس حضرت انس ابن عمر رضی اللہ عنہم اور مجاہدؒ اور ابو العالیہ سے یہی مروی ہے۔

(٢) کوثر سے مراد خیر کثیر ہے ابن عباس عکرمہ قتادہ اور مجاہد سے یہی مروی ہے۔

(٣) کوثر جنت میں ایک حوض ہے عطاء رحمہ اللہ سے یہی مروی ہے۔

میرے نزدیک ان میں سے پہلے اور تیسرے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس کو موقف کا حوض اور جنت کی نہر بھی کہا گیا ہے ہوسکتا ہے یہ حوض اسی نہر جاری کا ہو (تفسیر نظام القرآن ص: ٥٢٤)

علامہ فراہی الکوثر کو جنت کا حوض قرار دینے کو کمزور کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کوثر آخرت سے

پہلے کوئی چیز ہے الکوثر کو لام تعریف کے ساتھ استعمال کرنا درآنحالیکہ وہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جس سے لوگ واقف نہیں ہیں قرآن کے عربی مبین کے منافی ہے اس وجہ سے بطریق نص وہ کسی خاص چیز کا نام نہیں ہوسکتا ہے البتہ بطریق تاویل اس سے کوئی ایسی چیز مراد لے سکتے ہیں جس میں خیر کثیر ہو قرآن مجید کا یہ تمام اسلوب ہے کہ وہ آخرت کی بخششوں کو یا بصیغہ مستقبل ذکر کرتا ہے یا ان کو ایسے قرائن کے ساتھ بیان کرتا ہے جن سے مستقبل سمجھا جا سکے جیسے ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ اس وجہ سے اگر اس سے کوئی ایسی چیز مراد ہوتی جو صرف آخرت سے تعلق رکھنے والی ہوتی تو قرآن اس کو مستقبل ہی کے صیغے سے بیان کرتا (ص: ۵۲۵)

کچھ آگے فراہی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اس تفصیل سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ لفظ کوثر کی تحقیق میں بہت سے مذہب نہیں ہیں جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے صرف دو مذہب ہیں ایک یہ کہ کوثر سے کوئی خاص چیز مراد لی جائے یعنی حوض محشر یا نہر جنت یا قرآن یا اسی قسم کی کوئی اور چیز، دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ عام ہے ہر چیز جس میں خیر کثیر ہو وہ اس کے دائرہ میں داخل ہے

(تفسیر نظام القرآن ص: ۵۲۷)

علامہ فراہی کے نزدیک خانہ کعبہ ہی قیامت کا حوض کوثر ہے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے انہوں نے لمبا چوڑا کلام کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں اب اگر قرآن وحدیث کے درمیان کامل تطبیق کے لیے کہا جائے کہ جو کوثر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں عطا فرمایا ہے وہی اپنی حقیقی شکل میں موقف (محشر) کا حوض اور جنت کی نہر ہے تو یہ تطبیق زیادہ بہتر ہوگی پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثر کے بارے میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کی عمومیت اور صیغہ ماضی کی رعایت سے ان چیزوں کو بھی اس کے دائرہ میں داخل کر دیا ہے جو داخل ہوسکتی تھیں تاکہ لفظ عام وسیع اور اپنی دلالت میں اسم بامسمی (کوثر) ہو یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس میں مزید جستجو اور کاوش جائز سمجھی ہے۔ اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت وضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے، اس وجہ سے اگر میں ایسی تاویل کا سراغ

لگاؤں جو دونوں کوثروں کو ایک کردے تو جس طرح میں سلف کو اس کی تاویل میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں پاتا اسی طرح اپنے آپ کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا (ص:۵۲۸)

خانہ کعبہ کو قیامت کا حوض کوثر قرار دینے کے لیے علامہ فراہی مزید لکھتے ہیں اس وجہ سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریحاً کہیں یہ نہیں فرمایا کہ خانہ کعبہ قیامت کے دن حوضِ کوثر کی شکل میں نمودار ہوگا کیونکہ آپ نے اس کی طرف اشارے فرمائے ہیں اس تمہید کے بعد اب ہم ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جو ہمارے دعویٰ پر حجت ہیں (ص:۵۲۹)

اس کے بعد جناب فراہی صاحب نے کعبہ اور حوض کوثر کے درمیان دس وجوہات اور مشابہات کا ذکر کیا ہے جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا کا یہ خانہ کعبہ آخرت کا حوض کوثر ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ آئے گا کہ احادیث میں حوض کوثر کی جو تفصیلات وارد ہیں اور حوض کوثر کا جو موقع ومقام ہے وہ سب بے معنی چیزیں ہیں وہ دنیا کے خانہ کعبہ کی ایک تصوراتی اور خیالی شکل ہے اسی طرح کا م غلام احمد پرویز کرتا رہتا ہے فراہی صاحب نے خانہ کعبہ اور حوض کوثر کے درمیان دس مشابہات اور مناسبات کو بیان کردیا اور پھر آخر میں لکھا کہ اب تھوڑی دیر توقف کر کے حوض کوثر کی شکل اور ہیئت پر بھی غور کرلینا چاہیے ہمارا خیال ہے کہ اس سے بھی ہمارے مذکورہ نظریہ کی تائید ہو رہی ہے کہ کوثر آخرت درحقیقت خانہ کعبہ اور اس کے ماحول ہی کی روحانی تصویر ہے فراہی صاحب نے اس کے بعد اپنی تفسیر میں یہ بڑا عنوان باندھا ہے۔

نہر کوثر خانہ کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانیت کی تصویر ہے

لکھتے ہیں معراج میں جو نہر کوثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کرائی گئی تھی اس کی صفات پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی مثال ہے (تفسیر نظام القرآن:۵۲۳)

تبصرہ

میں کیا تبصرہ کروں اگر لکھوں تو احباب برا مانیں گے اگر نہ لکھوں تو حق اور علم کے چھپانے کا مجرم ٹھہروں گا ہم تو جاوید غامدی اور امین احسن اصلاحی کے جادۂ حق سے ہٹنے اور سلف صالحین کے شاہراہ اعظم سے پھرنے اور ترک کرنے کا رونا رو رہے تھے فراہی صاحب کے پوشیدہ گوشوں کو جھانک کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نلوں میں آنے والا گدلا پانی نلوں ہی کا نہیں ہے بلکہ پیچھے سے حوض گدلا ہی گدلا بھرا پڑا ہے فراہی صاحب کی تفسیر نظام القرآن میں سورت کوثر کی تفسیر پینسٹھ لمبے صفحات پر مشتمل ہے اس میں فراہی صاحب نے تفسیری مقاصد سے ہٹ کر غیر متعلق مضامین سے صفحات کے صفحات بھر دیئے ہیں آپ حیران ہو جائیں گے اس اللہ کے بندے نے بلا ضرورت سورت کوثر کی تفسیر میں قرآن کی مختلف مقامات سے ایک سو تین آیات کو جمع کر رکھا ہے اور تورات وانجیل کے کئی حوالہ جات لکھے ہیں سورت کوثر جو تین آیات پر مشتمل مختصر ترین سورت ہے بلا ضرورت اور بلا مناسبت اتنے طویل مضامین کا مقصد شاید یہ ہو کہ فراہی صاحب ان طویل مضامین کے ضمن میں اپنے دل کے رجحانات اور شاذ نظریات کو لپیٹ لپیٹ کر پیش کرنا چاہتے ہیں بہر حال پینسٹھ طویل صفحات کے آخری صفحہ میں دل کے بھڑاس نکالنے کے لیے پھر لکھتے ہیں یہ تمام باتیں اشارہ کر رہی ہیں کہ اس سورت میں ''الکوثر'' سے مراد خانہ کعبہ ہی ہے (ص:۵۸۶) فراہی صاحب نے خیر کثیر کی عمومیت کو وسعت دیکر خانہ کعبہ کو جو شامل کیا ہے اس میں انہوں نے اگرچہ عام مفسرین سے الگ راستہ اختیار کیا ہے لیکن مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے اصل اعتراض اس پر ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کو حوض کوثر کی جگہ پر رکھا ہے اور اصل حوض کوثر جس سے متعلق دسیوں احادیث وارد ہیں اور دسیوں تفصیلات ہیں ان سب کا ایک قسم انکار لازم آتا ہے اور یہی طریقہ غلام احمد پرویز اور عنایت اللہ مشرقی نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ جنت کا نظام اور اس کی نعمتیں آنکھوں سے اوجھل پردۂ غیب میں ہیں وہ حسی اشیاء نہیں ہیں کہ دنیا میں ہم اس کا ادراک

کر سکیں وہ صرف خیالی اور تصوراتی چیزیں ہیں اس دعویٰ کے بعد انہوں نے خاص انداز سے ان چیزوں کا انکار کیا ہے فراہی صاحب شاید انکار نہیں کرتے ہونگے لیکن حوض کوثر سے متعلق سینکڑوں احادیث جان چھڑانے کے لیے ان کا خیالی گھوڑا اسی میدان میں سرپٹ دوڑ رہا ہے۔

سورت لہب کی تفسیر میں فراہی صاحب کی شاذ رائے

علامہ فراہی صاحب نے سورت لہب کی تفسیر میں بھی عام مفسرین سے الگ تھلگ راستہ اختیار کیا ہے اور عجیب وغریب غیر متعلقہ مباحث کو چھیڑ کر سورت لہب کی تفسیر میں چھتیس لمبے لمبے صفحات کو سیاہ کر ڈالا ہے اور پچپن آیات کو نقل کیا ہے اس مختصر سورت میں اس طرح طول اختیار کرنا سمجھ سے بالاتر ہے پھر جو کچھ لکھا ہے ایک مناظرانہ انداز ہے جو سورت کی تفسیر نہیں ہوسکتی ہے پھر چند مقامات میں عام مفسرین سے الگ مخالف راستہ اختیار کیا ہے بطور نمونہ چند عبارات ملاحظہ فرمائیں۔

فراہی صاحب لکھتے ہیں

تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ میں نہ بددعا ہے نہ مذمت ہے

پس ﴿تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ﴾ نہ تو بددعا ہے اور نہ اس میں کوئی پہلو ہجو اور مذمت کا ہے بلکہ ابولہب کا ذکر کنیت کے ساتھ کیا گیا ہے جس سے عزت واحترام کا پہلو نکلتا ہے۔

(تفسیر نظام القرآن ص: ۶۱۷) آگے چھٹی فصل میں فراہی صاحب ایک بڑی سرخی لگا کر فرماتے ہیں: یہ سورت بددعا اور مذمت نہیں بلکہ پیشین گوئی اور خوش خبری ہے (تفسیر نظام القرآن: ۶۲۵) علامہ فراہی مزید لکھتے ہیں پھر اگر منشاء الٰہی یہی تھا کہ ابولہب کی مذمت کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ اور ملال، دور کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کا مثلہ کرنے سے کیوں روکا گیا؟ حالانکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں رضاعی بھائی اور محبوب چچا حضرت

حمزہ کے جسم اقدس کا مثلہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی صدمہ پہنچایا تھا

(تفسیر نظام القرآن ص: ۶۲۷)

علامہ فراہی مزید لکھتے ہیں کہ ماقبل سورت میں فتح مکہ اور استغفار و تسبیح کا ذکر ہے اور مابعد سورت میں توحید کامل کا اعلان کیا گیا ہے ان دو عظیم الشان مسئلوں کے بیچ میں ہجو اور مذمت کا کیا موقع تھا؟ (ص: ۶۲۸)

علامہ فراہی مزید لکھتے ہیں اب غور کرو لسان غیب نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی ابولہب مقابلہ کرنے سے عاجز رہا اس کے اکثر اعوان (بدر میں) قتل ہوئے اگر اشارات فہم حقیقت کے لیے کافی ہیں تو ﴿تَبَّتْ يَدَا﴾ میں یدین سے اعوان وانصار کو مراد لینا نہایت واضح بات ہے کیونکہ عرب اعوان وانصار کو ید کہتے تھے (ص: ۶۳۰ و ۶۳۱)

تبصرہ:

علامہ حمید الدین فراہی صاحب نے یہاں لمبی چوڑی باتیں کی ہیں کئی استدلالات کی کوشش کی ہے وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سورت لہب میں قرآن نے ابولہب کی مذمت بیان نہیں کی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ کسی کی مذمت نہیں کرتا ہے۔ اور نہ نبی آخر زمان نے کوئی مذمت بیان کی ہے پھر فراہی صاحب نے اللہ تعالیٰ کے درگزر کی آیات اور قصوں کو ذکر کیا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم اخلاق کے حوالے دیے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ اس سورت میں ابولہب کی مذمت بیان نہیں ہوئی ہے وہ ابولہب کے دونوں ہاتھوں کی ہلاکت سے بدر میں ہلاک شدہ قریش کے سردار ابوجہل وغیرہ مراد لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابولہب کے اعوان وانصار بدر میں مارے گئے میں حیران ہوں کہ فراہی صاحب اس سے کیا نکالنا چاہتے ہیں وہ ابولہب کے اتنے خیر خواہ کیوں بنتے ہیں۔

وہ اس سورت کی آیات کو بددعا کے معنی میں لینے کو غلط سمجھتے ہیں اسی طرح اس میں کسی مذمت کے

پہلو کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے بلکہ وہ ابولہب کو کنیت سے ذکر کرنے کو ابولہب کے لیے باعث عزت سمجھتے ہیں جبکہ عام مفسرین ان آیات کو ابولہب کے لیے مذمت قرار دیتے ہیں اب آیئے اور دیکھئے کہ مفسرین یہاں کیا لکھتے ہیں:

چنانچہ قاضی ثناء اللہ اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں ان کی عربی تفسیر کا ترجمہ میں اردو میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ: بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ جب ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کیا اور ان کو عذاب آخرت سے ڈرایا بخاری وغیرہ میں مزید یہ تفصیل ہے کہ آنحضرت صفا پہاڑی پر چڑھ گئے اور قریش کو آواز دی تو قریش اکٹھے ہو گئے آنحضرت نے قریش سے کہا کہ مجھے بتا دو اگر میں تمہیں کہہ دوں اور خبر دوں کہ دشمن صبح یا شام کے وقت تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو تم میری بات مانو گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں! ہم تصدیق کریں گے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فَإِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ۔ عذاب سے پہلے میں تمہارے لیے واضح ڈرانے والا نبی بن کر آیا ہوں اس پر ابولہب نے کہا تجھے ہلاکت ہو تم نے اس لیے ہمیں جمع کیا تھا؟ ابولہب نے ہاتھ میں پتھر اٹھایا تا کہ آنحضرت کو اس سے مارے اس پر یہ آیت اتری ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِيْ لَهَبٍ﴾ تباب اس خسران ونقصان کو کہتے ہیں جو مفضی الی الہلاک ہو ای هَلَكَتْ یعنی اس کے ہاتھ ہلاک ہو جائے اَيْ نَفْسه یعنی وہ خود ہلاک ہو جائے۔

علماء نے کہا ہے کہ ہلاکت کی بد دعاء میں ابولہب کے ہاتھوں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس نے انہیں ہاتھوں سے پتھر اٹھایا تھا تا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مار دے ابولہب کا نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا۔ مفسرین میں سے شیخ مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو خوبصورتی اور چمک دمک کی وجہ سے ابولہب کہتے تھے یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کو کنیت کے ساتھ دو وجھوں سے یاد کیا ہے ایک وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نام لینے کو قبیح اور مکروہ سمجھا دوسری وجہ یہ کہ چونکہ یہ دوزخ میں جانے والا تھا تو دوزخ کے شعلوں کی مناسبت سے ابولہب کہہ دیا یعنی دوزخ کی آگ کے

شعلوں والا، تیسری وجہ یہ کہ آیندہ لفظ ذات لہب آرہا ہے اس کی مجانست کی وجہ سے اس کو ابولہب کنیت کے ساتھ یاد کیا۔

﴿وَتَبَّ﴾ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ ''اِخْبَارٌ بَعْدَ اِخْبَارٍ لِلتَّاكِيْدِ اَوِ الْاُوْلٰى دُعَائِيَّةٌ وَالثَّانِيَةُ اِخْبَارِيَّةٌ۔ یعنی یہ جملہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے تاکید کے لیے ہے یا پہلا جملہ یعنی ﴿تَبَّتْ يَدَا اَبِىْ لَهَبٍ﴾ بددعاء کے لیے تھا اور جملہ ثانیہ خبر دینے کے لیے ہے کہ جو بددعا کی گئی تھی وہ واقع ہوگئی اور سچی ثابت ہوگئی (تفسیر مظہری ج ۱۰ ص: ۳۶۷)

مفسر کبیر ابوالفداء ابن کثیر رحمہ اللہ ﴿تَبَّتْ يَدَا اَبِىْ لَهَبٍ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اَلْاَوَّلُ دُعَا عَلَيْهِ وَالثَّانِىْ خَبَر عَنْهُ'' (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص: ۵۶۴)

یعنی پہلے جملے میں ابولہب کے لیے بددعا ہے کہ ابولہب ہلاک ہوجائے اور دوسرے جملے میں خبر دی گئی کہ یہ بددعاء لگ گئی تفسیر کشاف میں علامہ زمخشری لکھتے ہیں ''وَتَبَّ'' اَىْ وَكَانَ ذٰلِكَ وَحَصَلَ ''یعنی ایسا ہوگیا اور مقصود حاصل ہوگیا (کشاف ج ۴ ص: ۸۱۴)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف مفسرین سورت لہب کی تفسیر میں تابعین اور صحابہ کرام مثلاً حضرت ابن عباس وغیرہ سے روایات نقل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس سورت میں ابولہب کی مذمت ہے اور ان پر بددعاء ہے اور دوسری طرف علامہ فراہی عنوانات لگا لگا کر لکھتے ہیں کہ اس میں نہ بددعاء ہے اور نہ مذمت ہے علامہ فراہی نے شاید ذہن میں یہ رکھا ہے کہ واقعاتی طور پر ابولہب کے نہ ہاتھ ٹوٹ گئے تھے اور نہ آگ میں داخل ہوا تھا لہذا یہ ایک پیشین گوئی ہے کہ آخرت میں ان کے ساتھ ایسا ہوگا یا یہ کہ بدر کی جنگ میں ان کے اعوان قریش کے سردار مارے گئے یہی اس کا ہاتھ ٹوٹنا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ بددعاء اور مذمت کے لیے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ فوری طور پر خارج میں اس کی تصویر سامنے آجائے ایک لمحہ کے لیے فرض کر کے مانا کہ دنیا میں اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا لیکن کیا یہ بددعاء قیامت میں دوزخ کی صورت میں بھی ظاہر نہیں ہوگی اور یہ مذمت اس کے

مرنے کے بعد بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوگی آخر بد دعاء اور مذمت سے ابولہب کی برأت کا فراہی صاحب کو کیوں اتنی دلچسپی ہے کہ قرآن کے ظاہر کو بھی چھوڑا نظم قرآن کو بھی توڑا مفسرین کی تفاسیر سے بھی منہ موڑا اور سرپٹ ایسے راستے پہ دوڑا جس پر دوڑنا مناسب نہیں تھا۔

سورت لہب کے زمانہ نزول میں فراہی صاحب کی غلطی

حدیث کی ساری روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ابولہب کی گستاخی اور آنحضرت کو بد دعاء دینا اور آپ کی طرف پتھر مارنے کا ارادہ کرنا یہ سب کچھ اعلان نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں ہوا تھا مفسرین کی تصریحات بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں لیکن فراہی صاحب اس پر سخت رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ آیندہ کسی ہونے والے واقعہ کی پیشین گوئی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ (سورت) اوائل بعثت میں نہیں اتری ہے جو لوگ اس دلیل کی بناء پر کہ یہ ابولہب کی سخت کلامی کا جواب ہے، اس کا زمانہ نزول ابتدائے بعثت بتاتے ہیں ہمارے نزدیک ان کا خیال بالکل غلط ہے یہ سورت ابولہب کے جواب میں نہیں بلکہ ایک ہونے والے واقعہ کی پیشین گوئی اور خبر ہے''۔ (تفسیر نظام القرآن ص:۶۴۷)

تبصرہ

ناظرین دیکھ لیں کہ فراہی اب کیا لکھ رہے ہیں اور اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر میں کچھ لکھوں تو ان کا حلقہ ناراض ہو جائے گا اور اگر نہ لکھوں تو خون کھولتا ہے کہ فراہی صاحب سارے مفسرین کے خلاف کہاں جا رہے ہیں۔

ام جمیل اور علامہ فراہی ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾

علامہ فراہی نے بڑی کوشش کی ہے کہ وہ اس جملہ کو اپنی حقیقت سے ہٹا کر مجاز پر لے جائے وہ کہتے ہیں کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل ایک شریف خاندان کی عورت تھی لہذا وہ دنیا میں لکڑی لانے

اور چننے والی عورت نہیں ہوسکتی ہے اس کی جو یہ حالت آیت میں بتائی گئی ہے یہ مرنے کے بعد قیامت میں بلکہ جہنم میں پیش آئے گی دنیا میں ایسا نہیں ہوا۔ فراہی صاحب کی یہ بات صحیح ہے بعض مفسرین نے اس کو آخرت کی حالت پر حمل کیا ہے لیکن فراہی صاحب کی یہ بات غلط ہے کہ اس کلام میں نہ ہجو ہے نہ مذمت ہے۔ چنانچہ علامہ فراہی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''چوتھی آیت کا مطلب یہ ہے کہ ابولہب کی بیوی بھڑکتی آگ میں پڑیگی اور اس وقت اس کی حالت ایندھن ڈھونڈنے والی لونڈی کی سی ہوگی اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دنیا میں ایندھن ڈھونڈتی تھی یہ تاویل صرف بعید نہیں بلکہ بالکل غلط ہے (ص:۶۳۴)

علامہ مزید لکھتے ہیں لفظ حَمَّالَةَ منصوب ہے نصب والی قرأت کی صورت میں ''وَامْرَأَتُهُ'' میں جو واؤ ہے وہ عطف کے لیے ہے یعنی اس کی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ بھڑکتی آگ میں پڑے گی یہ مطلب بالکل واضح ہے یہاں دونوں کا آگ میں داخل ہونا بیان کیا گیا ہے (ص:۶۳۴)

فراہی صاحب چاہتے ہیں کہ یہ لفظ منصوب ہے لیکن حالیت کی بناء پر ہے اس کا فعل محذوف نہیں کہ وہ اس کو نصب دے رہا ہو اور عبارت اس طرح ہو ''اَذُمُّ وَاَشْتُمُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ'' یعنی میں اس لکڑی ڈھونڈنے والی عورت کی مذمت کرتا ہوں اور اس کو گالی دیتا ہوں اسی قرأت اور اسی طرز کلام پر فراہی صاحب مفسرین پر غصہ ہو رہے ہیں چنانچہ وہ لکھ رہے ہیں کہ صاحب کشاف نے نصب کی قرأت کو ترجیح دی ہے لیکن انہیں سیبویہ کے کلام سے غلط فہمی ہوگئی ہے ان کی طبیعت بہت نادر پسند ہے ہمارے نزدیک ان کا ذوق بھی قابل اعتماد نہیں ہے اس تاویل کو انہوں نے محض اس وجہ سے اختیار کرلیا ہے کہ اس میں مذمت اور ہجو کا پہلو نمایاں ہوتا ہے چنانچہ صاحب کشاف کی عبارت کا ترجمہ فراہی صاحب نے اس طرح کیا ہے:

صاحب کشاف کہتا ہے کہ میں اس قرأت (نصب) کو ترجیح دیتا ہوں اور جس نے ابولہب کی بیوی ام جمیل کو گالی دینا پسند کیا اس نے رسول اللہ تک نیک وسیلہ پیدا کیا علامہ فراہی لکھتے ہیں کہ اس سادگی کو دیکھو ایک فضول اور مہمل قول کو محض ایک لفظی صنعت اور خلع جگت کی خاطر اختیار

کر لیتے ہیں ہمارے نزدیک یہ قول ذرا بھی لائق توجہ نہیں ہے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہاں مذمت اور ہجو کا کوئی موقع نہیں ہے (تفسیر نظام القرآن ص: ۶۳۵) فراہی صاحب حمالۃ الحطب میں نصب کو حالیت کی بنیاد پر مانتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ام جمیل اور ابولہب کا آگ میں جانا ایک ساتھ ہے اور ام جمیل کا لکڑی چننا جہنم کی بات ہے دنیا کی نہیں ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں یعنی ابولہب بھڑکتی آگ میں پڑیگا اور حال یہ ہوگا کہ اس کی بیوی ایندھن ڈھونڈنے والی ہوگی اور اس کے گلے میں بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی (ص: ۶۳۵)

علامہ فراہی ﴿حَـمَّالَةُ الْحَطَبِ﴾ میں رفع کی صورت میں آیت کا مطلب وہی بتا رہے ہیں جو اوپر کی عبارت میں پیش کی گئی ہے علامہ مزید لکھتے ہیں پس جو لوگ ﴿حَـمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ کو رفع کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ بھی درحقیقت اسی مفہوم کی تفسیر کرتے ہیں جو نصب والی قرأت میں ہے کہ کسی کو ام جمیل کی ہجوہ اور مذمت کا گمان نہ ہو (ص: ۶۳۵) آگے لکھتے ہیں یہ حالت اس کی دنیا میں نہیں تھی غرض دونوں قرأتوں کا ماحصل یہی ہے کہ یہ اس کی آخرت کی حالت کا بیان ہے (ص: ۶۳۵)

تبصرہ:

ہمیں فراہی صاحب کی تحقیق پر اعتراض نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ام جمیل کا اتنا دفاع کیوں کرتے ہیں جس کی مذمت میں آدھی سورت اتری ہے اور کیا جب جہنم میں اس کی یہ حالت ہوگی تو وہ ہجو اور مذمت نہیں؟ کیا دوزخ میں جب وہ جلے گی سڑ یگی لکڑیاں چن چن کر ابولہب پر لا کر ڈالے گی یہ اس کی مذمت نہیں ہے پھر اکثر مفسرین کے راستے کو غلط قرار دیکر اس طرز پر اتنا زور کیوں دیا جا رہا ہے۔ علامہ فراہی ام جمیل کی برأت میں لکھتے ہیں تیسری وجہ یہ ہے کہ قریش کا رتبہ اس سے بہت بڑا تھا کہ ان کی عورتیں لکڑیاں چنں اور ایندھن ڈھونڈئیں کیا ان کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان کی بیگمات ایندھن ڈھونے کا کام کرے گی جو صرف لونڈیوں کے کرنے کا

کام سمجھا جاتا ہے (تفسیر نظام القرآن ص:۶۳۶)

ام جمیل کی مدح میں فراہی صاحب مزید لکھتے ہیں یہ ام جمیل بنت حرب خاندان بنی عبد شمس کی ایک باعزت خاتون ہے جو ہاشمی خاندان میں بیاہی گئی ہے یہ ایندھن ڈھونے والی لونڈی نہیں ہوسکتی ہے (ص:۶۳۷)

تبصرہ:

میں فراہی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ جہنم میں ام جمیل کو ایندھن ڈھونے والی عورت تو آپ بھی تسلیم کرتے ہو تو کیا وہ اس کی ذلت کے لیے کافی نہیں ہے پھر آپ اس کو باعزت خاتون اور بنو عبد شمس کا چشم و چراغ کہہ کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہو اور ام جمیل کو کیا ایوارڈ دینا چاہتے ہو؟ اس پر بھی بس نہیں بلکہ ام جمیل کی برأت کے لیے فراہی صاحب مزید لکھتے ہیں: اس طرح بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ام جمیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی اس وجہ سے اس کو ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ کہا گیا۔

ابن جریر کا یہی مذہب ہے لیکن یہ تاویل بھی بہت بعید از قیاس ہے راستہ میں کانٹے بچھانے والے کو حامل الحطب کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے نیز راستہ کے کانٹوں سے ہر شخص کو اذیت پہنچے گی یہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ ہی کے لیے تو خاص نہیں ہوسکتے (ص:۶۳۸)

تبصرہ:

میں کہتا ہوں کہ ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے ام جمیل کی چغلخوری کی طرف اشارہ ہو یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آنحضرت کے خلاف دشمنی بھڑکایا کرتی تھی یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لکڑیاں چننا آخرت میں دوزخ میں ہو لیکن اس میں یہ احتمال بھی تو ہے کہ ام جمیل دنیا میں واقعتاً کانٹے دار لکڑیاں جمع کر کر آنحضرت کے راستے میں ڈالتی تھی جب اس کا احتمال بلکہ قوی احتمال ہے تو فراہی صاحب عام مفسرین اور خاص کر ابن جریر پر غصہ کیوں اتار رہے ہیں؟ کیا ام

جمیل اتنی بابرکت تھی کہ اس کے خلاف ایک احتمال کو بھی بیان کرنا جرم ہوا؟ معلوم نہیں کہ فراہی صاحب کو کیا ہو گیا کہ کسی ایسے مفسر کی تفسیر کو بھی برداشت نہیں کرتے ہیں جس میں ام جمیل کی بارگاہ عظمت پر کوئی حرف آتا ہو۔

تفسیر عثمانی میں علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے ام جمیل اور ابولہب کے بارے میں مفسرین کے سارے اقوال کی طرف اشارہ کیا ہے ام جمیل سے متعلق مختصر سا کلام پیش کرنا چاہتا ہوں فرماتے ہیں ابولہب کی عورت ام جمیل باوجود مالدار ہونے کے سخت بخل اور خسّت کی بناء پر خود جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتی اور کانٹے حضرت کی راہ میں ڈال دیتی تا حضور کو اور آنے جانے والوں کو تکلیف پہنچے (تفسیر عثمانی ۸۰۶)

علامہ عثمانی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں کہ عجیب بات یہ ہے کہ اس بدبخت (عورت) کی موت بھی اسی طرح واقع ہوئی لکڑیوں کے گھٹے کی رسی گلے میں آپڑی جس سے گلا گھٹ کر دم نکل گیا

(تفسیر عثمانی ص: ۸۰۷)

قارئین کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک طرف مفسرین ہیں تابعین ہیں ان کی روایات ہیں جو انہوں نے صحابہ سے لیے ہیں اور دوسری طرف فراہی صاحب ہیں کہ سب کو ٹھکرا کر نیا ڈھب اختیار کر رہے ہیں اور ام جمیل کے دامن کو ہر عیب سے پاک بتا رہے ہیں۔

اور اندھا دھند اس پر دوڑ رہے ہیں یقیناً ہم جمہور مفسرین کیساتھ ہیں اور فراہی صاحب کے تفردات اور شواذ کو بالکل قبول نہیں کر سکتے ہیں یہ تفردات وشواذ امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد غامدی کو مبارک ہوں جو حمید الدین فراہی صاحب کے قدم بقدم چلتے ہیں اور ان کو اپنا امام معصوم کہتے ہیں سورت لہب میں فراہی صاحب نے ﴿فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ میں بھی عام مفسرین کے راستے کو چھوڑ کر ایک الگ راستہ اختیار کیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ سب احوال قیامت کے ہیں دنیا کے ساتھ اس کا تعلق نہیں۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں پس ظاہر تاویل یہ ہوگی کہ ام جمیل قیامت کے دن اٹھے گی تو اس کی گردن میں

ایک مضبوط رسی پڑی ہوگی جو ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں پڑی ہوئی رسی سے زیادہ موٹی ہوگی یہ اس ذلت کی تصویر ہے جس میں بالآخر وہ قیامت کے دن گرفتار ہوگی۔ جس ہار کو ام جمیل پہن کر دنیا میں اتراتی تھی وہ قیامت کے دن موٹی رسی کی شکل میں بدل جائے گا جس کی وجہ سے اس کی مثال اس لونڈی کی ہو جائے گی جو گلے میں رسی ڈال کر لکڑیاں چننے جا رہی ہو۔ (تفسیر نظام القرآن ص: ۶۴۵)

محترم قارئین! فراہی صاحب سے متعلق میں نے بہت کچھ ان کی تفسیر کے حوالوں سے آپ کے سامنے پیش کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ جو کچھ غلطیاں امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر میں کی ہیں اور اس کے بعد جاوید احمد غامدی نے کی ہیں اس کی جڑ اور اصل فراہی صاحب ہیں میں نے یہاں طویل محنت اٹھا کر اس لیے تمام حقائق آپ کے سامنے رکھ دیئے تاکہ آئندہ امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید احمد غامدی صاحب کی غلطیوں کے ذکر کرنے کے بوجھ سے میرا کندھا ہلکا ہو جائے بس صرف اشارہ کرنا ہوگا کہ یہ وہی غلطی ہے جو فراہی صاحب نے کی ہے اور ان کی وراثت میں یہ حضرات کر رہے ہیں مثال کے طور پر فراہی صاحب نے زانی محصن کے رجم کی سزا کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ سورت نور میں صرف کوڑوں کا ذکر ہے خواہ زانی شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو پھر اس نے سوچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تو کئی بار مردوں اور عورتوں کو رجم کی سزا ہوئی ہے وہ کیوں ہوئی ہے؟ تو فراہی صاحب نے کہا کہ رجم کی سزا زنا کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ لوگ غنڈے تھے فساد فی الارض کر رہے تھے تو سورت مائدہ کی آیت محاربہ کے حکم کے مطابق ان کو سنگسار کیا گیا تھا وہ زنا کی سزا نہیں تھی یہی بات امین احسن اصلاحی نے لے لی اور اسی بات پر جاوید احمد غامدی چل پڑا اور کہا کہ اس مشکل کو امام فراہی نے حل کیا، معلوم ہوا غلطیوں کی جڑ فراہی صاحب ہیں۔ لوگ ان کو امام معصوم سمجھتے ہیں جن کی معصومیت کا حال سب کے سامنے آ گیا۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ہدایت دے اور پھر اس ہدایت پر ان کو استقامت عطا فرمائے آمین

یارب العالمین،۔

آخر میں ایک ضروری بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ فراہی صاحب زمانے کے حوالے سے پرانے آدمی ہیں صاحب قلم اور گہرے عالم بھی ہیں اس لیے ان کے زمانے میں کچھ قابل تقلید علماء نے ان کی وفات پر زبردست خراج تحسین پیش کی ہے ان میں سے ایک سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ بھی ہیں ان کے مقالے سے بادی النظر میں یوں لگتا ہے کہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے تعزیت کے موقع پر ہر چیز سے صرف نظر کی اور متوفی مرحوم کے محاسن ہی کو مدّ نظر رکھا اور انسانی شرافت کے حوالہ سے ان کو ایسا ہی لکھنا چاہیے تھا لیکن اس سے فراہی صاحب کی زندگی کے علمی پہلو کی تائید وتوثیق سمجھنا شاید ان کے عقیدت مندوں کی خوش فہمی ہوگی دوسری بات یہ بھی ہے کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی میں جو معیاری بدلاؤ آیا ہے وہ اس کی اس بیعت کے بعد آیا ہے جوانہوں نے حضرت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے کی تھی شاید فراہی صاحب کے بارے میں ان کا یہ تعزیتی مضمون پہلے زمانے کا ہوگا۔

کسی زمانے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے حمید الدین فراہی صاحب پر ایک سنگین فتویٰ جاری فرمایا تھا پھر حضرت سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی وضاحت پر انہوں نے اپنے فتویٰ سے رجوع کرلیا۔ (بحوالہ ماہنامہ الشریعہ ۲۳ فروری ۲۰۱۶ء آراء وافکار مولانا سید متین احمد شاہ صاحب نائب مدیر مجلہ فکر ونظر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد)

بہر حال حمید الدین فراہی صاحب خود جیسے بھی تھے لیکن انہوں نے جو لکھا وہ ہمارے سامنے ہے کہ انہوں نے اپنے نظریات کی بنیادی اینٹ ٹیڑھی رکھی تو ابتداء سے انتہاء تک دیوار ٹیڑھی چڑھتی چلی گئی شاعر نے کہا

خشتِ اول چوں نہد معمار کج تا ثریا میرود دیوار کج

امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن

عام مفسرین سے الگ راستہ اختیار کرنے والوں میں امین احسن اصلاحی صاحب بھی ہیں ان کی تفسیر کا نام تدبر قرآن ہے جو ضخیم نو جلدوں پر مشتمل ہے حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے یتیمۃ البیان میں ان کی تفسیر پر کچھ تبصرہ کیا ہے جو اس سے پہلے میں نے نقل کیا ہے اس وقت اس تفسیر کی صرف دو جلدیں چھپ گئی تھیں یہاں میں امین احسن اصلاحی کا وہی نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے تحت انہوں نے عام مفسرین کے تفسیری منہج کو چھوڑ کر الگ منہج اختیار کیا ہے چنانچہ وہ تدبر قرآن کے ابتدائی مقدمہ میں لکھتے ہیں

امین احسن اصلاحی کے نزدیک تفسیر کے وسائل

میں نے اس (تفسیر) میں فہم قرآن کے ان وسائل وذرائع کو اصل اہمیت دی ہے جو خود قرآن کے اندر موجود ہے مثلاً قرآن کی زبان، قرآن کا نظم اور قرآن کے نظائر وشواہد، دوسرے وسائل جو قرآن سے باہر کے ہیں مثلاً حدیث، تاریخ سابق آسمانی صحیفے اور تفسیر کی کتابیں، اگر چہ امکان کی حد تک میں نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن ان کو داخلی وسائل کے تابع رکھ کر ان سے استفادہ کیا۔ (مقدمہ تدبر قرآن ص ۱)

تبصرہ:

امین اصلاحی صاحب کے نزدیک تفسیر قرآن کے لیے اہم چیز خود قرآن ہے یہی جملہ سر سید احمد خان نے استعمال کیا ہے علامہ عنایت اللہ مشرقی اور چوہدری غلام محمد پرویز نے استعمال کیا ہے حمید الدین فراہی صاحب اور مولانا مودودی صاحب بھی اپنے اصول تفسیر میں اسی طرح جملے لکھتے رہتے ہیں امین احسن اصلاحی صاحب اور ان کے استاذ نظم قرآن پر بہت زور دیتے ہیں حالانکہ یہ ایسی چیز ہے جس پر اتنا زیادہ زور دینا بے جا ہے مفسرین میں سے بعض نے اس کا ذکر کیا

ہے لیکن یہ قرآن کی نصوص سے براہ راست ماخوذ علم نہیں ہے بلکہ خفی مخفی اشارات پر مبنی استنباطی علم ہے اور فہم قرآن میں اس کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے امین احسن اصلاحی کھل کر مذکورہ عبارت میں احادیث مقدسہ کو فہم قرآن میں قرآن سے باہر ایک خارجی غیر ضروری وسیلہ قرار دیتے ہیں حالانکہ پوری امت کے علماء احادیث کو تفسیر کے لیے شرط اول قرار دیتے ہیں امین احسن اصلاحی صاحب سابقہ آسمانی صحیفوں کو قرآن کی تفسیر اور فہم کے لیے بہت اہم وسیلہ سمجھتے ہیں افسوس ہے وہ محرف صحائف اور منسوخ کتابوں کو کیسے قابل اعتماد سمجھتے ہیں قرآن کی موجودگی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات کی عبارات پڑھنے پر حضرت عمر فاروق پر کتنی بڑی ناراضگی کا اظہار فرمایا جس کا قصہ صحیح احادیث میں مذکور ہے۔

امین احسن اصلاحی اور یہود و نصاریٰ کی کتابیں

اصلاحی صاحب نے سابقہ کتب اور آسمانی صحیفوں کی بہت تعریف کی ہے اور اس کو قرآن عظیم کی واحد عمدہ تفسیر قرار دی ہے اور دوسری چیزوں کی نفی کی ہے تعجب اس پر ہے کہ اصلاحی صاحب نے محرّف چیزوں کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور جہاں تحریف نہ بھی ہو ان کا منسوخ ہونا تو یقینی ہے لیکن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

فی الواقع قرآن کا اصل زور اسی وقت واضح ہو جاتا ہے جب کسی معاملے میں اس کے بیان کو تورات وانجیل کے مقابل میں رکھ کے جانچا جائے۔

ان مقابل بحثوں کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اسی طرح تورات، زبور اور انجیل بھی اللہ ہی کے اتارے ہوئے صحیفے ہیں۔ اگر ان کے بدقسمت حاملوں نے ان صحیفوں میں تحریفیں نہ کر دی ہوتیں تو یہ بھی اسی طرح ہمارے لیے رحمت و برکت تھے جس طرح قرآن ہے۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود آج بھی ان کے اندر حکمت کے خزانے ہیں۔ اگر آدمی ان کو پڑھے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح سامنے آتی ہے کہ ان صحیفوں کا سرچشمہ بھی

بلا شبہ وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ میں ان کو بار بار پڑھنے کے بعد اس رائے کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن کی حکمت کے سمجھنے میں جو مدد ان صحیفوں سے ملتی ہے وہ مدد مشکل ہی سے کسی دوسری چیز سے ملتی ہے۔ خاص طور پر زبور، امثال اور انجیلوں کو پڑھیئے تو ان کے اندر ایمان کو وہ غذا ملتی ہے جو قرآن وحدیث کے سوا اور کہیں بھی نہیں ملتی، حیرت ہوتی ہے کہ جن قوموں کے پاس یہ صحیفے موجود تھے وہ قرآن اور پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے کیوں محروم رہیں

(مقدمہ تدبر قرآن ص:٢٨)

تبصرہ:

امین احسن اصلاحی صاحب کی مذکورہ تحریر سے تورات وانجیل اور زبور وصحائف یہود ونصاریٰ کی کتنی عقیدت ومحبت ٹپکتی ہے یہ ہر پڑھنے والا محسوس کرسکتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ تحریف کے باوجود ان صحائف میں حکمت کے خزانے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ بار بار پڑھنے کے بعد میں کہتا ہوں کہ قرآن کی حکمت سمجھنے میں جو مدد ان صحیفوں سے ملتی ہے وہ مدد دوسری چیزوں سے ملنا مشکل ہے گویا احادیث سے یہ صحائف مقدم ہوگئے، میں عرض کرتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تورات کی جو آیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی تھیں وہ بھی تو حکمت وموعظت پر مشتمل تھیں پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنے زیادہ غصہ کیوں ہوئے کہ چہرہ سرخ ہوگیا اور فرمایا یہ تو تورات کی آیات ہیں لَوْ كَانَ مُوْسىٰ حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ اِلَّا اِتِّبَاعِىْ

(مشکوۃ شریف) یعنی اگر موسیٰ زندہ بھی ہوتو میری اتباع کے سوا ان کو چارہ نہیں ہوگا۔

امین اصلاحی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ سابقہ کتابوں اور صحائف میں جو حکمت وموعظت کی باتیں تھیں وہ سب قرآن میں مندرج ہیں اب منسوخ ومحرف چیزوں کی ضرورت نہیں

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾

عام مفسرین اور امین احسن اصلاحی

اپنے پیشروؤں کی طرح امین احسن اصلاحی صاحب بھی عام مفسرین کی تفاسیر سے زیادہ خوش نہیں ہیں چنانچہ وہ اپنی تفسیر تدبر قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

اس کتاب میں دوسری تفسیروں کے حوالے زیادہ نہیں ملیں گے اسکی وجہ، جیسا کہ اوپر اصولی مباحث کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں، یہ ہے کہ اس کی بنیاد مروجہ طریقۂ تفسیر کی طرح تفسیر کی کتابوں پر نہیں ہے بلکہ براہ راست فہم قرآن کے اصلی وسائل وذرائع پر ہے تاہم خاص خاص اہم مباحث میں ان تفسیروں اور ان ارباب تاویل کے حوالے بھی میں نے دیے ہیں جن کی تائید مجھے حاصل ہوسکی ہے۔ (مقدمہ تدبر قرآن ص:۱۲)

اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر کے باب میں صرف روایات ہی پر اعتماد کرتے ہیں یقیناً وہ غلو کرتے ہیں۔ یہ بات محققین کے مذہب اور طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر میں اصل الاصول خود قرآن کے الفاظ، اس کے شواہد ونظائر اور کلام کے سیاق وسباق اور اس کے نظم کا لحاظ ہے۔ ضروری ہے کہ ہر آیت کی تاویل میں ان چیزوں کو مقدم رکھا جائے۔ کسی حال میں ان سے اغماض نہ کیا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روایات واحادیث کی رہنمائی کے بغیر تفسیرِ قرآن کی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔ قرآن مجید جس عہد کا کلام ہے اور جن لوگوں کو اول اول اس نے مخاطب کیا ہے، قدرتی طور پر اس عہد کی بے شمار خصوصیات اور اس قوم کے بے شمار حالات کی طرف وہ اشارے کرتا ہے جن کو پوری طرح بے نقاب کرنے کے لیے ہم ان لوگوں کی اعانت سے مستغنی نہیں ہوسکتے جو اس کے اولین مخاطب تھے، ان کی مدد سے یہ فائدہ اٹھانا قرآن مجید کے الفاظ کی حکومت کو باطل کرنا نہیں ہے اور نہ ذرہ برابر اس سے اس کی قطعیت میں کوئی فرق آتا ہے۔ کیونکہ ہم روایات وآثار کی رہنمائی سے وہیں فائدہ اٹھاتے ہیں جہاں قرآن کے الفاظ اشارہ کر رہے ہوتے ہیں کہ ان سے فائدہ

اٹھایا جائے۔

امین احسن اصلاحی مزید لکھتے ہیں کہ یہ دعویٰ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کے لیے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن قرآن کی تفسیر میں روایات و آثار کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانا قرآن کے محتاج ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ ہمارے محتاج ہونے کا ثبوت ہے اور ہمارے محتاج ہونے اور قرآن کے محتاج ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ہم قرآن سمجھنے کے لیے زبان اور نحو سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کے لیے ان چیزوں کا محتاج ہے۔ (مبادی تدبر قرآن ص:۱۸۱)

بعض اوقات قرآن کے کسی لفظ کے تحت اہل تاویل (اہل تفسیر) کے اقوال جو وہ نقل کر دیتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن عام لوگ اسی کو بڑی تحقیق سمجھتے ہیں (مقدمہ تدبر قرآن ص ۵)

مولانا احسن اصلاحی نے عام مفسرین کے طور طریقوں کو تو نظر انداز کر دیا ہے لیکن مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر و تحقیق کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور اپنی تفسیر کو مکمل طور پر فراہی صاحب کی تفسیر کا خلاصہ و نچوڑ اور ثمرہ سمجھتے ہیں چنانچہ بڑی معصومیت کے ساتھ لکھتے ہیں:

''میری چالیس سال کی محنتوں کے نتائج کے ساتھ ساتھ اس میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ۳۰۔۳۵ سال کی کوششوں کے ثمرات بھی ہیں۔ مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعویٰ کر سکتا کہ اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے سب استاذ مرحوم ہی کا افادہ ہے اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ لیکن میں یہ دعوے کرنے میں صرف اس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی ان کی طرف منسوب ہو جائے۔ مولانا سے میرے استفادے کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ ان کی رائے میرے علم میں آ گئی ہو، بلکہ میں نے ان سے قرآن حکیم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور خود ان کی رہنمائی میں پورے پانچ سال ان اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں۔ پھر انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج تک کام کرتا ہوں۔ اس اعتبار سے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ سب کچھ استاذؒ کا فیض ہے لیکن اس میں چونکہ

بلا واسطہ افادے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ افادے کا بھی بہت بڑا حصہ ہے اس وجہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کا جو حصہ مستحکم اور مدلل نظر آئے اس کو استاذ مرحوم کا صدقہ سمجھئے اور جو بات کمزور یا غلط نظر آئے اس کو میری کم علمی پر محمول فرمائیے"۔ (مقدمہ تدبر قرآن ص:۱۲)

تبصرہ:

امین احسن اصلاحی صاحب کے اس اعلان اور اقرار اور فراہی صاحب پر اعتماد واعتقاد کے یہ شاندار جملے اس بات کی واضح دلیل اور کھلا اقرار ہے کہ حمید الدین فراہی صاحب نے اپنی تفسیر میں جو غیر معروف اور شاذ راستہ اختیار کیا ہے اصلاحی صاحب بھی اس پر قدم بقدم گامزن ہے اس لیے جو غلطیاں فراہی صاحب نے کی ہیں حرف بہ حرف اصلاحی صاحب بھی اس کے قائل ہیں لہذا اصلاحی صاحب کی تفسیر کو مکمل طور پر نہ بھی دیکھا جائے پھر بھی فراہی صاحب کی ساری غلطیاں اس میں بھی موجود مانی جاسکتی ہیں کیونکہ استاذ کا قدم اگر غلط پڑ گیا تو شاگرد کا بھی یہی حال ہوگا۔ خصوصاً جب شاگرد کھلے دل سے استاذ کی وفاداری کا عہد واقرار بھی کرلے پھر تو ساری عمارت اسی کچی اینٹ پر قائم ہوگی جو سب سے پہلے رکھی گئی ہے

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا میرود دیوار کج

جب معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو آسمان تک دیوار ٹیڑھی چڑھتی چلی جائے گی۔

امین احسن اصلاحی صاحب کے ہاں اصول تفسیر

میں حیران ہوں منہج صحیح سے ہٹ کر جن نام نہاد مفسرین نے اپنی تفاسیر کے لیے جو اصول وضع کیے ہیں مجموعی اعتبار سے سب ایک دوسرے کے ہمخیال اور ہم نوالہ وہم پیالہ ہیں سرسید احمد خان حمید الدین فراہی، علامہ عنایت اللہ مشرقی، چوہدری غلام محمد خان پرویز، عبداللہ چکڑالوی، جناب مودودی صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید احمد غامدی صاحب سب یہی لکھ رہے ہیں کہ قرآن اپنے لیے آپ تفسیر ہے اس کے لیے کسی بھی خارجی تفسیر کی حاجت و ضرورت نہیں

ہے ان لوگوں کا اس سے صرف احادیث مقدسہ سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود ہے چونکہ احادیث مقدسہ قرآن عظیم کی صحیح سمت پر حق پر مبنی تفسیر کرتی ہیں اور ان اہل باطل کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ احادیث کو کنارہ کر دیں اور پھر تفسیر بالرائی کر کے قرآن عظیم کی تفسیر میں من مانی شروع کر دیں احادیث کی موجودگی میں وہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے منصوبے ناکام بناتا ہے چند ایک کے سوا ان کی ساری تفاسیر فضاؤں میں اڑ کر منظر عام سے غائب ہو گئیں کیونکہ ''مَا کَانَ لِلّٰہ یبقی وما کان لغیرہ یفنی''۔ یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتی ہے وہ باقی رہتی ہے اور جو چیز غیر اللہ کے لیے ہوتی ہے وہ فانی ہو جاتی ہے جناب حمید الدین فراہی صاحب نے پورے قرآن کی تفسیر عربی میں لکھی تھی لیکن آخری چودہ سورتوں کے علاوہ پورا قلمی نسخہ ضائع ہو گیا۔ اب امین احسن اصلاحی صاحب کے وہ اصول ملاحظہ ہوں جو انہوں نے اپنی تفسیر کے لیے وضع کر رکھے ہیں

امین احسن اصلاحی صاحب نے مبادی تدبر قرآن کے نام سے ایک کتاب الگ لکھی ہے اس میں آپ نے ایک عنوان رکھا ہے جو یہ ہے:

''تفسیر کے اصول'' (ص:۱۸۳)

اس عنوان کے تحت اصلاحی صاحب نے چار بڑے موضوعات کو بیان کیا ہے پہلے موضوع کا عنوان ہے (۱) محدثین اور اہل روایت کا طریقہ (۲) دوسرا عنوان ہے متکلمین کا طریقہ تیسرے موضوع کا عنوان ہے (۳) مقلدین کا طریقہ اس عنوان کا مطلب انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اس سے فقہاء کے مقلدین مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مفسرین کی تفاسیر کی تقلید مراد ہے کہ ان کے نقش قدم پر چل کر تفسیر لکھی جائے۔ چوتھے موضوع کا عنوان ہے (۴) متجددین کا طریقہ۔

اصلاحی صاحب نے اس کے بعد بڑا عنوان رکھا ہے ''مذکورہ بالا طریقوں پر تنقید'' (ص:۱۸۷)

اس عنوان کے تحت اصلاحی صاحب نے مفسرین کی خوب خبر لی ہے میں تفصیل یہاں نہیں کر سکتا۔

امین احسن اصلاحی صاحب کے شذوذ پر تنقیدی نظر

بڑی مصیبت یہ ہے کہ کچھ ذہین قسم کے لوگ اپنے ذہن اور اپنے فہم کو عقل کل سمجھنے لگ جاتے ہیں اس کے نتیجہ میں ان کا اعتماد قرآن کی تفسیر اور احادیث کے رد و قبول اور علوم الیہ و مآلیہ میں انہیں چیزوں پر قائم ہو جاتا ہے جن کی طرف ان کا ذہن جاتا ہے اور جس کو ان کے فہم نے قبول کیا ہوتا ہے خواہ اس میں شاذ راستوں پر چلنا کیوں نہ پڑ رہا ہو اور خواہ ان کا ذہن و فہم ٹھوکریں کیوں نہ کھا رہا ہو، کچھ بھی ہو بس یہ حضرات اپنے تفردات پر آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں اوروں کو چھوڑیئے مولانا حمید الدین فراہی صاحب امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید غامدی صاحب کو لیجئے یہ حضرات اپنے تفردات کو اور دوسروں پر تنقیدات کو کس طرح حرف آخر سمجھتے ہیں چنانچہ امین احسن اصلاحی صاحب اپنی کتاب مبادی تدبر قرآن ص: ۷۶، ۷۷ میں اکابر مفسرین پر تنقیدی نگاہ سے یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"اس اصول تفسیر کی جو سب سے زیادہ جامع اور عظیم الشان کتاب تالیف ہوئی وہ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے، اس میں وہ سب کچھ یکجا جمع ہے جو سلف سے بطریق روایت منقول ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ ہر آیت کے تحت سلف کے تمام اقوال، بغیر کسی جرح و نقد کے، جمع کر دیتے ہیں اور جو قول ان کے نزدیک ترجیح کے قابل ہوتا ہے اخیر میں اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ حتی الامکان اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جو دوسرے تمام اقوال کو اپنے اندر جمع کر لے، جا بجا لغت و نحو سے بھی استدلال کرتے ہیں، لیکن نہ تو اس میں روایات کی تنقید ہے نہ قرآن پر قرآن یا تاریخ یا عقل وغیرہ کے پہلو سے کوئی بحث کی گئی ہے۔ اس سبب سے اس میں جو جواہر ریزے ہیں وہ منکر اور ضعیف روایات کے انبار میں گم ہیں اور جب تک خود قرآن یا عقل کی روشنی رہنمائی نہ کرے ان کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اس عظیم الشان تصنیف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پوری تنقید کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے۔

مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس کتاب میں صرف روایات کو جمع کر دینے کی خدمت انجام دی ہے، نقد و نظر کا کام اہل نظر کے لیے چھوڑ دیا ہے اگر یہ خدمت بھی وہ اپنے سر لے لیتے تو شاید روایات و آثار کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ ہم کو ہاتھ نہ آسکتا۔ ابھی حال ہی میں ان کے حالات میں کہیں یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ ان کے ذخّارِ قلم نے جو سرمایہ فراہم کر دیا ہے اگر ان کی تصنیفی عمر کو سامنے رکھ کر اس کا حساب لگایا جائے تو روزانہ چالیس صفحہ کا اوسط پڑے گا۔ ایک ایسا سبک عنان قلم اگر جمع و تالیف کے ساتھ ساتھ نقد و نظر کے الجھاؤ میں بھی پھنس جاتا تو یقیناً سلف کے اقوال کے ایک بڑے حصہ سے ہم محروم ہو جاتے۔

اس کے بعد سب سے زیادہ مشہور و مقبول تفسیر علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ لیکن یہ حقیقت میں تفسیر ابن جریر کا خلاصہ ہے۔ صرف اتنی بات اس میں نئی ہے کہ محدثانہ طریق پر اس میں روایات کی تنقید کی گئی ہے۔ اس کے سوا قرآن مجید کے فہم و تدبر کے دوسرے اصولوں سے اس میں بھی کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ صرف اس قدر تبدیلی کچھ زیادہ مفید مقصد نہیں ہے۔

تفسیر کی تیسری اہم کتاب امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر متکلمانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس اعتبار سے یہ لاجواب کتاب ہے۔ لیکن یہ کلامی بحثیں اس پر اس قدر حاوی ہو گئی ہیں اور اشعریّت کی حمایت کے لیے امام صاحب نے اس میں قرآن مجید کو اس بے دردی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ فہم قرآن کے لیے یہ کتاب نہ صرف یہ کہ کچھ مفید نہیں رہ گئی ہے، بلکہ نہایت مضر بن گئی ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص متکلمانہ قیل و قال اور اشعریّت و اعتزال کے معرکوں سے دلچسپی رکھتا ہو یا یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ متکلمین نے قرآن کو کس طرح سمجھا ہے تو اس کے لیے یہ بہترین کتاب ہے۔

تفسیر کی چوتھی اہم کتاب علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کشاف ہے، اس کا طریقہ مذکورہ کتابوں سے بالکل الگ ہے۔ علامہ زمخشری کی نظر کا محور عموماً عبارتِ قرآن ہوتی ہے۔ یہ پہلے

لغت، اعراب اور ربط کلام سے بحث کرتے ہیں پھر احتیاط کے ساتھ روایات بھی لاتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت نہایت قابل قدر ہے کہ وہ لغت و اعراب میں عموماً صحیح مذہب اختیار کرتے ہیں۔ اس چیز میں امام رازی رحمہ اللہ بھی ان کا لوہا مانتے ہیں، یہاں تک کہ باوجود ان کے ساتھ حریفانہ کاوش کے، ان کی لغوی ونحوی تحقیقات کو امام رازی رحمہ اللہ اکثر اپنی کتاب میں بلا تکلف، بغیر کسی تغیر وتصرف کے نقل کردیتے ہیں۔ ان عبارات سے یہ کتاب قرآن مجید کے طالب علموں کے لیے مفید ہے، لیکن امام رازی رحمہ اللہ جس طرح اشعریّت کے علم بردار ہیں، اسی طرح علامہ زمخشری مذہب اعتزال کے وکیل ہیں۔ اور کتاب الٰہی کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی یہی ہے کہ اس کے پیچھے چلنے کے بجائے آدمی اس بات کی کوشش کرے کہ اس کو خود اپنے کسی فکر وخیال کے پیچھے چلائے۔ (مقدمہ تدبر قرآن ص:۷۸)

اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں: اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دور اوّل کے بعد تفسیر قرآن کی راہ میں جو پہلا ہی قدم اٹھایا گیا وہی غلط تھا، اس کا محرک اگرچہ ایک اچھا خیال تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کے نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک فتنہ کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی گئی اور ساتھ ہی ایک دوسرے فتنہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ (مبادی تدبر قرآن ص:۷۹)

امین احسن اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں:

جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر کے باب میں صرف روایات ہی پر اعتماد کرتے ہیں یقیناً وہ غلو کرتے ہیں۔ یہ بات محققین کے مذہب اور طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر میں اصل الاصول خود قرآن کے الفاظ ہیں اس کے شواہد ونظائر اور کلام کے سیاق وسباق اور اس کے نظم کا لحاظ ہے۔ ضروری ہے کہ ہر آیت کی تاویل میں ان چیزوں کو مقدم رکھا جائے۔ کسی حال میں ان سے اغماض نہ کیا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روایات واحادیث کی رہنمائی کے بغیر تفسیر قرآن کی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔ قرآن مجید جس عہد کا کلام ہے اور جن لوگوں کو اوّل اوّل اس نے مخاطب کیا ہے، قدرتی طور پر اس عہد کی بے شمار خصوصیات اور اس قوم

کے بے شمار حالات کی طرف وہ اشارے کرتا ہے جن کو پوری طرح بے نقاب کرنے کے لیے ہم ان لوگوں کی اعانت سے مستغنی نہیں ہو سکتے جو اس کے اوّلین مخاطب تھے، ان کی مدد سے یہ فائدہ اٹھانا قرآن مجید کے الفاظ کی حکومت کو باطل کرنا نہیں ہے اور نہ ذرّہ برابر اس سے اس کی قطعیت میں کوئی فرق آتا ہے۔ کیونکہ ہم روایات وآثار کی رہنمائی سے وہیں فائدہ اٹھاتے ہیں جہاں قرآن کے الفاظ اشارہ کر رہے ہوتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ دعویٰ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کے لیے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے، لیکن قرآن کی تفسیر میں روایات وآثار کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانا قرآن کے محتاج ہونے کا ثبوت نہیں ہے اور ہمارے محتاج ہونے اور قرآن کے محتاج ہونے میں بڑا فرق ہے۔ (مبادی تدبر قرآن ص:۱۸۱)

اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں ہماری تفسیر کی کتابوں مین ایک آیت بلکہ بسا اوقات ایک ایک لفظ کے تحت اہل تاویل کے متعدد اقوال بغیر ان کے دلائل کے ذکر کے نقل کر دیئے گئے ہیں یہ اقوال اکثر حالات میں ایک دوسرے سے متناقض ہیں ظاہر ہے کہ تفسیر کا یہ طریقہ نہایت غلط ہے قرآن مجید اپنی دلالت میں بالکل قطعی ہے اس لیے لازم ہے کہ ان متعدد اقوال میں سے وہی اختیار کیے جائیں جو قرآن مجید کے سیاق وسباق اور دوسرے قرائن کے مطابق ثابت ہو ورنہ قرآن کا قطعی الدلالت ہونا معرض خطر میں پڑ جاتا ہے (ص:۱۸۸)

تبصرہ:

جن اہل با ر نے عام مفسرین کا طریقہ چھوڑ رکھا ہے وہ بھی دعویٰ رکھتے ہیں کہ قرآن اپنے فہم میں خود بخود سب چیزوں کے لیے کافی ہے اس کو کسی خارجی چیز کی ضرورت نہیں ہے اصلاحی صاحب اور فراہی صاحب اور غامدی صاحب بھی اسی نظریہ پر زور دے رہے ہیں کبھی کبھی روایات کے قبول کا مشروط اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً اپنی تفاسیر میں ان روایات کو قریب آنے نہیں دیتے ہیں بہر حال اصلاحی صاحب نے اپنی کتاب مبادی تدبر قرآن ص:۴۷ میں اہل

باطل کا یہی غلط نظریہ پیش کیا ہے لیکن اصلاحی صاحب نے اس پر اس طرح تنقید نہیں کی جو کرنی چاہیے تھی بلکہ بغیر تنقید کے نقل کیا ہے چنانچہ ان لوگوں کے نظریات دربارۂ فہم قرآن اصلاحی صاحب نے اس طرح نقل کیے ہیں۔

(۱) قرآن مجید بذات خود دنیا کے ہر طبقے کے لیے ہدایت ہے وہ محتاج تفسیر وتاویل نہیں اس کا انداز بیان اس طرح واضح اور شگفتہ ہے کہ وہ مخاطب کو فہم مطالب میں اپنے سوا کسی اور چیز کا محتاج نہیں بناتا ہے۔

(۲) صرف عربی زبان دانی قرآن کے لیے بس ہے۔

(۳) قرآن کو نہ نبی کے تشریحی بیان کی حاجت ہے، نہ شان نزول کی، لغت عرب کے سوا قرآن کے معنی سمجھنے میں کسی خارجی چیز سے مدد لینا قرآن کو معنوی تحریف کے غار میں دھکیلنا ہے اور اس کی قطعیت کو برباد کر کے اس کو مظنون وموہوم بناتا ہے۔

ان تمام دعاوی کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات، اپنی زبان، اپنے انداز بیان غرض ہر پہلو سے بالکل واضح ہے اس وجہ سے اس کا مخاطب اس کو سمجھنے کے لیے، عربی زبان کے علم کے سوا، کسی خارجی اعانت کا محتاج نہیں ہے، اس دعویٰ کی تائید میں، عموماً جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں:

ا۔ قرآن مجید، بنی نوع آدم کے تمام طبقات کے لیے صحیفہ ہدایت بن کر نازل ہوا ہے، اس کا دعویٰ یہ ہے کہ جو اس پر ایمان لائے گا فلاح پائے گا اور جو اس سے اعراض کرے گا وہ ہلاک ہوگا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کی تعلیم ودعوت کا معیار عام عقل انسانی کے معیار کے مطابق ہوتا کہ ہر انسان جو فکر ونظر کی عام استعداد رکھتا ہے، اس کو سمجھ سکے اور اس کی تعلیمات پر عمل کر کے خالق کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کر سکے، ایک ایسی کتاب جس کا مقصد عام تعلیم ودعوت ہو، نہ تو لفظاً اتنی مجمل اور پیچیدہ ہونی چاہیے کہ جب تک خواص اس کی مشکلات حل نہ کریں وہ سمجھ میں نہ آئے اور نہ معناً اتنی مبہم اور دقیق ہونی چاہیے کہ انسانی فہم وادراک کی عام

استعداد اس کے اسرار و رموز سمجھنے سے قاصر رہ جائے۔

(۴)　قرآن مجید سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ قطعی مانی جاتی ہے اس وجہ سے اس کی تفسیر وتاویل ایسی چیزوں کی اعانت سے مستغنی ہونی چاہیے جن کا بیشتر حصہ ظنی ہے مثلاً روایات واحادیث وغیرہ، ورنہ قرآن مجید کی قطعیت برباد ہو جائے گی۔ (مبادی تدبر قرآن ص:۷۴،۷۵)

اصلاحی صاحب نے اہل باطل سر سید احمد خان علامہ عنایت اللہ مشرقی غلام احمد پرویز کی عبارات کو نقل تو کر دیا لیکن معمولی تردید کے بعد ایک حد تک اس کو حق بجانب بھی قرار دیدیا۔ چنانچہ وہ ان اقوال پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

ان دلیلوں میں بہت غلط فہمیاں پوشیدہ ہیں جن کو آگے چل کر ہم بے نقاب کریں گے لیکن ایک حقیقت کا ہم کو بلا تکلف پہلے ہی قدم پر اعتراف کر لینا چاہیے کہ جو کچھ آج کہا جا رہا ہے یہ کسی عارضی غلط فہمی یا کسی ہنگامی غلط روی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کی تفسیر وتاویل کو جو طریقہ ایک عرصہ سے مسلمانوں میں رائج اور مقبول رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ ایک زمانہ آئے جس میں اس طریقہ کے متعلق لوگوں کے دلوں میں بدگمانیاں اور شکوک پیدا ہوں۔

(مبادی تدبر قرآن ص:۷۵)

تبصرہ:

میں نے اہل باطل کی تفاسیر کے دیباچوں اور مقدموں سے ان کے نظریات پر مشتمل بہت سارے مواد اکٹھا کیا ہے جو اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے لیکن ان سب کا طرز عمل بتاتا ہے کہ علامہ فراہی صاحب اور اصلاحی اور غامدی صاحب ان لوگوں سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کر سکتے ہیں بلکہ ''تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ '' کے اصول کے تحت یہ حضرات بھی انہیں لوگوں کے قافلے کے ساتھی ہیں اور یہ صرف میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ تفسیر کے مقدمات میں کھل کر انہوں نے خود اس کو لکھا ہے اور اس کی ترغیب دیدی ہے یاد رہے کہ فراہی صاحب تفسیر قرآن کو تاویل کہتے ہیں اور

مفسرین کو اہل تاویل کہتے ہیں یہی اصطلاح اصلاحی صاحب اور غامدی صاحب نے اختیار کیا ہے اصلاحی صاحب کی کتاب مبادی تدبر قرآن میں بہت کچھ شذوذ و نوادرات موجود ہیں۔ میں نے جو نقل کیا ہے یہ کافی ہے ان لوگوں نے مجھے تھکا کر رکھدیا ہے ان کی تفسیروں میں تورات وانجیل کے حوالوں کی حیثیت بخاری ومسلم کی احادیث سے بڑھ کر ہے ان کے ہاں جاہلیت کے اشعار اور تاریخی واقعات قرآن کی تفسیر کے لیے آحادیث مقدسہ سے مقدم ہیں میں نے گزشتہ صفحات میں سب کچھ ذکر کیا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ آرہا ہے، ان حضرات کے نزدیک قرآن کی تفسیر کے لیے عربی لغت بھی احادیث اور سلف صالحین کے اقوال سے زیادہ اہم ہے۔

میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر مفسرین کے کمزور اقوال لیکر غلط تفسیر سے آدمی بچ جائے اور جادۂ حق پر قائم رہے یہ بہتر ہے یا یہ بہتر ہے کہ مثلاً ان کے اقوال کو کمزور قرار دیکر خود ایسی تفسیر کے پیچھے پڑ جائیں کہ سننے اور پڑھنے والا پڑھ کر سر پکڑ لے اور کہے کہ:

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستان کیا ہوگا

آپ خود سوچیں ایک شخص مفسر بن کر تفسیر لکھ رہا ہے اس تفسیر میں وہ شخص کسی حدیث کو ذکر نہیں کرتا ہے اور نہ حدیث کے مضمون ومفہوم کو تفسیر میں پیش نظر رکھتا ہے اسی طرح وہ شخص سلف صالحین صحابہ کرام تابعین اور مفسرین کے کسی قول کو بھی پیش نہیں کرتا ہے اور نہ تفسیر کرتے وقت اس کو مد نظر رکھتا ہے بلکہ اپنے ذہن اور سوچ کے مطابق تفسیر پہ تفسیر لکھتا چلا جاتا ہے تو آپ انصاف کیجئے کیا یہ تفسیر بالرائی نہیں ہے؟ اور کیا اس کی شدید وعید نہیں آئی اور کیا اس کو علماء نے حرام نہیں لکھا ہے؟ اب آیئے اور امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن میں ان کی چند غلطیوں کا مشاہدہ کریں میں نے صرف تدبر قرآن کی جلد اول کی چند مقامات کی نشاندہی کی ہے میری اس کتاب میں امین احسن صاحب کی نو جلدوں پر مشتمل کئی ہزار صفحات پر حاوی تفسیر کی بیشمار غلطیوں کے درج کرنے کی وسعت بھی نہیں ہے اور میرے پاس اس کی استطاعت وہمت بھی نہیں ہے بس

جتنا آپ حضرات کے سامنے آجائے اس ظاہر پر وہ غائب بھی قیاس کرلیں جو ابھی تک اوراق وصفحات کے پیٹوں میں پڑا ہے نیز اس سے پہلے حمید الدین فراہی صاحب کی تفسیر نظام القرآن پر میں نے بھرپور لکھا ہے اس سے بھی امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن کی غلطیوں کو پکڑا جاسکتا ہے کیونکہ یہ لوگ ایک دوسرے کے نقش قدم پر قدم بقدم چلتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر کی غلطیاں

امین احسن اصلاحی صاحب ہندوستان کے شہر اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے حمید الدین فراہی صاحب کے قائم کردہ مدرسۃ الاصلاح میں امین احسن صاحب نے تعلیم حاصل کی یہ مدرسہ علامہ شبلی نعمانی کی نگرانی میں چل رہا تھا ۱۹۲۲ء میں امین احسن صاحب اس آزاد خیال مدرسہ سے فارغ ہوئے فراغت کے بعد اصلاحی صاحب بجنور کے ایک اخبار ''مدینہ'' کے نائب مدیر مقرر ہوئے اس اخبار کے دفتر سے بچوں کا ایک رسالہ ''غنچہ'' نکلتا تھا اصلاحی صاحب اس کے نگران تھے اصلاحی صاحب کچھ عرصہ تک اخبار ''سچ'' سے بھی وابستہ رہے حمید الدین فراہی صاحب نے مدرسۃ الاصلاح کی ذمہ داری سنبھال لی تھی لیکن وہ عمر کے آخر میں تھے اس لیے ان کو ایک جانشین کی ضرورت تھی جو آزاد ذہن سے اس کے کام کو آگے بڑھائے امین احسن اصلاحی صاحب نے اس کی ذمہ داری قبول کرلی فراہی صاحب نے اصلاحی صاحب کو شعبۂ صحافت سے ہٹایا اور قرآن کی خدمت کی طرف متوجہ کیا ۱۹۳۰ء میں فراہی صاحب کا انتقال ہوگیا اصلاحی صاحب کو حدیث پڑھنی تھی تو وہ مولنا عبدالرحمٰن مبارکپوری کے پاس گئے اور ان سے حدیث پڑھی۔ فراہی کی تصنیفات کو عام کرنے کے لیے اصلاحی صاحب نے ''دائرہ حمیدیہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، ۱۹۳۶ء میں اصلاحی صاحب نے ''الاصلاح'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم ہوئی تو امین احسن اصلاحی صاحب اس کے بانی اراکین میں شامل ہوگئے، بیس سال تک وہ جماعت اسلامی کے ساتھ رہے شوریٰ کے رکن سے

بڑھ کر وہ جماعت اسلامی کے نائب امیر ہو گئے۔

جماعت سے علحیدگی کے بعد ۱۹۵۸ء میں اصلاحی صاحب نے ''تدبر قرآن'' کے نام سے تفسیر لکھنا شروع کیا ۱۹۸۰ء میں آپ نے نو جلدوں میں اپنی تفسیر مکمل کر لی اور ۱۹۹۷ء میں نوے سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد صاحب نے آپ کا جنازہ پڑھایا اصلاحی صاحب نے تفسیر تو مکمل کر لی لیکن اس میں بے شمار غلطیاں کر کے غلط تفاسیر لکھنے والوں کی صف میں اپنے آپ کو لا کھڑا کر دیا چونکہ اجماع امت احادیث مقدسہ تقلید ائمہ اور تقلید مفسرین کی آپ زیادہ پرواہ نہیں کرتے تھے بلکہ تمام فقہاء اور ان کی فقہ سے بالاتر ہو کر آپ نے پرورش پائی تھی اس لیے ان کی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں بے شمار غلطیاں ہیں عام مفسرین کی تفسیر اور منہج سے الگ راستہ اختیار کرنا ان کے ہاں تفسیر کے لیے بنیادی پتھر ہے اس لیے غلطیوں پہ غلطیاں کر رہے ہیں اور ان غلطیوں پر فخر کر رہے ہیں ان سب غلطیوں کی نشاندہی کر کے کوئی اکھٹا نہیں کر سکتا ہے۔

وہ ریت کے ذرات کی طرح ان کی تفسیر وتشریح و ترجمہ میں پھیلی ہوئی ہیں البتہ موٹی موٹی غلطیوں کی نشاندہی کی میں کوشش کروں گا اگر چہ یہ بھی میرے لیے آسان نہیں ہے لیکن اصلاح کی غرض سے ہمت کی کمر باندھوں گا، حمید الدین فراہی کی غلطیوں کی جو نشاندہی میں نے کی ہے آپ سمجھیں کہ وہ ایک جلد پر مشتمل صرف چودہ سورتوں کی تفسیر کی غلطیاں ہیں آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ اصلاحی صاحب کی نو جلدوں پر مشتمل اس ضخیم تفسیر میں کتنی غلطیاں ہونگی جبکہ ان کی تفسیر کی پہلی جلد آٹھ سو چھتیس صفحات پر مشتمل ہے اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ پوری تفسیر کتنے ہزار صفحات پر مشتمل ہو گی اور اس میں کتنی غلطیاں ہونگی۔

اب آیئے اور امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیری شذوذ اور غلطیوں پر ایک نظر ڈال لیجئے میں اپنی تحریر کی ابتداء میں حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کا مختصر کلام پیش کر چکا ہوں جو انہوں نے اصلاحی صاحب کی تدبر قرآن کے چند مقامات کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے میں بھی چند

شذوذ کی نشان دہی کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں۔

امین احسن اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱

امین احسن اصلاحی صاحب نے بسم اللہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ''شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے''۔

تبصرہ:

اس ترجمہ میں اصلاحی صاحب نے رحمان ورحیم کے مبالغہ اور تاکید کو ظاہر نہیں کیا ہے پھر یہ ترجمہ کلام غیر مفید کے درجہ میں رکھا ہے جس کی نہ مبتدا ہے نہ خبر ہے نہ رحمان ورحیم کا ترجمہ ہے، پھر اس کی تفسیر میں عام اہل تراجم پر رد کیا ہے کہ وہ رحیم کے لفظ کو رحمان کے لیے بطور تاکید مانتے ہیں جو غلط ہے چنانچہ لکھتے ہیں ''بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ رحمان کے بعد رحیم کا لفظ تاکید مزید کے لیے آگیا ہے ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے بلکہ ان میں سے ایک (صفت) خدا کی رحمت کے جوش وخروش کو ظاہر کررہی ہے اور دوسری (صفت) اس کے دوام وتسلسل کو۔

(تدبر قرآن ج ا ص:۶)

اسی تفسیر وتشریح کے پیش نظر جاوید احمد غامدی صاحب بسم اللہ کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں ''اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے جس کی رحمت ابدی ہے''۔ عام اہل تراجم اور عام مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے وہی صحیح ہے یعنی شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

مفسر عظیم امام قرطبی لکھتے ہیں کہ قطرب کہتے ہیں کہ رحمان اور رحیم کو تاکید کے لیے جمع کیا گیا ہے ابواسحاق کہتے ہیں یہ قول بہت اچھا ہے امام قرطبی فرماتے ہیں ''وفی التوکید اعظم الفائدة'' یعنی تاکید میں بہت بڑا فائدہ ہے (قرطبی ج ا ص:۱۰۵)

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر۲

﴿الٓمٓ﴾ علامہ اصلاحی صاحب لکھتے ہیں یہ ایک مستقل جملہ ہے عربی زبان کے قاعدے کے مطابق یہاں مبتدا محذوف ہے اس کو ظاہر کروایا جائے تو پوری بات یوں ہوگی ''ھٰذِہٖ الٓمٓ'' یہ الف میم ہے (تدبر قرآن ص:۳۸)

اصلاحی صاحب اپنے استاذ وامام فراہی صاحب کی تحقیق یوں پیش کرتے ہیں ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معانی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے مثلاً الف کے متعلق اب بھی معلوم ہے کہ وہ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا ''ب'' کو عبرانی میں بیت کہتے ہیں اور اس کے معنی بھی بیت ''گھر'' کے ہیں ''ج'' کا عبرانی تلفظ جیمل ہے جس کے معنی جمل ''اونٹ'' کے ہے ''طہ'' سانپ کے معنی میں آتا تھا اور سانپ ہی کی شکل پر لکھا جاتا تھا ''م'' پانی کی لہر پر دلیل ہوتا تھا اور اس کی شکل بھی لہر سے ملتی جلتی بنائی جاتی تھی۔

(تدبر قرآن ص:۴۰)

تبصرہ:

عام مفسرین کے راستے کو چھوڑ کر جو لوگ اپنے خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں وہ اسی طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں دیکھو کیا لکھتے ہیں؟ الف سے گائے مراد ہے اور سورت بقرہ میں گائے کا ذکر ہے طہ سے سانپ مراد ہے اور اس سورۃ میں سانپ کا قصہ ہے ''ن'' نون سے مچھلی مراد ہے اور اس سورۃ میں اس پیغمبر کا ذکر ہے جو مچھلی کے پیٹ میں چلا گیا تھا ''سُبْحَانَ اللّٰهِ ذَالِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ'' اصلاحی صاحب سے اگر پوچھا جائے کہ آپ نے جو ترجمہ کیا ہے کہ یہ الف لام میم ہے تو آپ بتائیں کہ اس جملہ سے اللہ تعالیٰ کا مقصد ومطلب کیا ہے الف لام میم تو سب کو نظر آرہے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کیوں بتا رہا ہے کہ یہ الف لام میم ہے اصلاحی صاحب نے اس ترجمہ سے قرآن

کی عظمت کو نقصان پہنچایا ہے ان کا یہ نظریہ غلط ہے کہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کا مطلب مجمل ہو یا متشابہ ہو اس لیے اس نے واضح کر دیا کہ یہ الف لام میم ہے۔ تاکہ حروف مقطعات متشابہات میں سے نہ رہیں حالانکہ سارے مفسرین اس کو متشابہات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے یہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان راز ہے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۳

﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ (سورۃ بقرہ آیت: ۸) الناس کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس عام سے ایک خاص گروہ مراد ہے اور وہ گروہ ہے یہود کا اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ صرف یہود ہی ہو سکتے تھے جن کے اندر کوئی جماعت وہ رُوپ دھار سکتی تھی جس کی طرف قرآن نے ان آیات میں اشارہ کیا ہے، (تدبر قرآن: ۷۴)

تبصرہ

مولانا جلیل احسن ندوی ایک گہرے عالم ہیں وہ ایک حد تک مولانا اصلاحی کے مداحین میں سے ہیں اصلاحی صاحب نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی تفسیر تدبر قرآن پر ناقدانہ نظر دوڑائیں مولانا جلیل احسن صاحب نے تدبر قرآن کے بہتر ۷۲ مقامات پر اس طرح تنقید کی ہے کہ اصلاحی صاحب نے آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے یا تفسیر و تشریح میں غلطی کی ہے آپ نے ان ناقدانہ نظرات پر مشتمل ایک کتاب بھی چھاپی ہے جو ایک سو ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ نے پہلی تنقید تدبر قرآن میں الٓمّٓ ذَالِکَ الْکِتَابُ کے ترجمہ اور پھر تفسیر پر کی ہے اور خوب تنقید کی ہے آپ نے دوسری تنقید تدبر کے ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ کی تفسیر پر کی ہے کہ اصلاحی صاحب نے مدینہ کے عرب منافقین کے بجائے تمام آیتوں کو یہود پر چسپان کر دیا ہے جبکہ عام مفسرین اس کو عرب منافقین پر حمل کرتے ہیں اصلاحی صاحب کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اوپر میں نے جو عبارت تدبر قرآن سے نقل کی ہے وہ آپ کے سامنے ہے خلاصہ یہ کہ جمہور مفسرین کا

راستہ چھوڑ کر جو شخص اپنی رائے کے مطابق تفسیر لکھے گا وہ اسی طرح غلطیاں کرے گا۔ جاوید غامدی صاحب نے بھی یہی غلطی کی ہے۔ آیندہ اس کی تفصیل آنے والی ہے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۴

﴿یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُم﴾ (بقرہ: آیت ۲۱) اصلاحی صاحب لکھتے ہیں یہ خطاب اگر چہ بظاہر عام ہے لیکن یہاں مخاطب جیسا کہ اوپر گزرا خاص طور پر مشرکین عرب ہیں اس خطاب کو مشرکین کے ساتھ مخصوص ماننے کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے الخ (تدبر قرآن: ص: ۹۲)

تبصرہ:

یہاں اس خطاب کو مشرکین کے ساتھ خاص کرنا اصلاحی صاحب کی اپنی تصنیف کردہ بات ہے یہ خطاب نزول قرآن کے وقت سے لیکر قیامت تک تمام کفار کو ہے خواہ وہ مشرکین ہوں یا یہود ونصاریٰ ہوں یا ہندو اور پارسی ہوں اس کو خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اصلاحی صاحب نے قرآن عظیم کے عمومی خطاب کو توڑ کر اپنے ذہن کے نظم اور ربط کو ملحوظ رکھا ہے تو عرض یہ ہے کہ نظم اور ربط پر اتنا زور نہ دیا جائے کہ قرآن کی بنیادی تعلیم اس سے متزلزل ہو جائے۔ پورے قرآن میں اس طرح خطاب عموم کے لیے آتا ہے اس کو خاص کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ علامہ جلیل احسن ندوی نے بھی اس مقام پر اصلاحی صاحب پر سخت تنقید کی ہے (تدبر قرآن پر ایک نظر: ۱۷ تا ۲۱)

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۵

﴿ثُمَّ بَعَثْنَاکُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴾ (سورۃ بقرہ آیت: ۵۶)

اصلاحی صاحب نے یہاں موت کے حقیقی معنی کو چھوڑ کر بطور استعارہ بیہوشی کے معنی کو ترجیح دیدی ہے لکھتے ہیں: ''اس صاعقہ اور زلزلہ سے اس ستر سرداروں پر جو اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ طور پر گئے تھے جو حالت طاری ہوئی قرآن مجید نے اس کو موت سے تعبیر کیا ہے

اس موت سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بطریق استعارہ بے ہوشی بھی (تدبر قرآن ص:۱۷۲)

تبصرہ:

امین احسن اصلاحی صاحب نے کئی دلائل کے زور سے یہ کوشش کی ہے کہ یہاں حقیقی موت کے بجائے مجازی موت ثابت کرے جو بے ہوشی ہے تو عرض یہ ہے کہ جب حقیقی معنی لینے میں کوئی مانع نہیں ہے تو علماء لکھتے ہیں کہ مجاز کی طرف جانا صحیح نہیں ہے۔ اصلی مسئلہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ روشن خیال اور ماڈرن قسم کے مفسرین معجزاتی اور کرشماتی چیزوں سے بہت دور بھاگتے ہیں اب حقیقی موت کے بعد زندہ کرنا ایک معجزہ اور کرشمہ تھا تو اصلاحی صاحب نے مجازی معنی بے ہوشی پر آیت کو حمل کیا اور جمہور مفسرین سے الگ راستہ اختیار کیا شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں "اس پر بجلی نے تم کو ہلاک کیا اس کے بعد موسیٰ کی دعا سے ہم نے تم کو زندہ کیا (تفسیر عثمانی ص:۱۱)

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۶

﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ (بقرہ:۵۸)

علامہ اصلاحی صاحب نے لکھا ہے کہ قریہ سے مراد شہر ہے یہاں فلسطین کا کوئی شہر ہو سکتا ہے آیت کا اگلا حصہ ﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ ہے اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ: "سجدہ کے اصل معنی سر جھکانے کے ہیں اس سر جھکانے کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔ اس کی کامل شکل زمین پر پیشانی رکھ دینے کی ہے جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں یہاں آیت میں اس سے مراد صرف سر جھکانا ہے۔ (تدبر قرآن:۱۷۶)

یہاں اصلاحی صاحب نے سجدہ کا مشہور معنی ترک کر دیا ہے جو "وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلَى الْاَرْضِ" ہے یہ تو حقیقی سجدہ کی تعریف ہے اس سے اصلاحی صاحب نے شاید اس لیے اعراض کیا کہ اس نے شہر کے پھاٹک پر سجدہ کرنے سے انکار کیا ہے کیونکہ پھاٹک پر سجدہ سمجھ میں نہیں آتا ہے

اصلاحی صاحب نے شہر کے دروازہ کے بجائے یہاں عبادت خانہ کا دروازہ پیدا کر دیا اور اسی کو آیت کا مصداق قرار دیا چنانچہ لکھتے ہیں ''الباب سے بعض لوگوں نے بستی کا دروازہ مراد لیا ہے۔ اور بعض لوگوں نے خیمۂ عبادت کا دروازہ، میں اس دوسرے قول کو ترجیح دیتا ہوں وجہ ترجیح بیان کر کے آگے لکھتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ یہاں دروازہ سے خیمۂ عبادت کا دروازہ ہے مقصود یہ تھا کہ اس شہر میں داخل ہوں اس کی زرخیزی اور شادابی سے آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور خیمۂ عبادت میں عاجزانہ حاضر ہو کر خدا کا شکر ادا کرتے رہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں (تدبر قرآن ص:۱۷۶)

تبصرہ:

عرض یہ ہے کہ یہاں اصلاحی صاحب نے جمہور مفسرین سے الگ راستہ اختیار کیا ہے جو صحیح نہیں ہے سوال یہ ہے کہ اگر یہاں سر جھکانے والا سجدہ مراد ہے جیسا کہ اصلاحی صاحب نے اس کو ترجیح دیکر ثابت کیا ہے تو پھر خیمۂ عبادت تو مسجد ہوگئی اب مسجد میں اصلی اور حقیقی سجدہ میں کیا رکاوٹ تھی کہ اصلاحی صاحب نے کہا کہ خیمۂ عبادت پر سجدہ سر جھکانا ہی مراد ہے بستی کا دروازہ ہو تو سر جھکانا سمجھ میں آسکتا ہے۔ جمہور مفسرین سے الگ ہو کر تفسیر لکھنے کا وبال یہی ہے۔
مولانا جلیل احسن ندوی صاحب نے بھی یہاں اصلاحی صاحب پر کڑی تنقید کی ہے۔ شیخ الہند رحمہ اللہ نے کمر جھکانے کے مطلب کو بھی قبول کیا ہے لیکن وہ شہر میں داخل ہونے کے دروازہ کے بارے میں ہے خیمۂ عبادت کا دروازہ اصلاحی صاحب کی ایجاد ہے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۷

﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ (سورۃ بقرۃ:۶۳)
بنو اسرائیل کے سروں پر کوہ طور اٹھا کر لٹکا دیا گیا تھا کہ تورات کے احکام کو ماننے کے بعد عہد شکنی نہ کرو نہیں تو یہ پہاڑ تم پر گرا دیا جائے گا عام مفسرین کے نزدیک یہ معاملہ حقیقت پر مبنی تھا اور ﴿وَاِذْ

﴿نَتَقْنَا الْجَبَلَ﴾ سے پہاڑ کے چیرنے کی تصریح بھی آ گئی ہے لیکن عام روشن خیال قسم کے مفسرین اس کو ایک تشبیہی اور تصوراتی مفروضہ مانتے ہیں کہ گویا ایسا نظر آ رہا تھا کہ پہاڑ ان پر گرا جا رہا ہے حقیقت میں ایسا نہیں تھا اس سے یہ نام نہاد مفسرین ایک معجزاتی اور کرشماتی حقیقت سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گویا ایسا ہونے والا تھا چنانچہ اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ معاہدہ قرآن مجید اور تورات دونوں میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل کے سرداروں سے دامنِ کوہ میں یہ لیا گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک سخت زلزلہ نے پہاڑ کو ہلا دیا اگر زلزلہ کے وقت آدمی کسی اونچی دیوار کے زیر سایہ یا پہاڑ کے دامن میں بیٹھا ہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہاڑ یا دیوار سائبان کی طرح سر پر لٹک رہے ہیں اور اوپر گرا چاہتے ہیں اس حالت کو قرآن نے طور کو ان کے سروں پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا۔　　(تفسیر تدبر قرآن ص:۱۹۹)

تبصرہ:

اس طرح تاویل کر کے مودودی صاحب نے بھی غلطی کی ہے سر سید احمد خان غلام احمد پرویز عنایت اللہ مشرقی نے بھی یہی غلطی کی ہے اور امین احسن اصلاحی بھی یہی غلطی کر رہے ہیں حالانکہ ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ﴾ کی آیت اس نظریہ کی تردید کرتی ہے جس میں پہاڑ کے چیرنے کا ذکر ہے بہر حال عام مفسرین کا راستہ چھوڑ کر اسی طرح بھٹکنا پڑتا ہے۔ حضرت سید یوسف بنوریؒ نے بھی امین احسن اصلاحی وغیرہ ان لوگوں پر تنقید کی ہے۔

امین احسن صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۸

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ (بقرہ:۶۵)

''یعنی ہم نے ان سے کہا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل''۔ شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں وہ لوگ فریب اور حیلہ سے ہفتہ کے دن شکار کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مسخ کر کے ان کی صورت بندر کی سی کر دی فہم و شعور انسانی موجود تھا ایک دوسرے کو دیکھتا تھا اور روتا تھا مگر کلام نہیں

کر سکتا تھا تین روز کے بعد سب مر گئے (تفسیر عثانی ص:۱۳)
شیخ الہند کی تفسیر عام مفسرین کے موافق ہے کہ بنی اسرائیل حقیقی اعتبار سے بندر بن گئے تھے لیکن اصلاحی صاحب نے ظاہری اور صوری مسخ کا انکار کیا ہے ان کے نزدیک یہ معنوی مسخ تھا ان کی رائے یہ ہے کہ بندر اور انسان میں زیادہ فرق نہیں ہے اصلی فرق جو ہے وہ خواہش اور ارادہ کا ہے بندر کی خواہشات میں کوئی قیود وحدود نہیں ہوتی ہیں اگر ایک انسان بھی اسی طرح ہو جائے تو دونوں میں زیادہ فرق نہیں رہ جاتا بنی اسرائیل خواہش کے بندر بن گئے تو ان کی عقلیں مسخ ہوگئیں اصلاحی صاحب کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔ اگر یہی حالت اپنی خواہشات نفس کی پیروی کسی انسان کی یا کسی انسانی گروہ کی ہو جائے تو اس کے درمیان اور بندر کے درمیان کوئی معنوی فرق نہیں رہ جاتا (تفسیر تدبر قرآن:۲۰۱)

تبصرہ:

اصلاحی صاحب نے بندروں کے معنوی مسخ کی جو بات لکھی ہے یہی سر سید احمد خان علامہ عنایت اللہ مشرقی چودھری پرویز اہل باطل کی رائے ہے۔ اصلاحی صاحب نے قرآن کی آیت کے ظاہر سے انحراف کیا اور حقیقت کے بجائے مجاز کی طرف چلے گئے کیونکہ یہ حضرات معجزاتی اور کرشماتی چیزوں سے بھاگتے ہیں۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۹

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ (بقرہ:۷۳)
ہم نے کہا کہ اس مردے کو گائے کے بعض سے مارو۔ عام مفسرین یوں لکھتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کو گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا چھوا دو جس سے وہ زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتا دے گا علامہ اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ مطلب لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے اللہ کی قدرت کاملہ سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے لیکن قسامہ کے تعلق سے کبھی

کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ قسم لینے کی طرف اشارہ ہو یعنی مقتول پر قربانی کی ہوئی گائے کا خون چھڑکو اور آس پاس والوں سے قسم لو۔ (تدبر قرآن:۲۰۵)

تبصرہ:

دراصل علامہ اصلاحی صاحب نے علامہ فراہی کے حوالہ سے اس سے پہلے صفحہ ۲۰۲ پر لکھا ہے کہ کسی مقتول کے نامعلوم قاتل کو معلوم کرنے کے لیے زمانہ قدیم سے یہ تدبیر ہوتی رہی تھی کہ مقتول کے پاس ایک گائے قربان کی جاتی تھی اور آس پاس کے کھڑے سرآوردہ لوگوں پر اس کا خون چھڑکا جاتا تھا تاکہ لوگ جھوٹی قسم کھانے سے احتراز کریں یہ قسامہ کی صورت تھی ممکن ہے بنی اسرائیل کے ہاں بھی قسامہ کی صورت میں یہ شکل اختیار کی جاتی رہی ہو۔ (تدبر قرآن ص:۲۰۳) علامہ اصلاحی صاحب اس پیچ وتاب میں گھوم پھر کر جمہور مفسرین سے الگ راستہ تلاش کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں اور مردہ کے جسم پر گائے کا ٹکڑا مار کر مردہ کے کرشماتی اور معجزاتی طور پر زندہ ہونے سے راہ فرار اختیار کر رہے ہیں اس لیے اس قصہ کو ایک ظاہری سبب قسامہ کے ساتھ جوڑ دیا ہے جو مناسب نہیں ہے اور عام مفسرین کے خلاف ہے اصلاحی صاحب نے اپنے استاذ فراہی صاحب کی پیروی کی ہے غلط راستے پر چلنے کا اشارہ انہوں نے دیا ہے۔ مولانا جلیل احسن ندوی صاحب نے بھی اصلاحی صاحب کے اس طرز پر تنقید کی ہے جو ان کی کتاب کے ص:۳۵ تا ۳۷ پر موجود ہے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۰

﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ﴾ (بقرہ: آیت:۱۰۲)

ترجمہ: ”اور اس علم کے پیچھے ہو لیے جو اترا دو فرشتوں پر بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت ہے“۔ امین اصلاحی صاحب نے کئی وجوہات ذکر کیے اور کہا کہ ہاروت و ماروت دو فرشتوں کو جو علم دیا گیا تھا وہ جادو نہیں تھا کوئی اور علم تھا پھر اس علم کی اس طرح وضاحت اور تعین کیا اور کہا

''ہمارے نزدیک اس سے مراد اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص وتاثیرات کا وہ علم ہے جس کا رواج یہود کے صوفیوں اور پیروں میں ہوا اور جس کو انہوں نے گنڈوں تعویذوں اور مختلف قسم کے عملیات کی شکل میں مختلف اغراض کے لیے استعمال کیا (تدبر قرآن:۲۴۱)

تبصرہ:

عام مفسرین نے ہاروت وماروت کے جادو کی بات لکھی ہے بطور امتحان اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اگر ایسا ہوا ہے تو اس میں کوئی حکمت پوشیدہ ہوگی پھر اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے قرآن مجید کے ظاہر کو چھوڑ کر تعویذوں اور گنڈوں کو اس کا مصداق بنانا بلا دلیل ہے اور یہ بڑا المیہ ہے کہ اصلاحی صاحب اور ان کے استاذ فراہی صاحب اور ان کا شاگرد جاوید احمد غامدی صاحب اپنی منفرد رائے پر کبھی دلیل نہیں دیتے ہیں نہ کسی مفسر کا حوالہ دیتے ہیں۔

نیز اس قسم کی تعویذات اور گنڈے بھی شرکیہ کلمات سے محفوظ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ بھی جادو ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے (جس کو قبائلی اصطلاح میں لوگ ''کوڈے'' کہتے ہیں جب اس میں بھی جادو ہے تو پھر اصلاحی صاحب دقیق نکتوں اور مخفی اشارات کا سہارا لیکر دونوں میں فرق کرنے کی لاحاصل کوشش کیوں کرتے ہیں جبکہ ان کے پاس قرآن وحدیث میں سے کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ وہ الگ رخ اختیار کرنے میں کسی دلیل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ہاں تورات وانجیل اور محرف ومنسوخ صحیفوں کے حوالہ جات دینے کا بڑا شوق رکھتے ہیں۔

مولانا جلیل احسن ندوی صاحب نے اپنی کتاب کے ص:۴۵ سے ۴۸ تک اصلاحی صاحب کے ترجمہ وتفسیر کا خوب تعاقب کیا ہے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۱

﴿مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ﴾　(بقرہ:آیت:۱۰۶)

ترجمہ: ''جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ (ترجمہ شیخ الہند)

شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں یہ بھی یہود کا طعن تھا کہ تمہاری کتاب میں بعض آیات منسوخ ہوتی ہیں اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہوتی تو جس عیب کی وجہ سے اب منسوخ ہوئی اس عیب کی خبر کیا خدا کو پہلے سے نہ تھی؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیب نہ پہلی بات میں تھا نہ پچھلی میں، لیکن حاکم مناسب وقت دیکھ کر جو چاہے حکم کرے اس وقت وہی مناسب تھا اور اب دوسرا حکم مناسب ہے (تفسیر عثمانی: ۲۰)

علامہ اصلاحی صاحب نے نسخ پر لمبا چوڑا کلام کیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ زیر نظر آیت میں نسخ کا جو ذکر ہے اس سے ادیان سابقہ کا نسخ مراد ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''سیاق وسباق اور نظم کلام کی روشنی میں ہم نے اس آیت کا تعلق صرف ادیان سابقہ سے مانا ہے اہل کتاب نے یہ اعتراض جو اٹھایا کہ قرآن جب ہماری کتابوں کو آسمانی تسلیم کرتا ہے تو ان کی تعلیمات کو منسوخ کیوں کرتا ہے؟

قرآن نے یہ ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے (تدبر قرآن: ۲۶۴)

امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنے امام معصوم حمید الدین فراہی کا حوالہ بھی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے حمید الدین فراہی صاحب کہتے ہیں ''مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ سورہ بقرہ کی زیر بحث آیت کا تعلق تمام تر ادیان سابقہ سے ہے اور اس میں جس نسخ کا حوالہ ہے اس کی ضرورت اور اس کی حکمت اس قدر واضح ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے رہا یہ سوال کہ اسلامی شریعت میں بھی نسخ ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں ہمارے یہاں تین گروہ ہیں (تدبر قرآن ص: ۲۶۹)

تبصرہ:

نسخ کے بارے میں فراہی و اصلاحی و غامدی صاحبان امت کے جمہور علماء سے بالکل الگ تھلگ راستے پر جو گامزن ہیں وہ تو ایک الگ داستان ہے لیکن یہاں ایک الگ مصیبت سامنے آ گئی کہ اس نسخ سے مراد ادیان سابقہ کا نسخ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس نے لکھا ہے اس کی دلیل کیا ہے اور اس نسخ کے قرآن میں ذکر کرنے میں فائدہ کیا ہے؟ اور اس کے بعد اس کے متبادل کی ہمیں کیا ضرورت ہے ہمارے پاس کامل و مکمل دین موجود ہے یہ کسی سے تبادلے میں ہمیں نہیں ملا ہے الحمدللہ یہ اللہ تعالیٰ نے براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا ہے یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تسلی دے رہے ہیں کہ امت محمدیہ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے یہودیت و مسیحیت اگر منسوخ ہوگئی تو تم کو اس کے بدلے میں اچھا دین ملا ہے سوال یہ ہے کہ یہودیت و مسیحیت کے منسوخ ہونے پر ہم نے افسوس کب کیا ہے ہم تو اس محرف ادیان کے منسوخ ہونے پر بہت خوش ہیں پھر تسلی کی کیا ضرورت ہے۔ اصلاحی صاحب اندھے کی لاٹھی مار رہے ہیں۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۲

﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ (بقرہ: آیت ۱۲۵)

اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ (ترجمہ شیخ الہند)

اصلاحی صاحب کا ترجمہ یہ ہے کہ حکم دیا کہ مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ۔ یہ ترجمہ غلط ہے آگے اصلاحی صاحب اس سے اپنا مطلب نکال لائے گا چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں یہاں آیت میں مقام ابراہیم کا لفظ آیا ہے مقام سے کیا مراد ہے؟ علماء تفسیر سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے ہونے

کی جگہ کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔
(تدبر قرآن: ۲۸۵)

تبصرہ:

گویا فراہی اور اصلاحی اور غامدی صاحبان کے نزدیک جو تفسیر ہے وہی صحیح ہے اس کے علاوہ تفسیر غیر صحیح ہے صحیح صرف یہی تفسیر ہے جو اصلاحی و فراہی کو پسند ہے جس سے جمہور مفسرین کی مشہور تفاسیر اور سلفاً و خلفاً امت کے اجماعی عقیدہ اور مستند تاریخ کے مستند حوالے اور صحیح احادیث کی واضح تصریحات اور حضرت ابراہیم کے قدم کے کھلے نشانات یہ سب غیر صحیح قرار پا جاتے ہیں، شاذ اقوال کے پیچھے چلنے والوں کا یہی حشر ہے۔ جواہر القرآن میں شیخ القرآن لکھتے ہیں اور مقام ابراہیم سے وہ پتھر مراد ہے جس پر کھڑے ہو کر انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی ص: ۱۶۷
علامہ روح المعانی لکھتے ہیں وَهُوَ قَوْلُ جُمْهُور الْمُسْلِمِيْنَ (روح المعانی ج ا ص: ۳۷۹)
اصلاحی صاحب اگلے صفحات پر مزید تصریح کر کے لکھتے ہیں یہاں بیت اللہ کو مصلیٰ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے تو اس سے اس گھر کے اصل مقصد تعمیر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ نماز کا مرکز ہوگا (ص: ۲۸۷)

اس عبارت سے بھی اصلاحی صاحب یہی کوشش کر رہے ہیں کہ مقام ابراہیم کی ثابت شدہ حقیقت کو لوگوں کے دلوں سے مٹا کر مسلمانوں کے اس تسلسل کو متزلزل کر دے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مقام ابراہیم کی وجہ سے بطور یادگار قائم و دائم ہے اصلاحی صاحب بلا دلیل نیا رخ اختیار کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جس پتھر کے متعلق یہ مشہور ہے، گویا لوگوں نے مشہور کیا ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۳

﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ: آیت: ۱۴۳)

ترجمہ: ''تا کہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور رسول تم پر گواہی دینے والا''۔ (شیخ الہند)

امین احسن اصلاحی نے یہاں امت محمدیہ کی گواہی دینے کو دنیا کے ساتھ خاص مانا ہے اور مفسرین پر رد کیا ہے کہ وہ اس کو آخرت کی گواہی بنا رہے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔ ہمارے ارباب تاویل (تفسیر) نے عام طور پر شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ امت گمراہوں کے خلاف انبیاء کی تائید میں آخرت میں شہادت دے گی کہ ان گمراہوں کو اللہ کا دین پہنچ چکا تھا اس کے باوجود انہوں نے گمراہی کی روش اختیار کی لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص وتحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے

(تدبر قرآن: ۳۲۱)

تبصرہ:

مسند احمد کی صحیح حدیث کو امین احسن اصلاحی کہتے ہیں کہ کوئی دلیل نہیں اس کے علاوہ دسیوں حدیثوں کو ٹھکرا رہے ہیں علامہ ابن کثیر نے مسند احمد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قیامت میں اس طرح عدالت قائم ہوگی، پھر امت محمدیہ انبیاء کرام کے حق میں گواہی دے گی پھر اس گواہی پر جرح ہوگی پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی گواہی کا تزکیہ فرمائیں گے احادیث میں آخرت کا یہ نقشہ موجود ہے اور جمہور مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر فرمائی ہے جیسا کہ تفسیر عثمانی ص: ۲۷ پر تفصیل موجود ہے کہ اس گواہی کا تعلق آخرت کے معاملات سے ہے۔ اس کے باوجود امین احسن اصلاحی اس گواہی کو دنیا تک محدود مانتے ہیں تا کہ ان احادیث کا خود بخود انکار ہو جائے جو اس بارے میں وارد ہیں۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۴۳ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ واضح طور پر اس گواہی کے لیے دلیل ہے لیکن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ اس گواہی پر کوئی دلیل نہیں قرآن وحدیث اگر دلیل نہیں ہے تو ہم اصلاحی صاحب کے لیے کہاں سے دلیل لائیں گے تورات وانجیل تو منسوخ ہو چکی ہیں۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۴

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ (بقرۃ: آیت: ۱۵۸)

بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔

علامہ اصلاحی صاحب نے اپنے استاذ فراہی صاحب کی پیروی کرتے ہوئے اس آیت میں دو غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے ایک غلطی یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مروہ کے پاس قربان کیا گیا تھا چنانچہ لکھتے ہیں مولانا فراہی نے اپنی کتاب ''الرائی الصحیح فی من هو الذبیح'' میں پوری تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ اصل قربان گاہ، جہاں حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی تھی یہی مروہ ہے جس کا ذکر تورات میں آیا ہے (تدبر قرآن ص: ۳۴۰)

تبصرہ:

اس تفسیر میں اصلاحی صاحب اور فراہی صاحب نے جمہور مفسرین و جمہور مسلمین سے الگ راستہ اختیار کیا ہے اور یہ راستہ غلط ہے کیونکہ حضرت اسماعیل کی قربان گاہ منیٰ میں ہے اور ایک حدیث میں آنحضرت نے منیٰ کے ایک کنارہ کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا ''هٰذَا مذبحٌ'' یہ قربان گاہ ہے اور آج تک مسلسل منیٰ ہی میں قربانی کی جاتی ہے کیا صدیوں سے اربوں کھربوں یہ لوگ غلطی پر چلے آرہے ہیں؟ امین اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر میں دوسری غلطی یہ کی ہے کہ صفا مروہ کے درمیان جو سعی کی جاتی ہے یہ حضرت ہاجرہ کے دوڑنے کی یادگار نہیں ہے بلکہ یہ حضرت ابراہیم کے اپنے بیٹے اسماعیل کی قربانی کی یادگار ہے اور اسی لیے وہاں سعی کی جاتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''صفا و مروہ بھی اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں ان کے شعائر میں سے ہونے کی وجہ عام طور پر تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ انہیں دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ نے حضرت اسماعیل کے لیے پانی کی تلاش میں تگ و دو کی تھی لیکن استاذ امام فراہی کا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ اصل قربان گاہ مروہ ہے یہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے حکم کی

تعمیل میں فرمانبردارانہ اور غلامانہ سرگرمی دکھائی اس وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں کو شعائر میں سے قرار دے دیا گیا اور ان کی سعی کی یادگار ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی　(تدبر قرآن:۳۴۱)

تبصرہ:

فراہی صاحب تو قرآن مجید کی تفسیر وتوضیح اور سمجھنے سمجھانے لیے سب سے پہلے تورات کی طرف جاتے ہیں وہاں کی بات کو قرآن کے لیے حرف آخر سمجھتے ہیں خواہ اس سے قرآن کی آیت میں تحریف کیوں نہ آتی ہو تعجب ہے ایک محرف اور منسوخ کتاب تورات سے غیر منسوخ اور نہایت محکم کتاب قرآن مجید کو پرکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ امین اصلاحی صاحب نے بھی اوپر لکھا ہے کہ اس کا ذکر تورات میں ہے تورات میں یہود نے اسلام کے احکامات مٹانے اور چھپانے کا بہت بڑا کام کیا ہے تا کہ اسلام کی نشاندہی غلط ثابت ہو جائے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات تک کو تورات میں تحریف کر کے بدل ڈالے ہیں اور اصلاحی صاحب تورات کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ تورات وانجیل ڈیٹ ایکسپائر ہو چکی ہیں ڈیٹ ایکسپائر دوائی کھاؤ گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۵

﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الأَهِلَّةِ﴾ (بقرہ: آیت:۱۸۹)

تجھ سے پوچھتے ہیں نئے چاند کا (ترجمہ شیخ الہند)

اصلاحی صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں وہ تم سے محرم مہینوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ اصلاحی صاحب کا یہ ترجمہ غلط ہے اور اس نے ایک خاص مقصد کے لیے یہ غلط ترجمہ کیا ہے تا کہ چاند سے بات مہینوں کی طرف لیے جائیں اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں سوال اشہر حرم اور ان کے احکام وآداب سے متعلق تھا قرآن مجید میں سائلوں کے سوالات چونکہ اجمال اور اختصار کے ساتھ نقل ہوئے ہیں اس وجہ سے عام اہل تاویل

(مفسرین) کو یہ گمان ہوا کہ یہ سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے (تدبر قرآن: ۴۲۷)

تبصرہ:

اصلاحی صاحب نے تمام مفسرین کی تفسیر کو مسترد کر دیا جنہوں نے کہا کہ یہ سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق تھا حالانکہ ان مفسرین کی تفسیر کی بنیاد صحیح احادیث پر مبنی تھی اسی طرح اصلاحی صاحب نے کئی صحیح احادیث سے دامن بچا کر آگے نکل گئے اور قوم کے سامنے غلط تفسیر رکھ دی ان کے ذہن میں ہر جگہ ربط کی فکر پڑی ہوئی ہے کہ بعد میں اشہر حرم کا تذکرہ ہوا ہے لہذا یہاں بھی بات اشہر حرم سے متعلق ہونی چاہیے امین اصلاحی اور حمید الدین فراہی نے ربط کے موہوم خیال کے تحت بہت ساری آیات میں تحریف قرآن کا ارتکاب کیا ہے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ ہے کہ یہ حضرات کسی دلیل کا حوالہ نہیں دیتے ہیں حدیث سے تو چلو ان کو شوق نہیں ہے لیکن کسی مفسر یا مؤرخ کی سند تو پیش کر دیتے تا کہ تسلی ہو جاتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات پہلے تورات وانجیل کا خوب مطالعہ کرتے ہیں پھر آ کر قرآن کی تفسیر لکھتے ہیں یہ خالص تفسیر بالرائی ہے جو بالکل حرام ہے اگر اصلاحی صاحب سے پوچھا جائے کہ اگر یہ سوال اشہر حرم کے بارے میں تھا تو ان کے جواب میں ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ کا کیا مطلب ہے یعنی سوال ہوا کہ اشہر الحرام کے کیا احکامات وآداب ہیں تو جواب ملا کہ یہ لوگوں کے اوقات کے تعین کے لیے ہیں اور حج کے اوقات کے لیے ہیں سبحان اللہ، اصلاحی صاحب کا ناقص اور ناتمام ذہنیت ان کو کہاں لے جا رہی ہے جب یہ آیت اصلاحی صاحب کے سامنے آئی تو اس میں بھی غلط ترجمہ اور مطلب بیان کیا اور کہا مطلب یہ ہے کہ یہ محترم مہینے لوگوں کی عوامی بہبود اور خاص کر حج اور عمرہ کی سہولتوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں (تدبر قرآن: ص: ۴۲۸)

دیکھنے والے دیکھیں اور پڑھنے والے پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ اصلاحی صاحب کی دانشوری اور

تفسیر کے دعوے کہاں گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص جمہور کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور ان کو غلط سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو ایسا ہی رسوا کر دیتا ہے میں اس کو رسوا نہ لکھوں تو کیا لکھوں؟ اگر خاموش رہوں تو کیسے خاموش رہوں؟ اگر لکھوں تو کیا لکھوں؟ حقیقت ظاہر کروں تو ان کا حلقہ ناراض ہو جائے گا اگر ظاہر نہ کروں تو وہ بے چارے عقیدت وعصبیت کے اندھیروں میں پڑے رہیں گے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا اِذَا اَجَابَ الْعَالِمُ تَقِیَّةً وَالْجَاهِلُ یَجْهَلُ فَاَنّٰی یَتَبَیَّنُ الْحَقُّ یعنی جب عالم کھل کر جواب نہ دے اور عوام بے خبر ہیں تو حق کس طرح واضح ہوگا۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۶

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجاً غَیْرَهٗ﴾ (بقرہ: ۲۳۰)

ترجمہ: ’’پھر اگر اس عورت کو طلاق دی (یعنی تیسری بار) تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا (شیخ الہندؒ)

اصلاحی صاحب نے بھی اس آیت کا ترجمہ قریب قریب اسی طرح کیا ہے لیکن آیت کی تفسیر میں اس نے جمہور امت کے خلاف راستہ اختیار کیا ہے ان کے نزدیک اس مطلقہ نے اگر نکاح کیا تو پہلے شوہر کے لیے جماع کے بغیر حلال ہو جائے گی صرف نکاح ضروری ہے جماع ضروری نہیں۔

چنانچہ اصلاحی صاحب لکھتے ہیں ﴿حتی تنکح زوجاً غیرہٗ﴾ میں نکاح کا لفظ ہمارے نزدیک عقد نکاح ہی کے معنی میں ہے جن لوگوں نے اس کو وطی کے معنی میں لیا ہے انہوں نے ایک غیر ضروری سا تکلف کیا ہے۔　　(تدبر قرآن: ۴۹۳)

اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ رہی یہ بات کہ ایسی عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے صرف اس صورت میں جائز ہو گی جب اس کا دوسرا شوہر اس کو وطی کے بعد طلاق دیدے تو کم از کم اس وطی کے لیے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں نکلتا ’’تنکح‘‘ کے لفظ سے جو دلیل دی جاتی ہے اس کا بے بنیاد ہونا جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا بالکل واضح ہے یہ مسئلہ در حقیقت پیدا ایک حدیث کی بنیاد

پر ہوا ہے قرآن سے اس کے لیے استدلال تو محض نکتہ بعد الوقوع ہے لیکن ہمارے نزدیک حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ بھی نہایت کمزور ہے۔ (تدبر قرآن: ص:494)

اصلاحی صاحب کا خیال ہے کہ اگر دوسرے شوہر کے نکاح کے ساتھ جماع کی شرط لگائی گئی تو یہ حلالہ یا متعہ کی مکروہ صورت بن جائے گی اصلاحی صاحب نے حلالہ پر شدید اور رکیک حملے کر دیئے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اسی طرح اگر کوئی شخص اس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ اس نکاح کے بعد طلاق دیکر وہ اس عورت کو اس سے پہلے شوہر کے لیے جائز ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔

جو شخص کسی کی مقصد برآری کے لیے یہ ذلیل کام کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک قرم ساق یا بھڑوے یا کرایہ کے سانڈ کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کرنے والے اور ایسا کرانے والے پر اللہ کی لعنت ہے یہ مسئلہ درحقیقت ایک حدیث کی بنا پر پیدا ہوا ہے لیکن ہمارے نزدیک حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ بھی نہایت کمزور ہے (تدبر قرآن: 494)

تبصرہ:

علامہ اصلاحی صاحب حلالہ کی بحث وتحقیق میں کچھ زیادہ جذباتی ہوگئے ہیں یہاں تک کہ حلالہ کرنے والے کو بھڑوا قرم ساق کرائے کا سانڈ ذلیل ملعون ومغضوب بھڑواپن تیس مستعار شریعت الٰہی کا مذاق اڑانے والا جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ جاوید غامدی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی الفاظ دہرائے ہیں۔ حلالہ سے متعلق احادیث میں بیشک تنبیہات اور سخت الفاظ ملتے ہیں لیکن فقہاء اور علماء نے اس کو حلالہ کی ان ناجائز صورتوں پر محمل کیا ہے جس میں ناجائز شرائط رکھی جاتی ہیں اور حلالہ ایک کاروبار وتجارت کی شکل اختیار کر جاتا ہے لیکن اگر ان ناجائز شرائط سے حلالہ خالی ہو تو اس پر اصلاحی صاحب آپے سے اتنے باہر کیوں ہوگئے؟

بہر حال اصلاحی صاحب بتائیں کہ قرآن عظیم میں ''فَلَاتَحِلُّ'' کے الفاظ کا ترجمہ کیا ہے اگر ترجمہ یہ ہے کہ اس طلاق کے بعد وہ عورت اس شوہر کے لیے حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے، اب حلال کا لفظ قرآن کی آیت میں مذکور ہے اسی سے حلالہ کا لفظ لیا گیا ہے کہ دوسرے شوہر سے نکاح و جماع کے بغیر یہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوسکتی ہے عورت کے حلال ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہی صورت بتادی ہے اب اگر کوئی شخص حماقت کی بنیاد پر غلط شرائط عائد کرتا ہے۔ تو یہ ان کا اپنا قصور ہے اس پر اصلاحی صاحب غصہ کیوں ہوتے ہیں؟ ان کو چاہیے تھا کہ اصل غصہ اس شوہر پر اتار دیتے جس نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑا اور ایک یا دو طلاقوں پر صبر نہ کیا بلکہ تمام حدود پھلانگ کر تین طلاق دے ڈالا اب شریعت نے ان کو بطور سزا یہ حکم دیا کہ تیری بیوی اب تیرے لیے حرام ہے ہاں اگر کوئی دوسرا شخص عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کرے اور پھر اپنی مرضی سے اس کو طلاق دیدے اور عدت گزرنے کے بعد سابق شوہر اس کے ساتھ نکاح و جماع کرے تو یہ جائز صورت ہے اور عہد نبوی میں اس طرح صورتیں پیش آئی ہیں اگر اصلاحی صاحب اس طرز سے ناراض ہیں تو وہ بتائیں کہ اس آیت کا مطلب کیا ہے اور یہ آیت مسلمانوں کو کیا تعلیم دے رہی ہے؟

مفسرین و محدثین و فقہاء و علماء ایک رُخ پر جا رہے ہیں اور اصلاحی صاحب نے اپنے لیے الگ رخ اختیار کیا ہوا ہے اور غلطیاں کر رہے ہیں یہ تو خیر ضمنی باتیں تھیں دراصل یہاں اس آیت کی تفسیر میں امین اصلاحی صاحب نے آزاد منش لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایک عجیب نوید سنائی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں صرف نکاح کا ذکر ہے دوسرے شوہر سے جماع کی شرط کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کوئی دلیل ہے اصلاحی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے اور وہ دانستہ طور پر غلط راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں علامہ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت سولہ روایات کو ذکر کیا ہے جس میں رفاعہ قرظی کی بیوی کا قصہ ہے وہ مطلقہ مغلظہ ہوچکی تھی پھر اس نے عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی سے نکاح کیا مگر وہ جماع میں کمزور تھا یہ

عورت اپنے پہلے شوہر کی طرف لوٹنا چاہتی تھی اس نے جب مسئلہ پوچھا تو آنحضرت نے سختی سے منع کیا اور فرمایا کہ جب تک تم دونوں نکاح کے بعد ایک دوسرے سے جماع کا لطف نہ اٹھاؤ تم پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی ہو اصلاحی صاحب سے پوچھا جائے کہ میاں بیوی کے نکاح کے بعد جماع نہ کرنے پر آپ کس طرح پہرہ بٹھاؤ گے کہ نکاح تو ہو مگر جماع نہ ہو؟

بہر حال صحاح ستہ اور سنن کی کتابوں میں یہ قصہ مذکور و مشہور ہے بخاری و مسلم نے اس کو سند کے ساتھ ذکر کیا ہے حتی کہ یہ حدیث بھی حدیث عُسیلہ کے نام سے مشہور ہے یعنی ایک دوسرے کا شہد چھکنا، اس کے باوجود اصلاحی صاحب کہتے ہیں کہ جماع کے لیے یہاں کوئی دلیل نہیں اور نکاح کے بعد جماع کی قید یہ بے جا تکلف ہے علامہ ابن کثیرؒ نے سولہ روایات ذکر کیے ہیں کیا وہ کوئی دلیل نہیں ہیں؟ تمام فقہاء وعلماء ومحدثین کا متفقہ فیصلہ اور فتویٰ کیا وہ دلیل نہیں ہے؟ بخاری و مسلم کی روایت کیا دلیل نہیں ہے؟ اصلاحی صاحب نے اس سے استدلال کو کمزور قرار دیا ہے یہ اصلاحی صاحب کی اپنی کمزوری اور ہٹ دھرمی اور نہایت ضد ہے درحقیقت اصلاحی صاحب چونکہ احادیث کو نہیں مانتے ہیں اس لیے اس کے فیصلے کو کمزور کہہ دیا یہ لوگ اپنے مطلب نکالنے کے لیے کبھی کسی ضعیف حدیث کو بھی قبول کر لیتے ہیں وہاں صرف اپنا مطلب نکالنا ہوتا ہے لیکن جب کئی کئی احادیث موجود ہوں تو تعجب اس پر ہے کہ حدیث کی طرف التفات بھی نہیں کرتے ہیں اور تورات وانجیل اور اسرائیلیات کے منسوخ اور محرف حوالے جمع کر کے طُومار بھر دیتے ہیں مجھے مفتی سعید خان صاحب ندوی مدظلہ نے بتایا کہ میں نے اصلاحی صاحب کو دیکھا ہے ملاقات کے موقع پر اصلاحی صاحب نے کہا کہ اگر مجھے ابن شہاب زہری رحمہ اللہ مل جائے تو میں اس کو ذبح کر کے کباب بنادوں گا یاد رہے کہ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ حدیث کے امام اور سند حدیث کی جڑ ہے اس کو اصلاحی صاحب ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ تو حدیث کیا رہ گئیں۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۷

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ (بقرہ:۲۴۳)

ترجمہ شیخ الہند: کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے پھر فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا۔

شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں ''یہ پہلی امت کا قصہ ہے کہ کئی ہزار شخص گھر بار کو ساتھ لیکر وطن سے بھاگے ان کو ڈر ہوا تھا غنیم (دشمن) کا اور لڑنے سے جی چھپایا، یا ڈر ہوا تھا وبا کا اور تقدیر پر توکل اور یقین نہ کیا پھر ایک منزل پر پہنچ کر بحکم الٰہی سب مر گئے پھر سات دن کے بعد پیغمبروں کی دعاء سے زندہ ہوئے کہ آگے کو توبہ کریں (تفسیر عثمانی:۵۰)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بشمول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کئی مفسرین سے جن میں تابعین بھی شامل ہیں کچھ فرق کے ساتھ اسی طرح قصہ نقل کیا ہے جس طرح اوپر شیخ الہند کی تفسیر میں ہے ان تمام حضرات نے ان لوگوں کی موت اور پھر حیات کو حقیقی موت وحیات پر حمل کیا ہے اور قرآن کے ظاہری الفاظ بھی اسی طرح ہیں لیکن جناب اصلاحی صاحب نے اس موت وحیات کو مجاز پر حمل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قوموں کے عروج وزوال کی طرف اشارہ ہے حقیقی موت مراد نہیں ہے چنانچہ علامہ اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

موت کے لفظ پر اسی سورت کی آیت ۵۶ کے تحت ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ جس طرح زندگی کے فنا ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے اسی طرح نیند بیہوشی اور اخلاقی وایمانی موت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اسی طرح حیات کا لفظ بھی مادی زندگی سے لیکر نیند سے بیداری اور ایمانی واخلاقی زندگی تک سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (تدبر قرآن ص:۵۱۹)

علامہ اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں، ہمارے نزدیک تاریخ بنی اسرائیل کا یہی جزو ہے جس کی

طرف آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جب انہوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ایمانی موت کے حوالہ کر دیا جس کی تعبیر "مُوْتُوْا" سے فرمائی ہے پھر جب ان کے اندر تجدید و احیائے ملت کی دعوت اٹھی اور انہوں نے از سر نو ایمان و اسلام کی حیات تازہ اختیار کر لینے کا عزم کر لیا تو اللہ نے ان کو از سر نو زندہ و متحرک کر دیا اسی چیز کو یہاں "ثُمَّ اَحْیَاھُمْ" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے (تدبر قرآن ص:۵۲۱)

تبصرہ:

ناظرین دیکھ لیں اصلاحی صاحب حقیقی مفہوم کو چھوڑ کر کس طرح مجاز کی طرف جا رہے ہیں حالانکہ ان حضرات کا بہت زور و شور سے یہ دعویٰ مشہور ہے کہ قرآن اپنے ظاہر پر ہی حمل کیا جائے گا یہ بیان و تبیان اور برھان و نور مبین ہے یہ اپنا سارا مفہوم اپنے ہی الفاظ کے اندر رکھتا ہے یہ میزان ہے اس پر سب اشیاء کو تولا جائے گا فراہی صاحب کا بھی یہی دعویٰ ہے اور غامدی و امین احسن اصلاحی صاحب کا بھی یہی دعویٰ ہے۔

اب ان حضرات سے پوچھا جائے کہ یہاں اصلاحی صاحب کہاں جا رہے ہیں آخر ان کے پاس قرآن و حدیث سے کونسی دلیل ہے مفسرین اور فقہاء کا کونسا قول اور فتویٰ ان کے پاس ہے تاریخ کا کونسا مستند واقعہ ان کے پاس ہے؟

پھر اس جرأت کو دیکھیں کہ اس بے سروسامانی کے باوجود بڑے جوش و خروش سے اپنے سوا سب کو غلط قرار دیتے ہیں اور تورات وانجیل سموئیل تالمود یوحنا لوقا اور سابقہ منسوخ اور محرف صحیفوں سے استدلال لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دراصل ان حضرات کے نزدیک معجزات و کرامات اور کرشماتی امور کی زیادہ وقعت نہیں ہے لہذا یہاں بھی اس معجزاتی اور کرشماتی موت و حیات سے بچنے کے لیے انہوں نے ایک ظاہری سبب پیدا کر دیا اور اس کو لکھ ڈالا مولانا اصلاحی صاحب نے یہاں ترجمہ بھی غلط کیا ہے چنانچہ آیت "فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا"۔ کا ترجمہ یوں کیا ہے تو اللہ

نے ان کو کہا جاؤ مر جاؤ، سوال یہ ہے کہ جاؤ مر جاؤ کس لفظ کا ترجمہ ہے جاؤ کے لیے عربی میں اذھب آتا ہے یہاں اذھب کہاں ہے دراصل اصلاحی صاحب نے یہ ترجمہ ڈانٹ کے انداز میں پیش کیا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے ان کو موت نہیں دی بلکہ فرمایا جاؤ مر جاؤ، یہ ڈانٹ اسی طرح ہے جس طرح کوئی غصہ کی حالت میں کسی سے کہتا ہے جاؤ دفع ہو جاؤ۔

محترم قارئین:

یہاں تک میں نے امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن میں صرف سورۃ بقرہ کی قابل گرفت چیزوں کا ذکر کیا یہ موٹی موٹی چیزیں ہیں جس میں اصلاحی صاحب نے مفسرین اور جمہور امت سے الگ راستہ اختیار کیا اور غلط راستے پر چل پڑے ہیں رہ گیا ان کے ترجمہ کا معاملہ تو وہ بالعموم ناقابل اعتماد ہے کیونکہ اصلاحی صاحب نے قرآن عظیم کے الفاظ وکلمات کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ اپنے محاورہ کا خیال رکھا ہے نیز اصلاحی صاحب کی تفسیر میں اگر چھوٹے چھوٹے نکات کا تعاقب کیا جائے تو بہت ساری غلطیاں ظاہر ہو جائیں گی۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ نے اپنی کتاب ''تدبر قرآن پر ایک نظر'' میں صرف سورہ بقرہ میں امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر اور ترجمہ پر ستائیس اعتراضات کیے ہیں اور پوری تفسیر کے اہم مقامات پر ۲۷ اعتراضات کیے ہیں۔ میں نے اختصار سے کام لیا ہے اور صرف سورۃ بقرہ میں سترہ مقامات پر مؤاخذات کیے ہیں اور سورۃ ال عمران کی غلطیاں ملا کر اکیس غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور کھل کر ان مناقشات کا ذکر کیا ہے مقصود یہ ہے کہ عام مسلمان اور خصوصاً علماء کرام اور طلبہ عزیز اصلاحی صاحب کی تفسیر پُر تقصیر ''تدبر قرآن'' سے اجتناب کریں۔ وباللہ التوفیق۔ اصلاحی صاحب قدم بقدم اپنے استاذ حمید الدین فراہی کے نقش قدم پر گامزن ہیں لہذا یہ غلطیاں اوپر سے مسلسل آگئی ہیں اور پھر جاوید احمد غامدی صاحب ان غلطیوں کو مکمل طور پر قبول کرتے چلے گئے ہیں لہذا یہ غلطیاں نیچے تک تسلسل کے ساتھ چلی گئیں ہیں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ آلِ عمران

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۸

﴿هُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْکِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (ال عمران: آیت: ۷)

ترجمہ: وہی (اللہ) ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیتیں ہیں محکم یعنی ان کے معنی واضح ہیں وہ اصل ہیں کتاب کی اور دوسری ہیں متشابہ یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

تفسیر عثمانی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں نصاریٰ نجران نے تمام دلائل سے عاجز ہو کر بطور معارضہ کہا تھا کہ آخر آپ حضرت مسیح کو ''کلمة الله'' اور ''روح الله'' مانتے ہیں بس ہمارے اثبات مدعا کے لیے یہ الفاظ کافی ہیں یہاں اس کا تحقیقی جواب ایک عام اصول اور ضابطہ کی صورت میں دیا جس کے سمجھ لینے کے بعد ہزاروں نزاعات و مناقشات کا خاتمہ ہو سکتا ہے اس کو یوں سمجھو کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں ایک وہ جن کی مراد معلوم و متعین ہو ایسی آیات کو محکمات کہتے ہیں اور فی الحقیقت کتاب کی ساری تعلیمات کی جڑ اور اصل اصول یہی آیات ہوتی ہیں دوسری قسم آیات ''متشابهات'' کہلاتی ہے یعنی جن کی مراد معلوم و متعین کرنے میں اشتباہ و التباس واقع ہو جائے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس دوسری قسم کی آیات کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہیے مگر خبردار! ایسی تاویلات اور ہیر پھیر نہ کریں جو مذہب کے اصول مسلمہ اور آیات محکمہ کے خلاف ہوں۔ مثلاً قرآن حکیم نے مسیح علیہ السلام کی نسبت تصریح کر دی ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ﴾

یا ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ یا ﴿ذٰلِکَ قَوْلُ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحَانَهٗ﴾ اب ایک شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کر کے ﴿کَلِمَةُ اَلْقَاهَا اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اس کے وہ معنی چھوڑ کر جو محکمات کے موافق ہوں ایسی سطحی معنی لینے لگے جو کتاب کی عام تصریحات اور متواتر بیانات کے منافی ہوں یہ کجروی اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہوگی۔

(تفسیر عثمانی مختصراً ص:۶۴)

تفسیر جواہر القرآن میں شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ کتاب تو خدا ہی نے نازل کی ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق روح اللہ اور کلمۃ اللہ کے الفاظ موجود ہیں مگر اس کی (کتاب کی) آیتیں اپنے مفہوم و معنیٰ کے اعتبار سے دو قسم کی ہیں ایک محکم دوم متشابہ محکم تو وہ ہیں جن کا معنی متفق علیہ اور مفہوم معقول اور قابل فہم ہو۔ اور متشابہ وہ ہیں جن کی تاویل مختلف فیہ ہو اور ان کا ظاہر فہم سے بالا ہو مثلاً حروف مقطعات اور ید اللہ، روح اللہ، اور کلمۃ اللہ وغیرہ۔ المعتصر من مختصر مشکل الآثار طحاوی ج ۲ ص:۱۶۴ میں مذکور ہے: اَلْمُحْکَمَاتُ هِیَ الْمُتَّفَقُ عَلٰی تَاوِیْلِهَا وَالْمَعْقُوْلُ مَعْنَاهَا وَالْمُتَشَابِهَاتُ هِیَ الْمُخْتَلَفُ فِیْ تَاوِیْلِهَا یعنی محکمات آیات وہ ہیں جن کی تفسیر پر اتفاق ہو اور اس کا معنی سمجھ میں آرہا ہو اور متشابہات وہ آیات ہیں جن کی تفسیر میں احتمالات ہوں۔ علامہ روح المعانی ﴿هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ﴾ کے تحت لکھتے ہیں: اَیْ أصلہ وَالعمدة فِیه یَرد اِلیها غَیرها (روح المعانی ج ۲ ص:۸۰)

یعنی ام الکتاب سے مراد یہ ہے کہ یہ محکمات قرآن میں اصل ہیں اور عمدہ قابل اعتماد یہی ہیں اس کے علاوہ جو متشابہات ہیں وہ آیات ان محکمات کی طرف لوٹا کر سمجھنا پڑے گا۔

تفسیر ابن کثیر میں حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کے تحت مفسرین کے بہت

سارے اقوال نقل کیے ہیں یہ کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ علم کی وسعت ہے ایک عالم کے ہاتھ میں بہت سارے مطالب آجاتے ہیں وہ خود بہتر سے بہتر کا انتخاب کرسکتا ہے ان تمام اقوال کی روشنی میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے جو کلام پیش کیا ہے اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو: اللہ تعالیٰ ہمیں خبر دے رہا ہے کہ قرآن مجید میں ایک قسم کی آیات محکمات ہیں جو قرآن کے لیے بحیثیت بنیاد اور جڑ ہیں محکمات کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مدلولات اور معانی میں بالکل واضح ہیں اس میں کوئی اشتباہ والتباس نہیں ہے اور اس قرآن میں کچھ ایسی آیات ہیں جن کے مطالب ومعانی میں لوگوں کے لیے اشتباہ والتباس کا موقع ہے پس جس شخص نے ان متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹا دیا اور محکمات کو متشابہات پر حَکَم اور فیصل بنا دیا تو وہ شخص ہدایت پر قائم رہا اور جس نے اس کا عکس کیا تو وہ ہدایت سے گر گیا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ محکم آیات کتاب اللہ کی وہ جڑ ہے جس کی طرف اشتباہ کے وقت رجوع کیا جاتا ہے اور کچھ آیات متشابہ ہیں یعنی اس کا مدلول کبھی محکمات کے موافق ہونے کا احتمال بھی رکھتا ہے اور کبھی کسی اور چیز کا احتمال بھی رکھتا ہے مگر یہ اشتباہ ہمارے لیے الفاظ اور ترکیب کی حد تک ہے اصل معانی اور مقاصد میں اشتباہ نہیں ہوتا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص: ۳۴۴)

بہر حال علماء اصول اور محققین علماء نے یہ فرمایا ہے کہ متشابہات خود دو قسم پر ہیں ایک قسم وہ متشابہات ہیں جو نہ معلوم المعنی ہیں اور نہ معلوم المراد ہیں جس طرح بعض سورتوں کی ابتداء میں حروف مقطعات ہیں اس کے لیے سلف صالحین کے مفسرین نے یہ جملہ اختیار کیا ہے ''اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذَالِكَ''۔ یعنی اس کے اصل معنی کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے ہمارا اس پر ایمان ہے علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بھید اور راز ہے قیامت میں یہ راز کھلے گا دنیا میں ان حروف کا مطلب جس نے بھی بیان کیا ہے وہ ایک احتمالی مفہوم ہے یقینی مفہوم کسی کو معلوم نہیں متشابہات کی دوسری قسم وہ ہے جو معلوم المعنی تو ہے لیکن معلوم المراد نہیں ہے جیسے ''ید اللہ'' اللہ کا ہاتھ ''وجہ اللہ'' اللہ کا چہرہ ''ساق اللہ'' اللہ کی پنڈلی ''جاء

ربک،" تیرا پرودگار آ گیا" استوی علی العرش "اللہ تعالیٰ عرش پر سیدھے بیٹھ گئے۔
ان متشابہات کے معانی تو ظاہر ہیں لیکن اس کی حقیقت اور مرادی معنی ظاہر نہیں ہیں اسی لیے سلف صالحین کے نزدیک یہ فیصلہ ہے کہ اس پر ایمان لانے کے لیے یہ کہنا پڑے گا "ما یلیق بشانہ" یعنی جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے ہمارا اس پر ایمان ہے یہ کلام اہل حق علماء اور مفسرین کا ہے جو میں نے محنت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے استویٰ علی العرش متشابہ کو ذکر کیا اور پھر یہ فیصلہ سنا دیا اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْکَیْفِیَّۃُ مَجْھُوْلَۃٌ وَالسُّوَالُ عَنْھَا بِدْعَۃٌ:
ترجمہ: "عرش پر استواء کا معنی تو معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت اور حقیقت معلوم نہیں ہے اور ان متشابہات سے سوال کرنا اور اس میں گھسنا بدعت ہے۔
اب امین احسن اصلاحی صاحب کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ وہ متشابہات کے بارے میں سارے مفسرین سے الگ ہو کر کیا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:
متشابھات: متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کے دسترس سے باہر کی باتیں تمثیلی و تشبیہی رنگ میں قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ بجائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے، عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ اس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تا کہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں اور ان کی اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کریں۔ یہ باتیں خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں اور اس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ ان کا جس حد تک ہمارے لیے سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ

انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اس کے اندر چبھا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اور نہایت واضح حقائق کی اس لیے تکذیب کر دیتا ہے کہ ان کی شکل وصورت ابھی اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔

ہم یہاں قرآن سے اس قسم کے بعض متشابہات کی مثالیں نقل کرتے ہیں۔ سورۃ مدثر میں قرآن نے دوزخ کے عذاب کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

﴿سَأُصْلِيهِ سَقَرَ. وَمَآ اَدْرٰاكَ مَا سَقَرُ. لَاتُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ. لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ. عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾

میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا اور تمہیں کیا پتہ کہ دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز کو چھوڑے گی، جسموں کو جھلس دینے والی ہوگی۔ اس پر خدا کے انیس سرہنگ مقرر ہوں گے۔ انتہی۔ اس آیت میں جس سزا کا ذکر ہے وہ ایک حقیقت ہے اور قانون مجازات پر جس کا ایمان ہو اس کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، رہی اس کی تفصیل تو اس کا تعلق چونکہ ایک نادیدہ عالم سے ہے اس وجہ سے اس کی اصل صورت کسی طرح ہماری گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس طرح کے معاملات میں صحیح روش یہ ہے کہ آدمی اتنے پر قناعت کرے جو سمجھ میں آتا ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا وہ اس عالم میں سمجھ میں آہی نہیں سکتا، اس وجہ سے اس کے درپے ہونے کے بجائے اس کو خدا کے حوالے کرے۔ (تدبر قرآن ج ا ص ۶۲۷ و ۶۲۸)

علامہ امین احسن اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں:

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیات متشابہات سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں یا تو آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت و نقمت کا بیان تمثیلی و تشبیہی رنگ میں ہوا ہے یا خدا کی صفات و افعال میں سے کوئی بات تمثیلی اسلوب میں پیش ہوئی ہے۔ مثلاً آدم میں خدا کا اپنی روح پھونکنا یا حضرت عیسیٰ کو بن باپ کے پیدا کرنا وغیرہ۔ اس طرح کی آیات سے، جیسا کہ

اوپر بیان ہوا، اہل ایمان کے علم وایمان میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہوتی ہے وہ انہی کے اندر موشگافیاں کر کے بہت سے فتنے پیدا کر لیتے ہیں۔

(تدبر قرآن ج ۱ ص ۶۲۹ و ۶۳۰)

تبصرہ:

متشابہات سے متعلق اس کلام میں اصلاحی صاحب نے کئی غلطیاں کی ہیں پہلی غلطی تو وہی بنیادی غلطی ہے کہ اصلاحی صاحب نے عام مفسرین اور سلف وخلف علماء وفقہاء کو چھوڑ کر متشابہات میں الگ راستہ اختیار کیا ہے جیسا کہ ان کی ان تحریرات سے واضح ہے جو اوپر نقل کی گئی ہیں اصلاحی صاحب نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اس نے متشابہات اور مشابہات کو ایک چیز سمجھ لیا ہے حالانکہ متشابہات تو اشتباہ سے ہے جس میں التباس اور شبہ ہو اور مطلب واضح نہ ہو اور مشابھات تو مشابہت کے معنی میں ہے کہ فلاں چیز فلاں چیز کے مشابہ ہے۔ قرآن کے مضامین واحکامات فصاحت وبلاغت میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اسی کو سورۃ زمر میں ﴿کِتَـابًـا مُّتَشَـابِهًـا مَّثَـانِيَ﴾ (زمر آیت: ۲۳) سے یاد کیا گیا ہے اصلاحی صاحب نے یا تو اپنے مطلب نکالنے کے لیے دونوں کو ایک ہی چیز قرار دی ہے یا دھوکہ دہی کے لیے دونوں کو ایک کر کے پیش کیا ہے حالانکہ مفسرین نے دونوں کو الگ الگ مفہوم میں لیا ہے اصلاحی صاحب نے تیسری غلطی یہ کی ہے کہ اس نے مغیبات کو متشابہات قرار دیا ہے اور اوپر کی عبارتوں میں کہا ہے کہ جو چیزیں نادیدہ نایافتہ اور ہمارے دسترس سے باہر ہیں آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں سے اس کا تعلق ہے پوری طرح مشاہدہ میں نہیں آتیں اور عقل کے احاطہ سے بھی باہر ہیں اس کو جتنا ہم نے سمجھا اسی حد تک اس پر اکتفا کرنا چاہیے آگے نہیں جانا چاہیے۔

اصلاحی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ مثلاً دوزخ کا جتنا بیان آ گیا سو آ گیا ہے اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہیے تفصیل متشابہات کی قسم میں سے ہے اصلاحی صاحب کی یہ بات صحیح ہے لیکن اس میں

کس نے اختلاف کیا ہے اور اس کو کس نے متشابہات کہا ہے یہ تو مغیبات کی قسم کی اشیاء ہیں جن پر ایمان بالغیب ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اصلاحی صاحب نے اپنے مذکورہ عبارت میں متشابہات کے لیے سورت مدثر کی آیات ﴿سَاُصْلِيْهِ سَقَر﴾ کو پیش کیا ہے یہ استدلال غلط ہے اس آیت میں تو سقر کے عذاب کا ذکر ہے جو مغیبات کے قبیل سے ہے نیز زیر بحث آیت میں جو کچھ ہے یہ تو مغیبات میں سے بھی نہیں کیونکہ اس میں ﴿وَمَآ اَدْرَاكَ﴾ کا لفظ ہے اور جیسے ﴿وَمَا اَدْرَاكَ مَا هِيَ. نَارٌ حَامِيَةٌ﴾ اور جیسے ﴿وَمَا اَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ. النَّجْمُ الثَّاقِبُ. وَمَا اَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ﴾ یہاں ﴿وَمَا يُدْرِيْكَ﴾ نہیں ہے پہلی قسم کے تلفظ میں اللہ تعالیٰ تفصیل بتاتا ہے جس طرح مذکورہ آیت میں بتا دیا ہے کہ سقر کیا چیز ہے اور دوسری قسم کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ بتاتا نہیں ہے کیونکہ وہ مغیبات کی قسم ہوتی ہے جیسے: ﴿وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا﴾ (احزاب آیت:۶۳)

مذکورہ بالا استشہاد میں اصلاحی صاحب کو بڑی غلطی ہوئی ہے متشابہات کے بارے میں اصلاحی صاحب کی بنیادی غلطی وہی ہے کہ ان کا خیال ہے کہ قرآن میں کوئی آیت کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو بالکل واضح نہ ہو کیونکہ ابہام واجمال اس کلام عربی مبین میں نہیں ہے۔

جب اس نے دیکھا کہ متشابہات میں وضاحت نہیں ہے بلکہ ابہام واجمال والتباس ہے تو اس نے متشابہات کو ایسا معنی پہنا دیا کہ متشابہات کی شکل ہی کو مسخ کر کے رکھ دیا اگر اصلاحی اور ان کے احباب جمہور امت سے الگ راستہ اختیار نہ کرتے تو یہ پریشانی نہ ہوتی۔ اصلاحی صاحب نے اپنی ایک عبارت میں متکلمین پر اس طرح رد کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ متشابہات ہوں یا محکمات، قرآن میں یہ دونوں قسمیں ممیّز اور معلوم ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، جیسا کہ بعض متکلمین نے گمان کیا ہے کہ یہ دونوں غیر ممیّز ہیں اور نہ یہ بات ہے کہ الفاظ کی اپنی معانی پر دلالت کوئی مشتبہ اور مشکوک چیز ہے۔ جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے انہوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ ان میں سے پہلی بات تو صریحاً غلط ہے اور دوسری بات نہایت مبہم ہے

جو سرے سے قرآن ہی سے مایوس کر دینے والی ہے حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور و برہان بنا کر اتارا ہے۔ جو باتیں عالم غیب سے تعلق رکھنے والی ہیں ان کے متعلق خدا نے ہماری ضرورت کی حد تک خبر دے دی ہے، اس کا جو حصہ ہم سے محجوب رکھا گیا ہے بس اس کی تاویل پردۂ خفا میں ہے۔ (تدبر قرآن ج ۱ ص: ۶۳۱)

تبصرہ:

اصلاحی صاحب کی یہ بات بالکل غلط ہے کہ قرآن میں محکمات اور متشابہات دونوں ممیّز ہیں یعنی واضح اور معلوم اور الگ الگ انداز سے قابل فہم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محکمات واضح اور محکم ہیں اور متشابہات غیر واضح اور مبہم نا قابل فہم ہیں قرآن کے الفاظ خود اس پر دال ہیں باقی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کن متکلمین نے دونوں کو غیر ممیّز اور غیر معلوم کہا ہے یہ قول صریحاً غلط ہے کہ محکمات کو غیر معلوم کہا جائے۔ اصلاحی صاحب کو حوالہ دینا چاہیے تھا مگر یہ بادشاہ لوگ ہیں بغیر دلیل اور بغیر حوالہ لکھتے چلے جاتے ہیں ہماری معلومات کی حد تک اسلامی متکلمین کا وہی موقف ہے جو میں نے ابن کثیر کے حوالہ سے پہلے لکھدیا ہے۔

اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ الفاظ قرآن کی اپنے معانی پر دلالت کوئی مشتبہ چیز نہیں ہے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ حروف مقطعات کا مطلب آپ کے نزدیک کس حد تک واضح غیر مشتبہ ہے اگر ایسا ہے تو آپ وضاحت کریں کہ سورتوں کی ابتداء میں ان مقطعہ حروف کا مطلب کیا ہے اور ﴿یَدُ اللّٰہِ﴾ اللہ کے ہاتھ، کا معنی مراد کیا ہے؟ اور اس کی تفصیل کیا ہے؟

حروف مقطعات کے معنی اگر اصلاحی صاحب نے بتادیئے تو امت کو بڑی خوشی ہوگی اور بڑے مشکلات حل ہوجائیں گے۔ اصلاحی صاحب نے اپنے مذکورہ عبارت میں پھر اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ متشابہات کا تعلق عالم غیب سے ہے جتنا سمجھ میں آگیا سو آگیا جو نہیں آیا اس میں توقف کیا جائے میں پھر کہتا ہوں کہ اصلاحی صاحب نے دانستہ طور پر التباس پیدا کیا ہے کہاں عالم غیب

کی مغیبات کی بات اور کہاں متشابہات کی بات دونوں کو ایک کرنا بہت ہی غلط اقدام ہے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۱۹

﴿لَايَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران ۲۸)

ترجمہ: ’’نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر (ترجمہ شیخ الہندؒ)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں ’’نَهٰى تَبَارَكَ وَتَعَالٰى عِبَادَهُ الْمُؤْمِنِيْنَ ‘‘ الخ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو روک دیا ہے کہ وہ کافروں سے محبت کریں اور مسلمانوں کو چھوڑ کر خفیہ طور پر کافروں سے دوستی کریں (ابن کثیر ج اص: ۳۵۷)

شیخ القرآن جواہر القرآن میں لکھتے ہیں اس آیت میں مسلمانوں کو کافروں سے قطع تعلق کا حکم دیا جا رہا ہے پہلے بیان فرمایا کہ مالک الملک معزّ ومذلّ اور قادر مطلق صرف اللہ ہی ہے اس لیے اسی پر بھروسہ رکھو اور ان کافروں کی پرواہ نہ کرو۔ (جواہر القرآن ج اص: ۱۴۹)

علامہ عثمانی لکھتے ہیں ’’یعنی جب حکومت وسلطنت جاہ وعزت اور ہر قسم کے تعلقات وتصرفات کی زمام اکیلئے خداوند قدوس کے ہاتھ میں ہوئی تو مسلمانوں کو جو صحیح معنوں میں اس پر یقین رکھتے ہیں شایان شان نہیں کہ اپنے اسلامی بھائیوں کی اخوت ودوستی پر اکتفانہ کر کے خواہ مخواہ دشمنان خدا کی موالات ومداراۃ کی طرف قدم بڑھائیں خدا اور رسول کے دشمن ان کے دوست کبھی نہیں ہو سکتے ہیں‘‘۔ (تفسیر عثمانی ص: ۶۸)

صاحب روح المعانی علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حجاج بن عمرو اور کہمس بن الحقیق اور قیس بن زید یہ سب یہودی مل کر انصار کے مسلمانوں سے خفیہ دوستی کرنے لگے تا کہ ان کو دین کے بارے میں فتنہ میں ڈال دیں مسلمانوں میں سے رفاعہ بن منذر اور عبداللہ بن جبیر اور سعید بن خیثمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان سے کہا کہ ان یہودیوں سے بچ کر رہو اور ان کی دوستی سے ڈرتے رہو یہ تمہیں دین سے

بارے میں فتنہ میں مبتلا نہ کریں ان حضرات نے ان ناصحین کی بات کا خیال نہیں رکھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتار دیں۔ (روح المعانی ج ۲ ص: ۱۱۹)

عام مفسرین کی تصریحات وتفسیرات کے باوجود امین احسن اصلاحی صاحب مؤمنین کے لفظ سے منافقین مراد لے رہے ہیں اور قرآن کے عام الفاظ کو اور اس کی خصوصی اصطلاح اور اسلوب کو نظر انداز کر رہے ہیں اور یوں لکھ رہے ہیں:

''مُؤْمِنُوْن'' کا لفظ اگر چہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے خاص طور پر وہ مسلمان ہیں جو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے بلکہ کچھ ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے مستقبل کے بارے میں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، غیر مطمئن ہونے کے باعث، یہود کی طرف میلان رکھتے تھے، اور یہود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کرتے تھے اس میں وہ ان کو آلہ کار بنا لیتے تھے اور یہ ان کے آلہ کار بن جاتے تھے۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اب یہود کے ساتھ موالات اور دوستی اجڑے گھر کی دربانی بھی ہے اور یہ حرکت ایمان واسلام کے دعوے کے منافی بھی ہے۔ ''کَافِرِیْن'' سے یہاں مراد اہل کتاب خاص طور پر یہود ہیں جیسا کہ آیت ۲۱ میں ان کے کفر کی تصریح گزر چکی ہے۔ (تدبر قرآن ج ا ص: ۶۶۹)

تبصرہ:

اصلاحی صاحب نے مخلص صحابہ کرام کو منافقین کے زمرہ میں داخل کر کے غلط انداز اختیار کیا ہے یہاں قرآن کے الفاظ میں کوئی قرینہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی خاص منافق مسلمان مراد ہیں عام مفسرین نے اس کو عام مانا ہے کہ یہ مخلص مسلمان تھے اور قرآن عظیم کی اصطلاح اور روئے سخن اور اسلوب کلام بھی بتاتا ہے کہ اس میں خطاب مخلص مسلمانوں کے متعلق ہے ویسے علماء اصول کا یہ ضابطہ بھی ہے کہ ''اَلْعِبْرَةُ لِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ لَا لِخُصُوْصِ الْوَاقِعَةِ'' لہٰذا یہاں کافرین سے بھی مطلق کفار مراد لیے جائیں گے اگر چہ واقعہ کا تعلق یہود سے ہو شاید اصلاحی صاحب نے کسی

کے شاذ قول کو پیش نظر رکھ کر اس طرح لکھا ہے۔

مولانا جلیل احسن ندوی رحمہ اللہ نے بھی اس مقام میں اصلاحی صاحب پر خوب تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ ہماری گزارش یہ ہے کہ "مؤمنون" کے لفظ کا تتبع واستقرا بتاتا ہے کہ یہ لفظ قرآن مجید میں مخلص اہل ایمان ہی کے معنی میں آیا ہے اس میں منافقین شامل نہیں ہیں۔

(تدبر قرآن پر ایک نظر ص:۸۳)

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر۲۰

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ (آل عمران:۳۷)

ترجمہ: جس وقت آتے اس کے پاس زکریا حجرے میں پاتے اس کے پاس کچھ کھانا

(ترجمہ شیخ الہند)

امین اصلاحی صاحب نے اس آیت کا مفہوم غلط رخ پر ڈالا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

﴿وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ سے حضرت مریم کے غیر معمولی روحانی کمال کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحب کمال بھی ان کے پاس جاتے تو ان کے کمال روحانی کے نفحات محسوس کرتے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعجاب وتحسین کے طور پر یہ بھی پوچھ بیٹھے کہ اے مریم! یہ چیزیں تمہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

رزق سے مراد یہاں حکمت ومعرفت ہے۔ قرآن نے وحی وہدایت کے لیے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال کیا ہے۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد مشہور ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ آگے والی آیت میں آ رہا ہے کہ حضرت زکریا حضرت مریم کی علم ومعرفت کی باتوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے پیرانہ سالی میں، بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود، اپنے لیے بھی ایسی ہی اولاد صالح کی دعا مانگی۔ ظاہر ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحب معرفت کو

سیب وانگور والا رزق اس درجہ متاثر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یہ کرشمہ دیکھ کر اولاد کی دعا شروع کر دیں۔ اس طرح کی باتیں ارباب کمال کے ہاں کوئی خاص درجہ و مرتبہ نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت زکریا جیسے صاحب کمال تو متاثر ہو سکتے تھے تو کسی ایسے ہی رزق روحانی سے متاثر ہو سکتے تھے جو خود ان کی اشتہائے روحانی کو بھی بھڑکا دے، جس کو دیکھ کر وہ بھی عش عش کر اٹھیں اور جوان کے اندر بھی یہ تمنا پیدا کر دے کہ کاش ان کی نسل سے بھی کوئی اس کمال کا حامل اٹھے۔

﴿اَنّٰی لَکِ ھٰذَا﴾ (یہ چیزیں تمہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں؟) بغرض استفسار و تحقیق نہیں بلکہ بطور استعجاب و تحسین کے ہے، جب کسی کا کمال اس کی عمر کے اعتبار سے بہت زیادہ اور متکلم کے گمان وخیال سے بہت بڑھ کر ہو تو اس طرح کا استعجاب قدرتی ہے۔ یہ استعجاب اظہار تحسین کا ایک اسلوب ہے۔ اس سے حضرت زکریا کی تواضع اور قدر دانی کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اپنی ایک زیر تربیت لڑکی کو، جس کی عمر ابھی کچھ بھی نہیں ہے، اس کی صلاحیتوں پر کس فیاضی سے داد دے رہے ہیں۔ حضرت مریم کا جواب ﴿ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ﴾ بھی اس کم سنی میں ان کی پختگی عقل کا شاہد ہے کہ انہوں نے اس سب کو اللہ کا فضل واحسان قرار دیا، اس کو اپنے زہد وریاضت کا کرشمہ نہیں قرار دیا۔ ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ ہمارے نزدیک حضرت مریم کے جواب کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ (تدبر قرآن ج ا ص: ۶۸۰)

تبصرہ:

امین احسن اصلاحی صاحب قرآن مجید کے ظاہر کو چھوڑ کر رزق سے کھانے کی اشیاء کے بجائے روحانی علوم ومعرفت مراد لے رہے ہیں عام مفسرین نے ان سے ظاہری کھانے اور پھل فروٹ مراد لیے ہیں چنانچہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں ﴿وَجَدَ عِنْدَھَا رِزْقًا﴾ **قال مجاهد وعكرمة وسعيد بن جبير وابو الشعثاء وابراهيم النخعي والضحاك وقتادة والربيع بن انس وعطية العوفي والسدي يَعْنِيْ وجد عِنْدَهَا فَاكهة الصَّيف في**

الشِّتَآءِ وفاكهة الشِّتَآءِ في الصَّيْفِ وعن مجاهد "وجَدَ عندَهَا رِزْقًا" اى علمًا او قال صحفًا فِيها عِلْمٌ والاول اصح وَفِيهِ دَلالَةٌ عَلٰى كَرَامَات الأولياء

(ابن کثیر ج ا ص:۳۶۰)

ترجمہ: "مجاہد وعکرمہ اور سعید بن جبیر اور ابوالشعثاء اور ابراہیم نخعی اور ضحاک اور قتادہ اور ربیع بن انس اور عطیہ عوفی اور سدی ان سارے مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم کے پاس آتے تو گرمیوں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں پاتے تھے۔ مفسر مجاہد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت مریم کے پاس صحیفوں کا علم پاتے تھے لیکن پہلا قول صحیح ہے اور اس قصہ سے یہ دلیل ملتی ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات ثابت ہیں۔

امین اصلاحی صاحب نے ظاہر قرآن اور اسلوب کلام کو نظر انداز کر کے روحانی علوم اور معرفت مراد لیا ہے اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ حضرت مریم کے اس قصہ سے کوئی کرامت اور مافوق الفطرت کرشمہ ثابت نہ ہو جائے اور یہی ان حضرات کا مقصد عظیم ہے کہ کرشماتی امور، کرامات اور معجزات سے دور بھاگتے ہیں یہاں مجاہد کے صحیح قول کو چھوڑ کر غیر صحیح اور شاذ قول کی طرف چلے گئے حالانکہ تمام مفسرین نے معروف ومتبادر مفہوم بیان کیا ہے کہ یہ کھانے کے ظاہری اشیاء تھیں۔ حضرت سید یوسف بنوری رحمہ اللہ نے بھی اصلاحی صاحب پر یہاں تنقید فرمائی ہے۔

اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ نمبر ۲۱

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ الخ (آل عمران آیت:۸۱)

اور یاد کرو جب خدا نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا (ترجمہ اصلاحی صاحب)

اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اوپر دونوں ترجموں میں واضح فرق ہے اصلاحی صاحب نے اپنے ایک خاص مقصد کے تحت غلط ترجمہ کیا ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے کوئی میثاق نہیں لیا تھا بلکہ بنی

اسرائیل سے میثاق لیا تھا چنانچہ اصلاحی صاحب اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیاء سے میثاق لیا گیا بلکہ یہ مطلب ہے کہ انبیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا یہ میثاق جیسا کہ آیت میں ذکر ہے اس بات کے لیے تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ کتاب وحکمت کے حامل اور امین بنائے گئے تھے اس وجہ سے ان کے اس منصب کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جو انبیاء آئیں خاص طور پر آخری نبی جب آئیں تو سب سے آگے بڑھ کر ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔ (تدبر قرآن ص:۷۳۵)

تبصرہ:

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يُخْبِرُ تعالىٰ انّه اخذ مِيْثَاق كلّ نَبِيّ بَعَثَهُ مِن لدن آدمَ عليه السَّلام اِلٰى عيسىٰ عليه السَّلام لَمَهُمَا آتى اللّٰهُ احدهُمْ مِنْ كِتَاب وَحِكْمَةٍ وَبَلغ اَىْ مبلغ ثُمَّ جآءَ رَسُوْلٌ مِنْ بَعْدِهٖ لَيُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَيَنْصُرنَهٗ وَلايمنعه مَا هُوَ فيه مِنَ الْعِلْمِ وَالنُّبُوَّةِ مِنْ اِتّباع من بعث بعده ونصرته (ابن کثیر ج۱ ص:۳۷۷)

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے حضرت آدم سے لیکر حضرت عیسیٰ تک ہر نبی سے عہد لیا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ ان نبیوں میں سے کسی نبی کو کتاب وحکمت عطا کرے اور وہ ایک مقام تک پہنچ جائے اور پھر اس کے بعد کوئی رسول مبعوث ہو جائے تو یہ نبی ان پر ایمان لائے گا اور اس کی مدد کرے گا اور اس نبی کے پاس جو علم ونبوت ہوگی وہ اس نئے نبی کی اتباع اور نصرت ومدد کے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی (ابن کثیر ا ص ۳۷۷)

اس عبارت سے بالکل واضح ہے کہ یہ عہد انبیاء کرام سے لیا گیا تھا اور ان نبیوں کے ذریعہ سے ان کے ماننے والوں سے کہا گیا کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو آنے والی نبی کی اتباع کی وصیت کی۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیر اور قتادہ اور طاؤس اور سدی اور حسن بصری نے کہا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام سے وعدہ لیا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد ونصرت کریں اور ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور ایمان کی ترغیب دیں۔ شیخ طاؤس فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر پہلے آنے والے نبی سے عہد لیا کہ وہ آنے والے نبی پر ایمان لائیں (تفسیر قرطبی ج ۴ ص: ۱۲۴)

امین اصلاحی کی یہ بات اور نظریہ اس آیت کی وجہ سے بھی غلط ہے جو سورۃ احزاب کی آیت ۸ میں مذکور ہے آیت اس طرح ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ﴾ الخ (احزاب آیت: ۸) اور جب لیا ہم نے نبیوں سے ان کا قرار اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور عیسیٰ سے جو بیٹا مریم کا اور لیا ہم نے ان سے گاڑھا قرار (ترجمہ شیخ الہند)

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں یعنی یہ قول وقرار کہ ایک دوسرے کی تائید وتصدیق کرے گا اور دین کے قائم کرنے اور حق تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں کوئی دقیق اٹھا نہ رکھے گا (تفسیر عثمانی: ۵۵۷)

مفسرین کی ان تفصیلات کے بعد اصلاحی صاحب کے قول کو ہم شاذ ہی کہیں گے جو کسی شاذ ماخذ سے لیا ہوگا اللہ تعالیٰ اہل حق کے عظیم قافلہ سے جڑے رکھے اور شاذ اقوال اپنانے سے ہماری حفاظت فرمائے آمین یارب العالمین وصلی اللہ علیہ نبیہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

اظہار حقیقت

امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن کی قابل گرفت مقامات سے متعلق میں نے اختصار کے ساتھ ۲۱ اشکالات اور اس پر تبصرہ پیش کیا ہے یہ ان کی تفسیر کی پہلی جلد ہے جو آٹھ سو چھتیس لمبے لمبے صفحات پر مشتمل ہے ان کی پوری تفسیر نو جلدوں میں ہے جو تقریباً چھ ہزار صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہوگی اس پوری تفسیر میں اصلاحی صاحب نے صرف سترہ احادیث کا ذکر کیا ہے جیسا کہ کل مجھے ایک واقفِ حال عالم دین نے یہ بات بتائی ہے میرے خیال میں اس پہلی جلد میں سند کے ساتھ ایک حدیث بھی اصلاحی صاحب نے ذکر نہیں کی ہے ہاں بلا سند شاید آٹھ دس

ٹکڑے ذکر کیے ہونگے تو جو شخص قرآن عظیم سے احادیث کو اتنا دور رکھتا ہو وہ وہی غلطیاں کرے گا جو اصلاحی صاحب نے کیے ہیں میں نے ایک جلد کی ۲۱ غلطیاں پیش کی ہیں باقی جلدوں کی غلطیوں پر گرفت کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں انتہائی مصروف ہوں پہلی جلد کی غلطیوں سے ہر سامع کو اندازہ ہو جائے گا کہ جب ابتدا اس طرح ہے تو انتہاء کیا ہو گی مجھے مفتی محمد سعید خان صاحب ندوی نے دو دفعہ بتایا کہ میں نے اصلاحی صاحب کو دیکھا تھا جو کہہ رہا تھا کہ اگر مجھے ابن شہاب زہری مل جائے تو میں اس کو ذبح کر کے کباب بنا دوں گا۔ یاد رہے ابن شہاب زہری حدیث کا امام ہے اور احادیث کو جمع کرنے والے وہ شیخ الحدیث ہیں جن کو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سب سے پہلے احادیث پر مامور کیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن کی غلطیوں کو ایک حد تک ذکر کیا ہے بس اصلاحی صاحب کی باقی تفسیر کی غلطیاں اسی پر قیاس کریں کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے اندھے ہو کر دوڑتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں راہ راست پر رکھے اور اس پر استقامت عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔

محمد شفیق (جاوید احمد غامدی)

جاوید احمد غامدی کے معتقدین نے خود ان کا تعارف اور پیدائش کے بعد تعلیم و تعلم کو اس طرح بیان کیا ہے۔

جاوید احمد غامدی کی پیدائش ۱۸ اپریل ۱۹۵۱ء کو ضلع ساہیوال کے ایک گاؤں ''جیون شاہ'' کے نواح میں ہوئی۔ آبائی گاؤں قصبہ داؤد ہے اور آبائی پیشہ زمینداری ہے۔ ابتدائی تعلیم پاک پتن اور اس کے نواحی دیہات میں پائی۔ اسلامیہ ہائی سکول پاک پتن سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور اس کے ساتھ انگریزی ادبیات میں آنرز (حصہ اول) کا امتحان پاس کیا۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم ضلع ساہیوال ہی کے ایک گاؤں ''ناگ پال'' میں مولوی نور احمد صاحب سے حاصل کی۔ دینی علوم قدیم طریقے کے مطابق مختلف اساتذہ سے پڑھے۔ قرآن

وحدیث کے علوم ومعارف میں برسوں ''مدرسہ فراہی'' کے جلیل القدر عالم اور محقق امام امین احسن اصلاحی سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ ان کے دادا ''نورالٰہی'' کو لوگ گاؤں کا مصلح کہتے تھے۔اسی لفظ کی تعریب سے اپنے لیے غامدی کی نسبت اختیار کی اور اب اسی رعایت سے جاوید احمد غامدی کہلاتے ہیں (دانش سرا، المورد، ماہنامہ)

غامدی صاحب کے ہاں پوری امت میں صرف دو ہی علماء ان کے ممدوح ہیں جن کو وہ آسمان کا درجہ دیتے ہیں باقی تمام علماء امت کو وہ خاک کے برابر قرار دیتے ہیں چنانچہ وہ اپنی کتاب ''مقامات'' میں خود لکھتے ہیں ''میں نے بھی بہت عالم دیکھے ہیں، بہتوں کو پڑھا اور بہتوں کو سنا لیکن امین اصلاحی اور ان کے استاد حمید الدین فراہی کا معاملہ وہی ہے کہ

غالب نکتہ دان سے کیا نسبت ☆ خاک کو آسمان سے کیا نسبت

(مقامات ص:۵۷)

ملک وملت کے غدار پرویز مشرف کے دور حکومت میں غامدی صاحب کو بڑی پذیرائی ملی اور وہ اسلامی نظریاتی کونسل تک پہنچ گئے اس موقع پر نوائے وقت اخبار نے اپنے اداریہ میں غامدی صاحب پر کچھ تبصرہ کیا ہے وہ ملاحظہ ہو روزنامہ نوائے وقت لاہور کا اداریہ نگار لکھتا ہے:

اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت ایک منافع بخش نوکری ہے مگر ایسی بھی نہیں کہ اس کے لیے علامہ جاوید غامدی قرآن حکیم اور اسلامیات کی تعلیم کو فرقہ واریت، مذہبی انتہاء پسندی اور ملائیت سے تعبیر کرنے لگیں۔

علامہ جاوید غامدی کو اپنی لسانی اور علمی صلاحیتوں کو محض سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے ہر روز ٹی وی مباحثوں میں نئی نئی اختراعات کرنے اور حاکموں کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس دین اور علم کی جڑیں نہیں کاٹنی چاہیے جس کی وجہ سے انہیں یہ عزت حاصل ہے علامہ صاحب کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ علماء حق کبھی حکومتوں کی حمایت میں اس قدر سرگرم اور پر جوش نہیں ہوا کرتے،

خواتین کی جھرمٹ میں بیٹھ کرٹی وی چینلز کی چکا چوند روشنیوں میں اسلام کی یہ بخیہ گری کم از کم علامہ جاوید غامدی کو زیب نہیں دیتی۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور کا ادارتی شذرہ مؤرخہ ۵ جون ۲۰۰۶ء بحوالہ غامدی مذہب کیا ہے ص:۱۷)

جناب غامدی صاحب مولانا مودودی صاحب کی جماعت اسلامی کے بڑے عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں پھر امین احسن اصلاحی جب ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے الگ ہوگئے تو جاوید غامدی نے بھی جماعت اسلامی کو چھوڑ دیا اور امین احسن اصلاحی کے ساتھ ہوگئے گویا غامدی صاحب کی خمیر میں جماعت اسلامی کے نظریات بھی شامل حال ہیں۔

غامدی صاحب کا بیس سالہ رفیق خاص جناب نادر عقیل انصاری غامدی صاحب کے غلط نظریات کی وجہ سے ان سے الگ ہوا اس نے اپنی روداد اور غامدی صاحب کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھایا ہے، سہ ماہی جی لاہور جولائی تا اکتوبر ۲۰۱۵ء میں کچھ خاص خاص اشارے ہیں ملاحظہ ہو:

(۱) احقر ۸۶ میں غامدی صاحب سے متعارف ہوا مختلف حیثیتوں سے المورد اور اس کی فکر سے وابستہ رہا، ماہنامہ اشراق اور انگریزی ماہنامے رینی ساں کا مدیر رہا المورد کا صدر رہا اس میں پڑھا بھی اور پڑھایا بھی۔ ۲۰۰۵ء میں مجھے اس فرقے سے اختلاف ہوا مباحثے ہوئے مناظرے ہوئے یہ سلسلہ ۲۰۱۰ء تک جاری رہا۔

(۲) جاوید غامدی صرف منکر حدیث نہیں بلکہ ان کی اصلی غلطی یہ ہے کہ وہ دین کی تمام نصوص مطہرہ کو مغربیت کی گاڑی میں جوتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) انہوں نے قرآن مجید کی تعبیر پر بھی استعماری جدیدیت کی حاکمیت قائم کرنے کی سعی کی ہے۔

(۴) غامدی صاحب اسلام کو مغربی تہذیب کا محتاج تسلیم کر چکا ہے۔

چنانچہ انہوں نے دینی نصوص کو اس مقصد میں پوری طرح کھپا دیا ہے۔

(۵) جاوید غامدی صاحب کے کام سے واضح ہے کہ مغربی تہذیب کا لنگڑا لولا ڈسکورس ہی

ان کے نزدیک خالص اسلام قرار پایا ہے۔ (بشکریہ سہ ماہی جی لاہور جولائی تا اکتوبر ۲۰۱۵ء)

جاوید احمد غامدی کی تفسیر ''البیان''

تفسیر قرآن کے لیے جاوید احمد غامدی صاحب کے اصول

برصغیر میں اہل حق اور اہل باطل کی تفاسیر کی نشاندہی کے سلسلہ میں میرا لکھا ہوا ایک طویل مقالہ آپ کے سامنے ہے، جناب جاوید احمد غامدی صاحب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے، حقیقت یہ ہے کہ میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب ہی کی تفسیر سے متعلق کچھ لکھنا چاہ رہا تھا بات لمبی ہوگئی اور مقالہ پھیلتا گیا چنانچہ اس مقالہ کی ابتداء میں تفسیر کی تعریف موضوع اور غرض کی وضاحت کی گئی ہے پھر اہل حق کی بڑی چھوٹی تفاسیر کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے اسی طرح طبقات المفسرین کی ایک عمدہ بحث سپرد قلم کی گئی ہے اور اس کا سراغ لگایا گیا ہے کہ سب سے پہلے تفسیر کی ابتداء کس نے کی ہے اور مختلف ادوار میں تفسیر کے فن کو زیادہ فروغ کس دور میں ملا ہے پھر اہل حق کی ضخیم تفاسیر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور مفسرین کے الگ الگ رجحانات کو ذکر کیا گیا ہے پھر اہل باطل کی تفاسیر کا بھرپور انداز میں تعارف کیا گیا ہے اور اس میں سے قابل گرفت مقامات کی خوب گرفت کی گئی ہے۔

اب آخر میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' پر کلام رہ گیا ہے یہ تفسیر متوسط چار جلدوں میں ہے۔ جناب جاوید غامدی صاحب باقاعدہ مستند عالم نہیں ہیں انہوں نے اپنی تفسیر میں سب کچھ امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' سے لیا ہے لیکن اس لینے میں جاوید صاحب نے کبھی اصلاحی صاحب کی تفسیر سے بعینہٖ عبارت لے لی ہے اور کبھی اس کا خلاصہ نقل کیا ہے خلاصہ نقل کرنے میں غامدی صاحب سے پورا حق ادا نہیں ہوا ہے بلکہ کوتاہی رہ گئی ہے جاوید غامدی صاحب کبھی کبھی اپنے شیخ الشیخ حمید الدین فراہی صاحب سے بھی تفسیر میں مدد لیتا ہے لیکن یہ انہیں مقامات میں لیتا ہے جہاں ان کو جمہور مفسرین کے راستہ سے ہٹ کر الگ راستہ اختیار کرنا

ہوتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کی تفسیر میں قرآن کی تفسیر اتنی نہیں ہے جتنا کہ ان کی اپنی رائے کا دخل ہے جب اس کو کوئی آدمی پڑھتا ہے تو وہ یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عظیم کتاب قرآن مجید کا مبارک مطلب ہے بلکہ غامدی صاحب نے اپنی رائے اور اپنے ذہن سے ایک مختصر مضمون تیار کرلیا اور اس کو آیت کی تفسیر میں لکھدیا چنانچہ بادی النظر میں جب ایک شخص اس کو پڑھتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ انجیل کے اردو نسخے کا مطالعہ کررہا ہے رہ گیا ترجمہ تو غامدی صاحب نے وہ بھی اپنے فہم کے مطابق کیا ہے البتہ ربط کے لیے غامدی صاحب نے قوسین کے درمیان عبارت بڑھا کر ربط کی کوشش کی ہے، غامدی صاحب کی تفسیر میں قرآن مجید کے رکوعات کے نشانات نہیں ہیں، نہ قرآن کے کسی پارہ کا نشان ہے نہ نصف پارہ ہے نہ ربع ہے نہ کسی موضوع کے لیے کوئی عنوان ہے، نہ فہرست ہے نہ کسی سورت کے لیے مدنی یا مکی کا فرق ہے نہ یہ مذکور ہے کہ یہ سورت کتنی آیات پر مشتمل ہے تفسیر کرنے میں نہ مفسر کی تفسیر کا حوالہ ہے نہ کسی حدیث کا ذکر ہے نہ کسی آیت کے شان نزول کا ذکر ہے حالانکہ قرآن تو مکہ ومدینہ میں اس وقت کی ضروریات اور مسائل کے پیش نظر نازل ہوا ہے شان نزول اور حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کس طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ غامدی کی تفسیر قرآن بس ایک چٹیل میدان ہے کسی قابل گرفت مقام کا سراغ لگانا بھی بہت مشکل ہے ایک ایک حرف دیکھنا پڑتا ہے تفسیر کا نام بھی نہیں ہے صرف اوپر صفحہ پر لکھا ہے ''البیان'' اس نام سے غامدی صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ بس قرآن خود بیان ہے کسی خارجی بیان کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ اس نے اپنی پوری تفسیر کو احادیث سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح مفسرین کی تفاسیر سے بھی اس کو الگ رکھا ہے صرف حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی صاحب کے حوالے جگہ جگہ ملتے ہیں اہل باطل کے دیگر مفسرین نے جس طرح اپنی اپنی تفسیر کے لیے کچھ قواعد وضوابط اور اصول رکھے ہیں اسی طرح غامدی صاحب نے اپنی تصنیف میزان میں اپنی تفسیر کے لیے اصول ذکر کیے ہیں میں اسی کو یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں پھر اس پر تبصرہ کروں گا ملاحظہ فرمائیں۔

مبادی تدبر قرآن (میزان ص:۱۵)

اس عنوان کے تحت جاوید غامدی لکھتے ہیں ''پہلے ان مبادی کو لیجئے جو قرآن مجید پر تدبر میں ملحوظ رہنے چاہئیں

(۱) عربی معلّٰی

پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے وہ ام القریٰ کی عربی معلّٰی ہے جو اس کے دور جاہلیت میں قبیلۂ قریش کے لوگ اس میں بولتے تھے'' (میزان ص:۱۵)

جاوید غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں: ''لیکن اس زبان کے بارے میں یہ بات البتہ اس کے ہر طالب علم کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینی چاہیے کہ یہ وہ عربی نہیں ہے جو حریری، و متنبّی، اور زمخشری اور رازی نے لکھی ہے یا اس زمانے میں مصر و شام کے اخبارات میں شائع ہوتی ہے اور شاعروں کے قلم سے نکلتی ہے چنانچہ قرآن کی زبان کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی طرف رجوع کرنا چاہیے وہ خود قرآن مجید ہی ہے''۔ (میزان ص:۱٦)

جناب غامدی صاحب عربی معلّٰی کے لیے مزید لکھتے ہیں ''قرآن مجید کے بعد یہ زبان حدیث نبوی اور آثار صحابہ کے ذخائر میں ملتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ روایت بالمعنیٰ کی وجہ سے ان ذخائر کا بہت تھوڑا حصہ ہی ہے جسے اب زبان کی تحقیق میں سند و حجت کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے لیکن یہ جتنا کچھ بھی ہے اہل ذوق کے لیے متاع بے بہا ہے اس کے بعد اس زبان کا سب سے بڑا ماٗخذ کلام عرب ہے یہ امرأالقیس، زہیر، عمرو بن کلثوم، لبید، نابغہ، طرفہ، عنترہ، اور حارث بن حلّزہ جیسے شاعروں اور قُس بن ساعدہ جیسے خطیبوں کا کلام ہے''۔ (میزان ص:۱۸)

جاوید غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں: ''یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ان سب معاملات میں قرآن مجید کا اسلوب ہی عرب کا معروف اسلوب ہے۔

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب تفسیر قرآن کے لیے عربی معلّٰی کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں اس میں وہ سب سے پہلے قرآن مجید کا نام لیتے ہیں تو عرض یہ ہے کہ قرآن صرف اجمال و تفصیل یا مبہم اور وضاحت کی حد تک تفسیر کے لیے کام آسکتا ہے مفسرین نے قرآن مجید کی تفسیر کے لیے قرآن کو استعمال نہیں کیا ہے اس بات کی وضاحت میں نے اس سے پہلے مدلل انداز سے کی ہے۔

عربی معلّٰی کے لیے دوسرے نمبر پر غامدی صاحب نے احادیث کا نام لیا ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کو مخدوش قرار دیکرنا کافی قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر اس کی عبارت میں اس نے خود تصریح کی ہے نیز غامدی کے طرز عمل بھی بتاتا ہے کہ وہ تفسیر میں احادیث سے دور بھاگتا ہے، عربی معلّٰی میں غامدی صاحب نے جاہلیت کے اشعار کو بڑا معیار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ زمخشری اور فخر الدین رازی اور حریری اور متنبّی کی عربیت یہاں کام نہیں آسکتی ہے یہاں امرأ القیس طرفہ بن العبد اعشٰی وغیرہ جاہلیت کے مشہور شعراء کی عربی کام آسکتی ہے۔

تعجب اس پر ہے کہ جاوید غامدی صاحب کونسے ''عرب اقح یا عرب العرباء'' یا عرب بادیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو فخر الدین رازی اور زمخشری جیسے مشہور ائمہ لغت کی لغت وفصاحت و بلاغت کو غیر معیاری قرار دے رہے ہیں۔ یہ بیچارہ تو لاہور یا پاکپتن کے دیہات میں ایک دیہاتی کے گھر میں پیدا ہوئے اور وہیں پنجابی اور سرائیکی بولی میں بول چال کرتے رہے پھر اردو میں مضمون نگاری سیکھ لی اور تفسیر لکھ ڈالی۔ ان کو اتنے بڑے دعوے زیب نہیں دیتے ہیں۔

اتنا نہ بڑھا پاکئ داماں کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

اب میں مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا ایک کلام پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس کا تعلق تفسیر قرآن میں عربی زبان کی حیثیت سے متعلق ہے اس کو میں نے ابتدائے کتاب میں بھی

نقل کیا ہے وہ معارف القرآن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلطی فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو و صرف اور بلاغت و ادب کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ و تفسیر اور عقائد و کلام کا وسیع و عمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔
افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لیے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شُدھ بُدھ رکھنے والے لوگ جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لیجاتا ہے، دنیوی علوم و فنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کر لے تو دنیا کا کوئی صاحب عقل اسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو، اس لیے کہ ڈاکٹر بننے

کے لیے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی دان انجنیئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجنیئر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجنئیر تسلیم نہیں کرسکتا، اس لیے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا، بلکہ اس کے لیے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کران سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لیے یہ کڑی شرائط ضروری ہے تو آخر قرآن وحدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہوسکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم وفن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کیے بغیر اس علم وفن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن وسنت اتنے لاوارث کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان کی تشریح وتفسیر کے لیے کسی علم وفن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کردے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ﴾ (۱۷:۵۴)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کردیا ہے

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لیے کسی لمبے چوڑے علم وفن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت وموعظت کے مضامین بیان کیے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت ودوزخ کے حالات، خوف خدا اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کرسکتا ہے، مذکورہ بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کردیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ :للذ کر: (نصیحت

کے واسطے) اس پر دلالت کر رہا ہے۔
اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام وقوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کما حقہ، سمجھنا اور ان سے احکام ومسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لیے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے۔ علامہ سیوطیؒ نے امام ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں، (مقدمہ معارف القرآن:۵۴)
مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کے اس مفصل کلام کے بعد حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کا مختصر مگر پُر مغز کلام ملاحظہ ہو:

تفسیر قرآن میں محض لغت اور تاریخ پر اعتماد

اس بحث کے متعلق میں نے اس لیے کچھ تفصیل سے کام لیا کہ آج کل بہت سے ہم عصر اہل علم حضرات کو دیکھتا ہوں کہ جب وہ قرآن پاک کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ احادیث وآثار سے وہ بے نیاز ہیں اور محض لغت وتاریخ پر اعتماد کر کے سنت اور اجماع امت سے آنکھیں بند کر کے صَرفِ نظر کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں، بلکہ ان کی قدر ومنزلت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے بارے میں اپنی ہوس وخواہش کے پیش نظر جو چاہتے ہیں کہتے پھرتے ہیں۔ جہاں احادیث وآثار ان کی رائے کے خلاف ہوں وہاں ان کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہشات

کی پیروی کرتے ہیں، یہی الحاد و زندیقیت کا پہلا دروازہ ہے جس کے لیے سر سید احمد خان اور علامہ عنایت اللہ مشرقی ہی کو ملاحظہ کر لیجئے کہ کس طرح تاریخ (جس کی بنیاد ہی بودی اور مضطرب ہے اور انہی کمزور رائے) کو فہم قرآن اور بلند پایہ الفاظ نصوص کے حل کے لیے مدار و مرکز ٹھہرایا ہے، ان کی تفسیر کے متعلق گزشتہ صفحات میں کلام ہو چکا ہے، انہی کی مانند دیگر ہم عصر نے بھی یہ طرز اپنا رکھا ہے، اللہ ہی توفیق دینے والے ہیں اور وہی حق کی طرف رہبری اور ہدایت فرمانے والے ہیں۔ (اصول تفسیر و علوم قرآن:۶۸)

جناب غامدی صاحب نے اپنی کتاب میزان میں تفسیر قرآن کے لیے ایک اور اصول رکھا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

اسلوب کی ندرت

تیسری چیز یہ ہے کہ قرآن کا اسلوب ایک منفرد (نادر) اسلوب ہے اس میں نثر کی سادگی اور ربط وتسلسل ہے لیکن اسے نثر نہیں کہا جا سکتا ہے یہ نظم کا غناء موسیقی اور حسن تناسب اپنے اندر لیے ہوئے ہے لیکن اسے نظم بھی نہیں کہہ سکتے (ص:۲۱)

غامدی صاحب اس عنوان کے تحت مزید لکھتے ہیں قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے کہ بظاہر الفاظ عام ہیں لیکن سیاق وسباق کی دلالت پوری قطعیت کے ساتھ واضح کر دیتی ہے کہ ان سے مراد عام نہیں ہے (مثلاً) قرآن ''النَّاس'' کہتا ہے لیکن ساری دنیا کا تو کیا ذکر بارہا اس سے عرب کے سب لوگ بھی اس کے پیش نظر نہیں ہوتے ''عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' کی تعبیر اختیار کرتا ہے لیکن اس سے دنیا کے سب ادیان مراد نہیں لیتا ہے۔ وہ ''الْمُشْرِكُوْنَ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے لیکن اسے سب شرک کرنے والوں کے معنی میں استعمال نہیں کرتا۔ وہ ''اِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' کے الفاظ لاتا ہے لیکن اس سے پورے عالم کے اہل کتاب مراد نہیں ہوتے۔ وہ ''الْاِنْسَان'' کے لفظ سے اپنا مدعا بیان کرتا ہے لیکن اس سے ساری اولاد آدم کا ذکر مقصود نہیں

ہوتا یہ قرآن کا عام اسلوب ہے جس کی رعایت اگر ملحوظ نہ رہے تو قرآن کی شرح اور وضاحت میں متکلم کا منشا بالکل باطل ہو کر رہ جاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے (میزان: ۲۳،۲۴)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے نظم قرآن کو غنا اور موسیقی کا حامل قرار دیکر ظاہری اطلاق میں قرآن مجید کی توہین کی ہے اگر چہ اس نے کہہ دیا ہے کہ اس نظم کو غنا اور موسیقی نہیں کہہ سکتے لیکن غامدی نے قرآن میں غنا اور موسیقی کے وجود کا اقرار اور دعویٰ کیا ہے جو ان کی غلط سوچ اور بے ادبی کا نتیجہ ہے اس کے بعد متصل عبارت میں غامدی صاحب نے کئی مثالیں پیش کی ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ ان عام الفاظ میں عموم مراد نہیں ہے ان کے نزدیک قرآن میں ''النَّاس'' کا لفظ عام نہیں ہے اس مجتہد سے اگر پوچھا جائے کہ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ میں کونسا خاص انسان مراد ہے؟ ﴿عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ میں کونسا خاص دین مراد ہے اور پھر ﴿كُلِّهٖ﴾ کی تعمیم کا کیا مطلب ہے اور ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ سے کونسے خاص مشرک مراد ہیں اور اہل الکتاب میں کونسے خاص اہل کتاب مراد ہیں؟ پھر یہ پوچھا جائے کہ غامدی صاحب کو اس تخصیص کا پتا کہاں سے چلا؟ اور ان کے پاس دلیل کیا ہے تعجب ہے کہ غامدی صاحب لکھتا جاتا ہے اور کہیں بھی دلیل پیش کرنے کی زحمت نہیں کرتا ہے اور نہ کسی مفسر کا حوالہ دیتا ہے یہ واقعی ان کی اسلوب کی ندرت ہے لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن عظیم کی آیات کے ساتھ اس طرح کھیل کھیلنا بدترین گمراہی ہے یہ عجیب ضابطہ ہے جس کے تحت غامدی صاحب قرآن کی آیات میں ہر طرح کی تحریف کے لیے راستہ کھولنا چاہتا ہے: چنانچہ اس اصول کے تحت غامدی صاحب نے اپنی تفسیر میں کئی جگہ غلط راستہ اختیار کیا ہے جیسے آئندہ آرہا ہے حالانکہ اس طرح تخصیص وتعمیم کے لیے مفسرین صحابہ وتابعین کی تصریح کی ضرورت ہے اہل اصول اور مفسرین نے یہ قاعدہ رکھا ہے کہ العبرة لعموم الالفاظ لالخصوص الواقعة

واقعی یہ ایک نادر اسلوب ہے جو غامدی صاحب کو مل گیا ہے اور اسی کی بنیاد پر غامدی صاحب اپنی تفسیر ''البیان'' میں عجیب عجیب ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں اور نوادرات پیش کرتے ہیں۔
غامدی صاحب نے اصول تفسیر کے لیے ایک اور اصل کا ذکر کیا چنانچہ عنوان باندھ کر لکھتے ہیں:

میزان اور فرقان

اس عنوان کے تحت غامدی صاحب رقمطراز ہیں چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن مجید اس زمین پر حق و باطل کے لیے میزان اور فرقان اور تمام سلسلۂ وحی پر ایک مہیمن کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔
﴿اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ﴾ (الشوریٰ ۴۲:۱۷)
''اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری، یعنی میزان نازل کی ہے''۔
اس آیت میں ''وَالْمِیْزَانَ'' سے پہلے ''وٗ'' تفسیر کے لیے ہے۔ اس طرح ''الْمِیْزَان'' درحقیقت یہاں ''الْكِتٰبَ'' ہی کا بیان ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں امتیاز کے لیے قرآن اتارا ہے جو دراصل ایک میزان عدل ہے اور اس لیے اتارا ہے کہ ہر شخص اس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل۔ چنانچہ تولنے کے لیے یہی ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر اسے تولا جا سکے۔
﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا﴾
''بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان اتارا ہے، اس لیے کہ وہ دنیا والوں کے لیے نذیر بنے''۔
یہ ''الْفُرْقَان'' بھی اسی مفہوم میں ہے۔ یعنی ایک ایسی کتاب جو حق و باطل میں امتیاز کے لیے حجت قاطع ہے۔ یہاں بھی وہی حقیقت بیان کرنا پیش نظر ہے کہ ہر معاملے میں یہی کتاب قول فیصل اور یہی صحیفہ معیار ہے۔ تمام اختلافات میں یہی مرجع قرار پائے گی۔ اس پر کوئی چیز حاکم نہیں ہو سکتی، بلکہ علم و ہدایت کے قلمرو میں ہر جگہ اسی کی حکومت قائم ہوگی اور ہر شخص پابند ہے کہ

اس پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے۔ (میزان: ص:۲۴)

غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کی یہ حیثیت ہے جو اس نے خود اپنے لیے ثابت قرار دی ہے۔ لہذا اس کی بنیاد پر جو باتیں قرآن کے بارے میں بطور اصول ماننی چاہییں، وہ یہ ہیں:

پہلی یہ کہ قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔ دین میں ہر چیز کے رد وقبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہوگی اور اسی پر ختم کر دی جائے گی۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القاء، ہر تحقیق اور ہر رائے کو اس کے تابع قرار دیا جائے گا اور اس کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے گی کہ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اس کی حکومت قائم ہے اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جاسکتی۔

دوسری یہ کہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملے میں بھی اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں، وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن۔ اس کے شہرستان معانی تک پہنچنے کا ایک ہی دروازہ ہے اور وہ اس کے الفاظ ہیں۔ وہ اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔ اس میں کسی ریب و گمان کے لیے ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ دونوں باتیں قرآن کے میزان اور فرقان ہونے کا لازمی تقاضا ہیں۔ ان کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ (میزان ص:۲۵)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے میزان اور فرقان کے عنوان کی مناسبت سے مندرجہ بالا عبارت لکھ ڈالی ہے

اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ اس نے آیت میں المیزان کے لفظ کو کتاب کے لیے عطف تفسیر قرار دیا ہے جو عام مفسرین کے خلاف ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ غامدی صاحب قرآن مجید کی عظمت کو بیان کر کے احادیث کو مسترد کرنا چاہتا ہے وحی جلی کو قرآن سے باہر چیز قرار دیا حالانکہ وحی جلی خود قرآن ہے۔ یہ غامدی صاحب کی بے علمی کا شاہ کار ہے پھر وحی خفی سے احادیث مراد ہے غامدی صاحب احادیث کو قرآن سے الگ چیز قرار دے رہے ہیں یہی ان کا اور ان کے بڑوں کا مشن ہے پھر متصل عبارت میں غامدی صاحب نے ''خدا کا پیغمبر'' کے جملہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تحقیر کی ہے اگر چہ اس نے اس کا ارادہ نہیں کیا ہوگا مگر انداز کلام قبیح اور جملے رکیک ہیں آیندہ عنوان ''حدیث اور قرآن'' کے تحت غامدی کی عبارت تحدید و تخصیص پر میں نے بھرپور کلام کیا ہے جو زیر نظر عبارت پر بھی خوب تبصرہ ہے انتظار کیجئے۔

جناب غامدی صاحب کے سوالات اور خود ان کی طرف سے جوابات

جناب غامدی صاحب نے اپنی کتاب میزان میں جو اصول مبادی کے عنوان سے ایک بحث کو چھیڑا ہے اس کے ضمن میں غامدی صاحب نے چند سوالات بنائے ہیں اور پھر اس کا جواب دیا ہے پہلا سوال قرآن عظیم میں اختلافات قرأت سے متعلق ہے غامدی اور ان کے اکابر کا عقیدہ ہے کہ قرآن کی صرف ایک قرأت ہے متعدد قرأت عجمی فتنوں کا حصہ ہے جو ہمارے مدارس میں داخل ہو چکا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں اگر متشابہات ہیں تو قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب محکم اور یقینی نہیں رہے گی۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ احادیث میں بعض ایسی حدیثیں ہیں کہ وہ قرآن کی آیات واضحات کے منافی ہیں اس کا کیا حل ہے؟ اس کی تفصیل غامدی صاحب یوں بیان کرتے ہیں؛

قرأت کے اختلافات کی بحث

غامدی صاحب نے اپنے بنائے ہوئے سوالات میں سے پہلے سوال کا جواب یوں دیا ہے: پہلے

سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں امت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے۔ یہ تلاوت جس قرأت کے مطابق کی جاتی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری قرأت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال ہمارے نزدیک سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

تبصرہ نمبرا:

غامدی صاحب اپنے مطلب تک پہنچنے کے لیے سب کچھ کر جاتے ہیں قرآن عظیم میں اختلاف قرأت پر کئی شبہے ظاہر کیے اور کئی تشکیکات پیدا فرمائے پھر مؤطا مالک کی ایک صحیح روایت کا قصہ چھیڑا اس روایت کا خلاصہ ومفہوم یہ ہے کہ ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے سورت فرقان کو اس قرأت کے ساتھ پڑھا جو حضرت عمر کی قرأت کے مخالف تھی حضرت عمر اس کو کھینچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے آنحضرت نے دونوں کی قرأت سن کر دونوں کو صحیح قرار دیا اور پھر فرمایا کہ یہ قرآن سات حرفوں پر اترا ہے تم جس کو آسان سمجھو اس کے مطابق پڑھو (مؤطا مالک حدیث:۵٦۷)

یہ کافی لمبی حدیث ہے جس کا قصہ سیدنا عمر جیسے انتہائی محتاط خلیفہ راشد سنا رہے ہیں اس کو نقل کر کے غامدی صاحب اس کو یوں مسترد کر کے کہتا ہے اس روایت کے بارے میں ذیل کے چند حقائق اگر پیش نظر رہیں تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بالکل ہی بے معنی روایت ہے جسے اس بحث میں ہرگز قابل اعتناء نہیں سمجھنا چاہیے (میزان ص:۳۰)

یہی معاملہ ان روایتوں کا بھی ہے جو سیدنا صدیق اور ان کے بعد سیدنا عثمان کے دور میں قرآن کی جمع وتدوین سے متعلق حدیث کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں (میزان ص:۳۱)

غامدی صاحب نے دسیوں صحیح احادیث کو بے معنی اور مہمل قرار دیا۔ غامدی صاحب سے پوچھنا

چاہیے کہ قرآن کی ایک قرأت ہونے پر تمہارے پاس کونسی دلیل ہے صحابہ کرام جو قرآن کے سب سے پہلے مخاطب تھے ان کی آنکھوں کے سامنے قرآن اترا وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کئی لغات پر اترا۔ غامدی صاحب کہتے ہیں کہ ان کی روایات بے معنی اور مہمل ہیں حضرت حذیفہ بن یمان جب عراق کے گورنر تھے اور اختلاف لغات کی وجہ سے انہوں نے لوگوں کے جھگڑوں کو دیکھا تو مدینہ منورہ آکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''ادرک هذه الامة قبل أن تهلک''

(بخاری وترمذی)

اس امت کو اس سے پہلے بچالو کہ کہیں اپنی کتاب میں اختلاف لغات کی وجہ سے اختلاف میں پڑ کر ہلاک نہ ہو جائے پھر تمام صحابہ کرام کی موجودگی میں حضرت عثمان نے قرآن عظیم کو قریش کی لغت پر جمع فرمادیا غامدی صاحب ان تمام سرگزشت کو بے معنی مہمل اور نا قابل اعتبار کہتا ہے اب ایسے خودسر شخص کا کیا علاج ہوسکتا ہے جو مستند واقعات اور احادیث کو مسترد کرتا ہے اس کو مہمل کہتا ہے اور کسی بھی دلیل کے بغیر اپنا باطل نظریہ اور مہمل رائے دوسروں پر مسلط کرتا ہے غامدی صاحب کے اس مہمل کلام کے زد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صحیح احادیث بھی آجاتی ہیں جس کو بخاری ومسلم ابوداؤد اور نسائی نے ذکر کیا ہے جس میں آنحضرت نے فرمایا ''اُنزل الْقُرآن عَلٰی سَبْعَة اَحْرُفٍ'' کہ قرآن سات حرفوں اور سات لغات پر اترا ہے۔

غامدی صاحب نے ان روایات کی سند میں ابن شہاب زہری کو دیکھا تو جل بھن گیا اور ان کو سخت سست کہا میزان ص:۳۱ کو دیکھ لیا جائے وہ ابن شہاب زہری کو کس انداز سے پیش کر رہا ہے چونکہ ابن شہاب زہری احادیث کے پہلے شیخ اور امام ہیں اس لیے منکرین حدیث سب سے پہلے ان پر حملہ آور ہوتے ہیں امین احسن اصلاحی کہا کرتے تھے کہ اگر مجھے ابن شہاب زہری مل جائے تو میں اس کو ذبح کر کے کباب بنادوں گا (رواہ عنہ المفتی سعید احمد خان ندوی مدظلہ العالی)

غامدی صاحب دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مزید لکھتے ہیں کہ:

یہ ان روایتوں کی حقیقت ہے، لہذا یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی ایک ہی قرأت ہے جو ہمارے

مصاحف میں ثبت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی جو قرائتیں تفسیروں میں لکھی ہوئی ہیں یا مدرسوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں یا بعض علاقوں میں لوگوں نے اختیار کر رکھی ہیں، وہ سب انہی فتنوں کے باقیات ہیں جن کے اثرات سے ہمارے علوم کا کوئی شعبہ، افسوس ہے کہ محفوظ نہیں رہ سکا۔

تبصرہ:

غامدی صاحب کا خیال ہے کہ لغات اور قراآت کا یہ مسئلہ مفسرین اور مدرسوں اور بعض علاقائی لوگوں کا پیدا کردہ ہے وہ علم اور علماء اور مدرسوں و درسگاہ کے ماحول سے نا آشنا ہے اس لیے یہ خیال باطل باندھا ہے کہ قرأت کا اختلاف مدرسوں نے پیدا کیا ہے اور عرضۂ اخیرہ میں صرف ایک قرأت تھی علماء کہتے ہیں کہ قرآن سات لغات پر پڑھا جاتا ہے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر آدمی بیک وقت سات لغات پر پڑھتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ پورے خطے میں مختلف قبائل اپنی اپنی لغت میں بعض لغات استعمال کرتے تھے عرضۂ اخیرہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قریش کی لغت پر حضرت جبریل نے قرآن پیش کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ نزول قرآن کے وقت جن دیگر لغات کی اجازت تھی وہ عرضۂ اخیرہ کے وقت ختم ہوگئی وہ لغات تو حضرت عثمان کے عہد خلافت تک باقی تھیں پھر حضرت عثمان نے صرف قریش کی لغت پر قرآن کو جمع کیا کیونکہ اصل میں قرآن اسی لغت پر اترا تھا آج ہمارے ہاتھ میں مصحف عثمانی اسی کی یادگار رہ باقی ہے لغت قریش میں بھی ایک حد تک قراآت کا اختلاف تھا اسی سے قراء سبعہ نے قرأت اخذ کیا ہے تو سات قرأت سامنے آگئیں ان قرأتوں کو ان قاریوں نے اپنی طرف سے ایجاد نہیں کیا بلکہ اس کا مأخذ وہی لغت قریش کی مختلف لغات ہیں البتہ جس قاری نے جس قرأت میں محنت کی اور اس میں کمال پیدا کیا تو وہ قرأت اس کے نام کی طرف منسوب ہوگئی غامدی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت میں جو اعتراض ہے وہ تو قرأت سے متعلق ہے قراء سبعہ کی قراآت اور چیز ہیں اور نزول قرآن علی سبعۃ احرف اور چیز ہے غامدی صاحب خلط بحث کر رہے

ہیں وہ بخاری و مسلم و موطا مالک اور صحاح ستہ میں مذکور حضرت عمر اور حضرت ہشام بن حکیم کی صحیح اور مستند روایت کو مہمل کہہ رہے ہیں اور اس کو بالکل ہی بے معنی کے الفاظ سے یاد کر رہے ہیں، دو جلیل القدر صحابہ حضرت عمر فاروق اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہما کی مشترکہ نقل کردہ حدیث اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آمنے سامنے قضیہ اور محکمہ اور واضح فیصلہ کو بے معنی یعنی مہمل اور فضول کہنا تو قریب قریب موجب کفر ہے اس مقام پر غامدی صاحب نے سطحی اور فرضی اعتراضات بھی بنائے ہیں جو سب فضول اور بے مقصد ہیں۔

حضرت عمر اور حضرت ہشام دونوں اگرچہ قریشی ہیں لیکن علماء نے تصریح کی ہے کہ قریش کی لغت کے اندر بھی قبائل کا اختلافِ لغات موجود تھا سارے قریش صرف ایک قبیلہ کے لوگ تو نہیں تھے اسی مقام سے تو سات قرأتوں کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے علماء نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ عرضۂ اخیرہ میں حضرت جبریل نے جو قرآن آنحضرت کو پڑھکر سنایا تھا وہ بے شک لغت قریش پر پڑھا تھا لیکن اس لغت میں بھی قریش کے منتشر قبائل کی لغات کا خیال رکھا گیا تھا ''التبیان فی علوم القرآن'' میں شیخ محمد علی الصابونی نے ص: ۵۸ پر اجمالی طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے:

ثُمَّ اِنَّ الصَّحَابَہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ قَدۡ اخۡتلف اَخۡذھُمۡ عَنۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ فَمِنۡھُمۡ مَنۡ قَرَأَ بِحَرۡفٍ وَمِنۡھُمۡ مَنۡ اَخذَ عَنۡہُ بِحَرۡفَیۡنِ وَمِنۡھُمۡ مَنۡ زَادَ الخ

ترجمہ: ''پھر صحابہ کرام نے مختلف انداز سے یہ قرأت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لی پس بعض صحابہ نے آنحضرت سے ایک لغت پر لیکر پڑھا اور بعض نے دو لغات پر لیکر پڑھا بعض نے اس سے بھی زیادہ پر لیکر پڑھا پھر صحابہ کرام اسی حال پر مختلف شہروں میں پھیل گئے پھر حضرت عثمانؓ جب مصاحف کو مختلف اطراف کی طرف بھیجنے لگے تو ہر مصحف کے ساتھ ایسے آدمی کو بھیجا جس کی غالب قرأت اس مصحف کے موافق تھی پھر جب صحابہ کرام انہیں مختلف قرأتوں کے ساتھ مختلف شہروں میں پھیل گئے تو ان سے تابعین اور تبع تابعین نے یہ قرأت لے لی اسی وجہ سے تابعین کی قرأتوں میں بھی یہ اختلاف آ گیا یہاں تک کہ مشہور قراء سبعہ کے اماموں تک یہ معاملہ پہنچ گیا یہ

ایسے امام قرأت تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو قرأت ہی کے لیے وقف کیا تھا اور اس میں مہارت پیدا کر لی تھی انہوں نے قرأت کے فن کو مضبوط کیا اس کا اہتمام کیا اور اس کو پھیلا دیا۔ یہ ہے قرأت کے فن کی بنیاد اور اس میں اختلاف کی وجہ اگر چہ یہ اختلاف حقیقت میں معمولی چیزوں میں ہے اور بنسبت اتفاق یہ اختلاف بہت ہی کم ہے نیز یہ اختلاف انہیں سات لغات کے دائرہ کے اندر ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا قرآن نازل ہوا ہے۔

(التبیان فی علوم القرآن علی الصابونی ص:۵۸)

شیخ صابونی کی اس عبارت کے بعد ائمہ قرأت کے نام اور مختصر احوال بھی ملاحظہ فرمائیں، اور ہر قاری کی تائید و توثیق میں اکابر امت کے کلمات بھی ملاحظہ ہوں۔

قراء سبعہ کے عربی حالات کا اردو ترجمہ

(۱) امام نافع مدنی رحمہ اللہ، تبع تابعی

(۱) قرأۃ نافع سنت ہے (مالکؒ، عبداللہ بن وہبؒ) مجھ سے مالک نے فرمایا کہ میں نے نافع سے قرآن پڑھا ہے (اسماعیل بن ابی اویس)

(۲) قراءۃ اہل مدینہ مجھے بہت محبوب ہے (احمد بن حنبل)

(۳) قرأت میں نافع بن ابی نعیم امام الناس تھے (لیث بن سعد)

(۴) میں نے خواب میں دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے مونہہ میں قرآن شریف پڑھ رہے ہیں پس اسی وقت سے میں اپنے مونہہ سے کستوری کی یہ خوشبو سونگھتا ہوں (نافع)

(۲) امام عبداللہ بن کثیر مکی، تابعی رحمہ اللہ

(۱) مکہ میں ابن کثیر سے بڑا کوئی قاری نہ تھا (سفیان بن عیینہ)

(۲) ہماری قرأت، قراءۃ عبداللہ بن کثیر ہے۔ اہل مکہ کو میں نے اسی پر پایا ہے، جو قرأت

کاملہ کا خواہشمند ہو وہ قراءۃ ابن کثیر پڑھے (امام شافعی)

(۳) ابن کثیر کی حدیث، صحیحین میں مخرّج ہے، نیز موصوف کی حدیث کتب ستہ میں مخرج ہے (ذہبی، معرفۃ القراء الکبار ص:۷۲ ج۱) (دفاع قراآت ص:۱۰۵)

(۴) (وہ) قرآن میں فصیح تھے (جریر بن حازم)

(۵) میں نے یہ ماجرا دیکھا کہ ابوعمرو بن علاء حضرت عبداللہ بن کثیر کے سامنے قرأت کی بابت زانوائے تلمذ طے کر رہے ہیں (حماد بن سلمہ)

(٦) ابن کثیر عربیت میں مجاہد سے اعلم تھے (ابوعمرو بن علاء)

(۳) امام ابوعمرو بن العلاء بصری تابعی عربی النسل

آپ کے رواۃ میں ابوعمر دوری بھی ہیں جن سے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت حدیث کی ہے۔

(۱) ابوحاتم کہتے ہیں صدوق۔ یعنی وہ سچے تھے۔

(۲) امام ابوداؤد فرماتے ہیں میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا کہ ابوعمرو دوری سے حدیث لکھ رہے تھے۔

(۳) قراءۃ ابی عمرو مجھے احب القرآت ہے۔ یہ قریش کی قرأت ہے۔ فصحاء کی قرأت ہے (احمد بن حنبل)

(۴) میں نے اس علم میں نظر کی جبکہ میرے ختنہ بھی نہیں ہوئے تھے اور اب میری چوراسی سال عمر ہے۔ (ابوعمرو) اشراف وسادات عرب میں سے تھے (ابوعبیدہ)

(۵) ابوعمرو ثقہ ہیں (یحیٰ بن معین)

(٦) بصرہ میں علماء قرآن کی ایک جماعت آپ کی معاصر تھی مگر اس میں سے کوئی بھی آپ کے مرتبہ تک نہ پہنچ سکا (ابوبکر بن مجاہد) (دفاع قراآت ص:۱۰٦)

(۷) ابوعمرو قرآت ونحو وفقہ میں علامۃ الزمان تھے اور کبار علماء عاملین میں شمار ہوتے تھے

(ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ)

(۸) اپنے زمانہ میں مقدم وفائق، قرأت اور اس کی توجیہات کے عالم اور علم لغت عربیہ میں مقتدا تھے (ابوبکر بن مجاہد) جس شخص کا بڑا مطمح نظر دنیا ہی ہو وہ یقیناً فریب کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں (ابوعمرو کی مہر کا نقش) بحوالہ دفاع قرآءت ص:۱۰۶ تا ۱۰۷)

(۴) امام ابن عامر شامی رحمہ اللہ تابعی جلیل عربی النسل

(۱) اہل شام کے مقری اور صدوق ہیں۔ میں ان میں کوئی حرج نہیں جانتا، آپ کی قرأت کی بابت ناواقف لوگوں نے کلام کی ہے مگر ان کی قرأت قراءۃ حسنہ ہے (ذہبی، میزان ج ۲ ص:۴۴۹)

(۲) صحیح مسلم میں موصوف کی حدیث مخرج ہے۔ من جملہ آپ کے رواۃ کے ہشام بن عمار ہیں جو بخاری کے مشائخ میں ہیں ہشام صدوق کبیر المحل ہیں۔ دار قطنی۔ ثقہ ہیں۔ یحیی بن معین۔ ہشام سے بخاری نے صحیح بخاری میں اور ابوداؤد نسائی ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت حدیث کی ہے نیز ترمذی جعفر فریابی ابوزرعہ دمشقی نے موصوف سے حدیث حاصل کی ہے۔

آپ عالم قاضی صدوق تھے۔ اہل شام نے موصوف کو ان کی اختیار کردہ قرأت میں امام تسلیم کیا ہے (ابونعیم فی الحلیہ)

عمر بن عبدالعزیز نمازوں میں آپ کی اقتدا کرتے تھے اور امامت وقضاء کے ہر دو مناصب کی جامعیت سے انہوں نے آپ کو نوازا تھا (دفاع قرآءت ص:۱۰۷ تا ۱۰۸)

(۵) امام عاصم کوفی رحمہ اللہ تابعی

(۱) عہد معاویہؓ میں پیدا ہوئے۔ مسند احمد میں آپ سے ایک مشہور حدیث مروی ہے، شیخین نے آپ کی احادیث کی تخریج کی ہے مگر اصالۃً ومستقلاً نہیں بلکہ مقروناً بالغیر۔

(۲) امام کبیر اور مقریء العصر ہیں (ذہبی سیر اعلام النبلاء، ج ۵ ص:۲۵۶)

(۳) ثقہ ہیں (احمد عجلی ونسائی)

(۴) عاصم لوگوں کو تعلیم قرأت کے لیے تشریف فرما رہتے تھے۔ صوت تلاوت میں احسن الناس تھے گویا آپ کے گلے میں گھنٹیاں بج رہی ہیں (ابوبکر بن عیاش)

(۵) اہل کوفہ قرأت عاصم پسند کرتے ہیں میں بھی اسے پسند کرتا ہوں (احمد بن حنبل)

(٦) قرأت میں پختہ کار ہیں۔ البتہ حدیث میں ثبت سے کم درجہ ہیں۔ بہت راستباز ہیں کبھی وہم لاحق ہو جاتا ہے۔ حسن الحدیث ہیں احمد و ابوزرعہ کے بقول ثقہ ہیں

(ذہبی میزان الاعتدال ج:۲ص:۳۵۷)

(٦) امام حمزہ کوفی رحمہ اللہ تابعی

(۱) یہ قرآن کے متبحر عالم ہیں۔ (اعمش)

(۲) دو چیزوں میں آپ ہم پر غالب ہیں ان میں ہم آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے قرأت اور علم میراث۔ (ابوحنیفہ)

(۳) آپ سے سفیان ثوری، شریک بن عبداللہ، وکیع اور ائمہ اہل کوفہ کی ایک جماعت نے قرأت پڑھی ہے شدید موسم گرما میں ایک روز حمزہ زیات کا میرے پاس سے گذر ہوا میں نے پینے کا پانی پیش کیا تو انکار فرما دیا کیونکہ میں آپ سے قرأت پڑھتا تھا

(جریر بن عبدالحمید، وقائع قراآت ص:۱۰۸و۱۰۹)

(۷) امام کسائی کوفی رحمہ اللہ

(۱) اپنے زمانہ میں عربیت کے نیز قرأت میں لوگوں کے امام تھے۔ (ابن مجاہد)

(۲) نافع کے کبار تلامذہ میں سے ہیں۔ میں نے کتاب اللہ کا کسائی سے بڑا قاری نہیں دیکھا (اسماعیل بن جعفر مدنی)

(۳) جو شخص نحو میں تبحر کا متمنی ہے وہ کسائی کا دست نگر ہے (امام شافعی)

(۴) میں نے ایک روز کسائی سے خوب بڑھ چڑھ کر مناظرہ کیا تو گویا میں ایک پرندہ تھا جو دریا

سے پانی پی رہا تھا (فراء)

(۵) نحو میں اعلم الناس اور حدیث کے مشکل الفاظ نیز قرأت میں سب لوگوں میں لاثانی تھے

(ابو بکر بن الانباری)

(٦) بحالت احرام کمبل میں ملبوس تھے ۔ (امام شاطبی دفاع قرآآت ص:۱۰۹)

بُدورسبعہ اوران کے چودہ رواۃ

(۱) امام نافع مدنیؒ (۲) امام ابن کثیر مکیؒ

قالون ۱، ورش ۲ بزّی ۳، قنبل ۴

(۳) امام ابو عمرو بصریؒ (۴) امام ابن عامر شامیؒ

دوری ۵ ، سوسی ٦ ہشام ۷ ، ابن ذکوان ۸

(۵) امام عاصم کوفیؒ (٦) امام حمزہ کوفیؒ

شعبہ ۹ ، حفص ۱۰ خلف ۱۱ ، خلاد ۱۲

(۷) امام ابو الحسن کسائی کوفی رحمھم اللہ

ابوالحارث ۱۳ دوری علی ۱۴

(بحوالہ علم قرآآت قاری ابوالحسن اعظمی دارالعلوم دیوبند)

قراء سبعہ کی قرأتوں کی تشکیل اور طبقات کی مباحث کے بعد مؤلف رحمہ اللہ کی طرف سے قرأت پر تاریخی تبصرہ ملاحظہ فرمائیں

پھر مروجہ قرآآت کی اسانید میں مندرجہ ذیل صحابہ کرام مدار و مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ حضرت عثمان ۔۲۔ حضرت علی ۔۳۔ حضرت ابن مسعود ۔۴۔ حضرت زید بن ثابت ۔۵۔ حضرت ابی بن کعب ۔٦۔ حضرت ابوالدرداء ۔۷۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم ۔

اوّلاً حضور علیہ السلام نے ان سات صحابہ کرام میں سے ہر ایک کو اصول ولغات تو خاص انہی کے

لغت اور قبیلہ کے مطابق ہی پڑھائیں البتہ فرش الحروف قسم کی وجوہ خلافیہ منزلہ تقسیم کر کے متفرقاً پڑھائیں کہ بعض وجوہ ایک صحابی کو اور بعض دوسرے کو وعلی ھذا القیاس۔ ثانیاً ان سات صحابہ کرام سے یہی اختلافات جو بطریق تواتر وقطعیت، آخری دور نبوی کے مطابق ثابت ومروی تھے انہیں اختلافات کی مصاحف عثمانیہ میں رعایت کی گئی ہے اور ان کے علاوہ باقی قراآت واختلافات احادیہ شاذہ کی رعایت کو ترک کر دیا گیا۔ ثالثاً آگے ان ساتوں صحابہ کرام نے یہی خاص خاص اختلافات جو تلقین نبوی سے پڑھے اور محفوظ کیے تھے ان ائمہ قراآت کو بالواسطہ یا بلاواسطہ پڑھائے۔ بعض ائمہ قراآت نے ان ساتوں میں سے کئی صحابہ سے پڑھا بس یہی وہ مرحلہ ہے جس میں بعض لغات کا بعض لغات میں اور بعض صحابہ کرام کے منقول فرش الحروف کا دوسرے بعض صحابہ کرام کے منقول فرش الحروف کے ساتھ باہم انضمام وتداخل واجتماع وتشارک شروع ہوا۔ اور اسی بنیاد پر اور انہیں منقول وجوہ کی روشنی میں آگے ائمہ قراآت نے ذاتی وشخصی طور پر خاص خاص مختلف الانتخاب ترتیبات اور متعدد اختیارات کی تدوین کی اور یہی اختیارات آگے قراآت کے نام سے موسوم ہوئے۔

نتیجہ یہ کہ مروجہ قراآت عشرہ کی ترتیب اس طریقہ سے ہوئی کہ مصاحف عثمانیہ کے متعدد مقری صحابہ کرام سے تابعین نے اور ان سے ائمہ مشہورین نے احرف سبعہ کو اپنے مابعد کے لوگوں تک نقل کیا تو وہ لغات باہم متداخل اور مخلوط ہو گئیں حتی کہ متعدد صحابہ سے اخذ کرنے والا قاری کچھ حصہ ایک صحابی کی تلقین کردہ لغت کے مطابق اور کچھ دوسرے صحابی کی تلقین کردہ لغت کے مطابق پڑھنے لگا اسی کے نتیجے میں صحابہ کرام سے اخذ کردہ قراآت متعدد ہو گئیں مگر یہ سب احرف سبعہ سے خارج قطعاً نہیں، تو یہ سب قراآت کثیرہ منتشرہ نتیجہ ہیں نزول القرآن علی سبعۃ احرف کا، ہر قراآت کی ترتیب فقط ایک ہی لغت عربیہ کے لحاظ سے نہیں کہ پورا قرآن من اولہ الی آخرہ فقط اسی ایک ہی لغت کے مطابق پڑھا جاتا ہو اور دوسری لغات میں سے کسی لغت کا کوئی لفظ بھی قطعاً اس میں شامل نہ ہو ایسا ہرگز نہیں بلکہ ہر قراآت میں سب کی سب لغات عرب کا اشتراک

وتداخل موجود ہے۔ (بحوالہ دفاع قراآت ص:۱۱۰ تا ۱۱۲ مصنفہ قاری محمد طاہر رحیمی مدنی)

قراآت کے اختلاف سے متعلق جاوید غامدی صاحب کے انکار کی حقیقت واضح ہوگئی ان مستند روایات اور مستند واقعات قراء اور علماء کرام اور فقہاء عظام اور محدثین ومفسرین وشارحین کی متفقہ تحقیقات کو یکسر مسترد کرنا غامدی صاحب کی گمراہیوں میں سے ایک گمراہی ہے کسی دلیل کے بغیر سلف وخلف کے اجماعی عقیدہ کو یکسر عجمی فتنہ کہنا اور بخاری ومسلم کی سبعہ احرف والی حدیث کو ٹھکرانا ان صاحب کی یاوہ گوئی کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔آپ خود سوچ لیں اس طرح غلط نظریات کا حامل شخص قرآن کا مفسر بن کر قرآن میں کس طرح تحریفات کا ارتکاب کرے گا۔

قیاس کن زِ گلستان من بہار مرا

جس شخص نے تفسیر میں اس طرح غلط بنیادیں اور غلط اصول وضع کیے ہیں ان کی تفسیر کی حقیقت کیا ہوگی؟ شاعر نے سچ کہا ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

جب معمار تعمیر کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو آسمان تک دیوار ٹیڑھی جائے گی۔

محکم اور متشابہ

غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات ہی صحیح نہیں ہے کہ محکم اور متشابہ کو ہم پورے یقین کے ساتھ ایک دوسرے سے ممیّز نہیں کر سکتے یا متشابہات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔قرآن کی وہ سب آیتیں محکم ہیں جن پر اس کی ہدایت کا مدار ہے اور متشابہات صرف وہ آیتیں ہیں جن میں آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت یا نقمت کا بیان تمثیل اور تشبیہ کے انداز میں ہوا ہے یا اللہ تعالیٰ کے صفات وافعال اور ہمارے علم اور مشاہدے سے ماورا

اس کے کسی عالم کی کوئی بات تمثیلی اسلوب میں بیان کی گئی ہے، مثلاً آدم میں اللہ تعالیٰ کا اپنی روح پھونکنا یا سیدنا مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا کرنا یا جنت اور جہنم کے احوال و مقامات وغیرہ۔ وہ سب چیزیں جن کے لیے ابھی الفاظ وجود میں نہ آئے ہوں، انہیں تمثیل اور تشبیہ کے اسلوب ہی میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ کسی نادیدہ عالم کے حقائق دنیا کی سب زبانوں کے ادب میں اسی طرح بیان کیے جاتے ہیں۔ آج سے دو صدی پہلے ہم میں سے کوئی شخص اگر مستقبل کا علم پا کر بجلی کے قمقموں کا ذکر کرتا تو غالباً اسی طرح کرتا کہ دنیا میں ایسے چراغ جلیں گے جن میں نہ تیل ڈالا جائے گا اور نہ انہیں آگ دکھانے کی ضرورت ہوگی۔ متشابہ آیات کی نوعیت بالکل یہی ہے۔ وہ نہ غیر متعین ہیں اور نہ ان کے مفہوم میں کوئی ابہام ہے۔ ان کے الفاظ عربی مبین ہی کے الفاظ ہیں اور ان کے معنی بھی ہم بغیر کسی تردد کے سمجھتے ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ ان کی حقیقت ہم اس دنیا میں نہیں جان سکتے، لیکن اس جاننے یا نہ جاننے کا قرآن کے فہم سے چونکہ کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کسی صاحب ایمان کو اس کے درپے بھی نہیں ہونا چاہیے۔ (میزان ص: ۴۳، ۴۴)

تبصرہ

چونکہ غامدی صاحب اور ان کے استادوں کے ہاں یہ بات طے شدہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے "قرآن مبین" فرمایا ہے لہذا یہ حرف بحرف واضح اور نور ہے یہ میزان ہے یہ فرقان ہے اس میں کوئی لفظ یا جملہ ایسا نہیں ہے جو مخاطب پر مخفی اور پوشیدہ ہو اگر اس میں کوئی چیز فہم سے بالاتر ہو جائے تو پھر اہل باطل قرآن پر اعتراض کریں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کیسا کلام ہے جو کسی کے سمجھ میں نہیں آسکتا ہے ان لوگوں کی یہ بات تو عمدہ ہے اور یہ ساری امت کا عقیدہ ہے کہ قرآن مبین اور واضح کتاب ہے لیکن غامدیوں نے اس سے ایک غلط نتیجہ نکالا ہے وہ یہ کہ غامدی اور ان کے استادوں نے آیات متشابہات کا انکار کیا کہ قرآن میں کوئی لفظ متشابہ نہیں ہے اس گروہ نے سورتوں کی ابتداء میں حروف مقطعات کو بھی متشابہات سے خارج کر دیا ہے چنانچہ "الم" کا

ترجمہ کرتے ہیں کہ یہ الف لام میم ہے۔ادھر جب انہوں نے سورت آل عمران کی آیت ﴿وَهُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (آل عمران آیت:۷)

ترجمہ وہی اللہ ہے جس نے تم پر کتاب اتاری جس میں کچھ آیتیں محکم ہیں جو کتاب کی بنیاد ہے اور کچھ دوسری متشابہات ہیں، کو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں کچھ آیات کو متشابہات کہا ہے اور کہا ہے کہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔تو یہ لوگ اپنے دعوے کے پیش نظر پریشان ہو گئے اسی لیے انہوں نے متشابہات کو ایسے معنی پہنا دیے جس سے انہوں نے قرآن عظیم کی کئی آیات میں تحریف کا ارتکاب کیا اور کئی احادیث کا انکار کرنا پڑا۔ یہاں بھی اوپر غامدی صاحب کا کلام سب کے سامنے ہے وہ متشابہات کو آخرت کے مغیبات پر حمل کر رہا ہے آیندہ آنے والے انکشافات اور ترقیات اور بجلی کے قمقموں پر حمل کرر ہا ہے اور امت کے فقہاء علماء مفسرین کا مذاق اڑا رہا ہے۔ یہی کام اس سے پہلے حمید الدین فراہی نے کیا ہے اور یہی کام تدبر قرآن ج ۱ ص:۶۲۷ پر امین احسن اصلاحی نے کیا ہے جس کا جواب میں نے اس سے پہلے انتہائی تفصیل سے لکھا ہے وہاں دیکھ لینا چاہیے۔۔اوپر غامدی صاحب کی عبارت میں ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ متشابہ کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے اور اس میں ہر آدمی امتیاز کر سکتا ہے میں ان سے پوچھتا ہوں اگر ایسا ہے تو غامدی صاحب خود بتائیں کہ الٓمٓ کا مطلب کیا ہے الٓمٓر کا مطلب کیا ہے کٓھٰیٰعٓصٓ کا مطلب کیا ہے وہ اپنی پوری جماعت کے ساتھ زندگی بھر اس کا جواب نہیں دے سکتے ہیں غامدی اور ان کے اساتذہ ان حروف مقطعات کا ترجمہ یوں کرتے ہیں ''الٓمٓ'' یہ الف لام میم ہے ان لوگوں نے قرآن عظیم کا مذاق اڑایا ہے اس کہنے کی ضرورت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ الف لام میم ہے کیا یہ حروف نظر نہیں آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مخاطبین کو بتا رہے ہیں اور دکھا رہے ہیں کہ یہ الف ہے لام ہے میم ہے پھر اس سے انسان کو کیا تعلیم دی جا رہی ہے؟ قرآن کے اس بحر ذخار کا اس طرح مذاق اڑانا انہیں لوگوں کا کام ہے جو قرآن کو اپنے مطلب پر ڈالنا چاہتے ہیں۔اہل حق

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حروف اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بھید اور راز ہیں اس کا مطلب اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے ہمارا اس مطلب پر ایمان ہے ''اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذَالِکَ'' یہ تو حروف مقطعات کے متشابہات کی بات ہے جو نہ معلوم المعنی ہیں اور نہ معلوم المراد ہیں لیکن دوسری قسم وہ متشابہات ہیں جو معلوم المعنی تو ہیں لیکن معلوم المراد نہیں ہیں جیسے: یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ، وَجْہُ اللّٰہِ، سَاقُ اللّٰہِ۔ اس کے متعلق سلف وخلف امت کے فقہاء اور علماء فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں یہ کہا جائے ''مَا یَلِیْقُ بِشَانِہٖ'' یعنی جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اس واضح شاہراہ کو چھوڑ کر غامدی صاحب اور ان کے احباب پگڈنڈیوں میں گھوم رہے ہیں امت کے ہزاروں علماء فقہاء اور خود قرآن کا واضح اعلان تو ان کے لیے دلیل نہیں بنا اور اپنی ذہنی اختراعات کو دلیل بنا کر الگ راستہ اختیار کیا صاف ظاہر ہے کہ متشابہات کے بارے میں ان لوگوں نے کئی آیت میں تحریف کی اور کئی احادیث کا انکار کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کو متشابہات میں شمار کرنا غامدی صاحب کی غلطی ہے آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا حضرت عیسیٰ کو بن باپ پیدا کیا اس میں متشابہات کا کیا کام ہے؟

حدیث اور قرآن

غامدی صاحب نے ایک سوال خود بنایا اور کہ بعض حدیثوں کے مضمون سے بظاہر قرآن کے منشا میں تغیر ہو جاتا ہے۔ علما بعض مقامات پر اسے نسخ اور بعض پر تحدید و تخصیص اور تقیید وغیرہ کی اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ چیز اگر مان لی جائے تو پھر قرآن کی وہ حیثیت کس طرح تسلیم کی جاسکتی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے؟ (میزان ص: ۲۷)

غامدی صاحب نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید وتخصیص کا یہ مسئلہ سوء فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے

سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے، کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔ قرآن کے بعض اسالیب اور بعض آیات کا موقع ومحل جب لوگ نہیں سمجھ پائے تو ان سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی صحیح نوعیت بھی ان پر واضح نہیں ہوسکی۔ اس طرح کی جتنی مثالیں بالعموم پیش کی جاتی ہیں، ان سب کا معاملہ یہی ہے۔ ان میں سے بعض روایتوں کی سند پر بھی اعتراضات ہیں، (میزان ص: ۳۵)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے اپنی طرف سے قرآن عظیم کے ناموں میں ایک نام کا اضافہ کیا اور کہا کہ قرآن میزان ہے حالانکہ علامہ سیوطی نے قرآن کے سارے نام گنائے ہیں اس میں میزان کا نام مذکور نہیں ہے غامدی نے سورت شوریٰ کی آیت ۱۷ سے میزان کا نام اخذ کیا ہے۔ آیت یہ ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَان﴾ (شوریٰ: ۱۷)

غامدی نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری یعنی میزان نازل کی ہے۔ اس ترجمہ میں غامدی نے اپنے مطلب نکالنے کے لیے غلط طریقہ اختیار کیا ہے اور میزان کو کتاب کے لیے عطف تفسیر بنا دیا ہے حالانکہ شیخ الہند نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے اللہ وہی ہے جس نے اتاری کتاب سچے دین پر اور ترازو بھی۔ پھر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں تمام مفسرین کی تفاسیر کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے مادی ترازو بھی اتاری جس میں اجسام تلتے ہیں اور علمی ترازو بھی جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور اخلاقی ترازو بھی جسے صفت عدل وانصاف کہا جاتا ہے اور سب سے بڑی ترازو دین حق ہے جو خالق ومخلوق کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتا ہے اور جس میں بات پوری تلتی ہے نہ کم نہ زیادہ (تفسیر عثمانی ص: ۶۴۵)

قَالَ قَتَادَة وَمُجَاهد وَمُقَاتل بِالْعَدْلِ سمی الْعَدْل مِیْزَانًا لِاَنَّ الْمِیْزَانَ آلَةٌ

الاِنْصَافُ وَالتَّسْوِیَۃِ قال وقال ابن عباس اَمَرَ اللّٰہُ تعالیٰ بالایفاء وَنھیٰ عنِ الْبَخْسِ وَقِیْلَ المراد به الشَّرع فانّه توازن به الحقوق وتسوی بین النَّاس

(تفسیر مظہری ج۸ص:۳۱۵)

حضرت قتادہ اور مجاہد اور مقاتل نے کہا کہ آیت میں میزان سے عدل مراد ہے عدل کو اس لیے میزان کہا گیا کہ میزان انصاف اور برابری کا آلہ ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورا پورا ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور نقصان سے روکا ہے بعض نے کہا اس سے شرع مراد ہے کیونکہ شرع سے حقوق تولے جاتے ہیں، اور لوگوں میں برابری کی جاتی ہے۔ غامدی صاحب قرآن کو میزان کہہ کر احادیث کو مسترد کرنا چاہتا ہے کہ کسی حدیث سے قرآن کے کسی حکم میں تحدید و تخصیص جائز نہیں ہے حالانکہ 'احادیث ہی کے ذریعہ سے قرآن عظیم کی آیات کی صحیح تفسیر وتشریح ہوتی ہے۔ امام مکحول رحمہ اللہ اور اوزاعی شامیؒ کا یہ مستند قول موجود ہے کہ "اَلْقُرْآنُ اَحْوَجُ اِلَی السُّنَّۃِ مِنَ السُّنَّۃِ اِلَی الْقُرْآنِ"۔ (تفسیر قرطبی ج۱ص:۳۹)

یعنی قرآن عظیم اپنی تفسیر وتشریح میں احادیث کی طرف زیادہ محتاج ہے بنسبت احادیث کا قرآن کی طرف، اب غامدی صاحب نے مذکورہ بالا اپنی عبارت میں کس طرح فصاحت وبلاغت کے ساتھ صاف صاف لکھدیا ہے کہ احادیث سے قرآن کی تحدید و تخصیص نہیں ہوسکتی ورنہ قرآن کا میزان ہونا متأثر ہوجائے گا اور علماء جو بعض مقامات میں تحدید و تخصیص کرتے ہیں یہ ان کی بدفہمی کا نتیجہ ہے غامدی صاحب سے اگر پوچھا جائے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا ہے اب ان نمازوں کو پانچ اوقات کے ساتھ احادیث کے علاوہ کس چیز نے خاص کیا ہے؟ نماز میں دو یا تین یا چار رکعتوں کی تخصیص وتحدید کس طرح ہوئی ہے ہر رکعت میں دو سجدوں کی تحدید کس نے کی ہے چار رکعات میں دو قعدوں کا حکم کس نے دیا ہے وضو میں سر کا مسح ہے اس میں مقدار ناصیہ تک مسح جو مغیرہ بن شعبہ کے بیان کردہ حدیث میں ہے یہ حدیث کے ذریعہ سے سر کہ مسح میں تحدید و تخصیص نہیں ہے تو یہ کیا ہے؟

پھر حج ہے اس میں احرام کا خاص طریقہ کس نے بتایا ہے ہر علاقے کے لیے میقاتوں کی تحدید وتخصیص کس نے کی ہے احرام کے خاص لباس کی تخصیص کس نے کی ہے پھر ایام حج کی تخصیص وتحدید کس نے کی ہے پھر طواف میں سات چکر کا حکم کہاں سے ملا ہے پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کے سات چکروں کی تخصیص وتحدید کہاں سے آئی ہے میں کہاں تک گنوں شریعت کا پورا نقشہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مقدسہ کی تخصیص وتحدید سے بنا ہے اس کو غامدی صاحب مسترد کر رہا ہے جس شخص کے ہاں اصول تفسیر یہی ہو کہ قرآن میزان ہے اس کے ساتھ احادیث کا جوڑنا اور حدیث کے ذریعہ سے قرآن کو سمجھنا علماء کرام اور مفسرین کی بدفہمی ہے۔ ذرا غور کیجیے اس شخص کی تفسیر میں تحریف کا کیا حال ہوگا جو اس طرح خود ساختہ اصول بناتا ہے اور اس پر کاربند رہتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بڑی بدفہمی تو غامدی صاحب کی ہے جس نے قرآن کے مشہور ناموں میں ایک شاذ نام کو پکڑ لیا ہے اور مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ غلط کیا اور غلط تفسیر کا نقشہ ذہن میں بٹھا دیا اور ہزاروں احادیث کا انکار کیا اور یہ سب کچھ اس آڑ میں کیا کہ قرآن میزان ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ قرآن میزان ہے لیکن اس کا مطلب کیا یہ ہوا کہ احادیث کو اس کے قریب نہ آنے دیا جائے؟ اس سے پہلے بھی میزان اور فرقان پر کلام ہو چکا ہے۔ وہاں غامدی نے یہاں تک گستاخی کی ہے کہ پیغمبر خدا بھی قرآن میں تحدید وتخصیص نہیں کر سکتا ہے۔ جناب غامدی صاحب اپنی تفسیر کے لیے مزید چند اصول وضع فرما رہے ہیں ملاحظہ ہوں لکھتے ہیں:

قرآن کا یہی پس منظر ہے جس کی رعایت سے یہ چند باتیں اس کی شرح وتفسیر میں بطور اصول ماننی چاہیں:

اول یہ کہ پورا دین خوب و ناخوب کے شعور پر مبنی ان حقائق سے مل کر مکمل ہوتا ہے جو انسانی فطرت میں روز اول سے ودیعت ہیں اور جنہیں قرآن معروف و منکر سے تعبیر کرتا ہے۔ شریعت کے جو اوامر ونواہی تعین کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ ان معروفات و منکرات کے

بعد اور ان کی اساس پر قائم ہیں۔ انہیں چھوڑ کر شریعت کا کوئی تصور اگر قائم کیا جائے گا تو وہ ہر لحاظ سے ناقص اور قرآن کے منشا کے بالکل خلاف ہوگا۔

دوم یہ کہ سنت قرآن کے بعد نہیں، بلکہ قرآن سے مقدم ہے، اس لیے وہ لازماً اس کے حاملین کے اجماع و تواتر ہی سے اخذ کی جائے گی۔ قرآن میں اس کے جن احکام کا ذکر ہوا ہے، ان کی تفصیلات بھی اسی اجماع و تواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی۔ انہیں قرآن سے براہ راست اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی، جس طرح کہ قرآن کے بزعم خود بعض مفکرین نے اس زمانے میں کی ہے اور اس طرح قرآن کا مدعا بالکل الٹ کر رکھ دیا ہے۔

سوم یہ کہ الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماٴخذ ہوں گے۔ بحث و تنقید کی ساری بنیاد انہی پر رکھی جائے گی۔ اس باب میں جو روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں، انہیں ہرگز قابل التفات نہ سمجھا جائے گا۔ ان موضوعات پر جو روشنی قدیم صحیفوں سے حاصل ہوتی ہے اور قرآن کے الفاظ جس طرح ان کی تفصیلات کو قبول کرتے یا ان میں بیان کردہ کسی چیز سے متعلق اصل حقائق کو واضح کرتے ہیں، اس کا بدل یہ روایتیں ہرگز نہیں ہوسکتیں جن سے نہ قرآن کے کسی طالب علم کے دل میں کوئی اطمینان پیدا ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب ہی پر وہ کسی پہلو سے حجت قرار پا سکتی ہیں (میزان ص:۴۷)

تبصرہ:

مندرجہ بالا عبارت میں غامدی صاحب نے تفسیر قرآن کے لیے چند غلط اصول رکھے ہیں۔ پہلا غلط اصول یہ ہے کہ منکر اور معروف کا جو قاعدہ قرآن بیان کرتا ہے یہ روز اول سے انسانی فطرت میں ودیعت ہے قرآن یا دین میں جو معروف و منکر کے تذکرے ہیں وہ انہیں فطرت انسانی سے

ملکر مکمل ہو جاتے ہیں ان کو چھوڑ کر شریعت کا کوئی تصور مکمل شمار نہیں ہوگا اور وہ قرآن کے منشا کے خلاف ہوگا غامدی صاحب کی پیچیدہ اور خداع پر مبنی عبارت سے جو مطلب سمجھا جا سکتا ہے وہ یہی ہے اور ان کے اساتذہ کا وہی نظریہ ہے کہ معروف اور منکر قرآن وحدیث متعین نہیں کرتی ہے بلکہ یہ چیزیں انسانی فطرت اور معاشرہ سے حاصل ہو جاتی ہیں اس غلط اور گمراہ کن اصول سے غامدی نے بہت سارے اسلامی احکامات کو عرف اور دستور کے حوالہ کر دیا ہے ان کی تفسیر میں یہ چیزیں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں دیت کے احکامات کا انکار اسی اصول سے حاصل کیا گیا ہے دوسری بڑی غلطی جو اس عبارت میں بطور اصول بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سنت قرآن سے مقدم ہے اس خود ساختہ مبہم کلام سے غامدی صاحب احادیث مقدسہ کی حیثیت گرانا چاہتا ہے کہ حدیث سے کوئی حکم ثابت نہیں ہو سکتا ہے جگہ جگہ غامدی صاحب نے کھل کر لکھا ہے کہ احادیث سے دین کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے۔ یہ نظریہ کفر کی سرحدوں کو چھو رہا ہے۔

غامدی صاحب نے اس عبارت میں تیسرا غلط اصول یہ رکھا ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لیے سابقہ آسمانی صحیفے مثلاً تالمود اور سموئیل اور یوحنا اور لوقا کے صحیفے اور تورات وانجیل کے شواہد ضروری ہیں ان صحیفوں سے جو روشنی قرآن کی تفسیر پر پڑتی ہے وہ ہماری مروجہ روایات سے نہیں پڑتی ہے جو مفسرین نے اختیار کی ہیں یہ روایات ان کا بدل ہرگز نہیں بن سکتی ہیں۔ غامدی صاحب پر تعجب ہے کہ وہ محرف اور منسوخ صحائف کو وہ حیثیت دے رہا ہے جو مفسرین کی روایات کو نہیں دیتا اسی اصول کے تحت غامدی صاحب قرآن کی تفسیرات میں گڑ بڑ کرتا ہی رہتا ہے ان کے استاذ امین احسن اصلاحی نے بھی یہی طرز اختیار کیا ہوا ہے اور یہی طریقہ حمید الدین فراہی سے جاری ہو کر آیا ہے پھر عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں حضرات ایک انوکھا الگ تھلگ دعویٰ کرتے ہیں اور کسی دلیل دینے کی زحمت نہیں کرتے ہیں سب کچھ بلا دلیل ہانکتے رہتے ہیں اب میں غامدی صاحب کی تفسیر کی طرف آتا ہوں ان کی تفسیر کا نام ''البیان'' ہے بطور تعارف غامدی صاحب نے اس کی ابتداء میں نہایت مختصر دیباچہ رکھا ہے جو دیباچہ کے عنوان سے شروع ہے جس کے آس پاس بس

اللہ کا نام ونشان نہیں ہے اس دیباچہ کے بعد غامدی صاحب نے معمولی تفصیل کے ساتھ ایک مقدمہ بھی لکھا ہے وہاں بھی بسم اللہ لکھنے کی زحمت نہیں فرمائی ہے اس مقدمہ میں غامدی صاحب نے سات ابواب کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے کہ قرآن عظیم کے مضامین ان سات ابواب پر مشتمل ہیں باب اول کو شروع کرنے سے پہلے ایک الگ صفحہ پر غامدی صاحب نے اپنے قلم سے خوبصورت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھدیا ہے اس کے علاوہ تفسیر کی ابتداء میں نہ حمد وصلوۃ کا ذکر ہے نہ کوئی خطبہ ہے نہ کچھ ہے نہ کچھ ہے بس براہ راست فاتحہ کا ترجمہ وتفسیر ہے پھر سورۃ بقرہ سے سورت مائدہ تک پانچ سورتوں کا ترجمہ وتفسیر ہے انہی سورتوں کی تفسیر پر جلد اول مکمل ہو جاتی ہے۔ جو متوسط چھ سو پچانوے صفحات پر مشتمل ہے۔

غامدی صاحب کی یہ تفسیر امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن سے ماٴخوذ ہے لیکن جاوید غامدی صاحب چونکہ پختہ عالم نہیں ہیں اس لیے تدبر قرآن سے پورے پورے مضامین لیکر اپنی تفسیر میں درج فرماتے ہیں اور جہاں جہاں آپ نے تدبر قرآن سے مضامین کا خلاصہ لیا ہے تو خلاصہ لینے کا حق ادا نہیں کرسکا اور کوتاہیاں رہ گئیں ہاں ان حضرات کی غلطیاں مشترکہ ہیں الا ماشاء اللہ۔

اب میں غامدی صاحب کی تفسیر کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے ہر تعصب سے پاک رکھے اور میرے قلم کو غلطیوں سے محفوظ رکھے آمین یارب العالمین۔

تفسیر میں جاوید غامدی صاحب کی غلطی نمبر ۱:

یہ غلطی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ترجمہ اور تفسیر دونوں میں ہے۔ غامدی نے بسم اللہ کا ترجمہ یہ کیا ہے اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے جس کی شفقت ابدی ہے۔ یہ ترجمہ تمام مفسرین اور مترجمین کے ترجموں سے مختلف ہے اس میں رحمان اور رحیم کے مبالغہ کے مفہوم کو نظر انداز کیا گیا ہے اور رحیم کا عجیب ترجمہ کیا ہے جس نے استمرار کا مفہوم داخل کیا۔ یہ جو عربیت اور لغت کا سراسر خلاف ہے دراصل یہاں امین احسن اصلاحی صاحب نے بسم اللہ کی تفسیر میں الرحیم کا ایک مفہوم

بیان کیا ہے غامدی صاحب نے اسی مفہوم کو الرحیم کا ترجمہ بنا دیا ہے پھر تعجب یہ ہے کہ بسم اللہ سے متعلق کسی حدیث کی طرف غامدی صاحب نے التفات تک نہیں کیا ہے بسم اللہ سے متعلق امین اصلاحی صاحب کی تفسیر پر میں نے جو کلام کیا ہے میری اسی کتاب میں دیکھ لیا جائے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۲:

جاوید غامدی صاحب نے اپنی تفسیر میں جو دوسری بڑی غلطی کی ہے وہ لفظ ''الـــم ''میں کی ہے چونکہ غامدی گروپ قرآن عظیم میں متشابہات کے قائل نہیں ہے اس لیے انہوں '' الــم'' کے لیے نئے معنی تلاش کر لیے ہیں چنانچہ غامدی صاحب نے کہا کہ یہ اس سورت کا نام ہے جس کی ابتداء میں یہ حروف آئے ہیں لہذا غامدی صاحب نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے یہ سورت الم میں ہے۔ مفسرین یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ اللہ اعلم بمراده بذالک یعنی اس کا مفہوم اور مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے کیونکہ یہ حروف مقطعات ہیں جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راز ہے امت کے علماء وفقہاء اس کے معنی سمجھنے سے عاجز ہیں اور یہ اعجاز قرآن میں سے ہے غامدی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے یہ سورت الم ہے اور احسن اصلاحی صاحب نے ترجمہ کیا ہے یہ الف لام میم ہے دونوں نے غلط ترجمے کیے ہیں ''ضَــعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ''

اصلاحی صاحب کی تفسیر میں ان شاذ اقوال پر میں نے تفصیل سے کلام کیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳:

جاوید غامدی صاحب نے سورت بقرہ کی آیت آٹھ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾ سے لیکر آیندہ کئی آیات تک تمام آیتوں کو یہود پر چسپاں کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں اس سے مراد وہ منافقین یہود اور اوس وخزرج میں سے ان کے ساتھی ہیں (البیان ص:۳۲)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے ان آیتوں کو امین احسن اصلاحی صاحب کی طرح گول مول بنا کر یہود پر چسپاں کر دیا ہے لیکن عبارت کے بعض کلمات سے یہ تأثر بھی دیا ہے کہ وہ مدنی منافقین بھی مراد لیتا ہے مگر حمید الدین فراہی صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ تعلیمات قرآنی میں صاف لکھا ہے کہ ''جلُّهُمْ من الْيَهُوْد'' یعنی یہ سارے منافقین یہود میں سے تھے (بحوالہ تدبر قرآن پر ایک نظر ص:۱۵)

غامدی گروپ نے یہ ربط باندھا ہے کہ سورت بقرہ میں عام خطاب یہود کو ہے بلکہ اس سورت کا موضوع یہود ہیں اس لیے انہوں نے منافقین مدینہ کو یہود قرار دیا انہوں نے اس خودساختہ ربط کی وجہ سے قرآن کا رخ بدل کر رکھدیا ہے چنانچہ غامدی صاحب سورت بقرہ کے بارے میں ابتداء تفسیر میں لکھتے ہیں سورۃ البقرۃ کا موضوع اہل کتاب پر اتمام حجت، اوران کی ایک نئی امت کی تاسیس اوران کے فرائض کا بیان ہے (البیان ص:۲۶) آیت ۱۰ کی تفسیر میں غامدی صاحب اپنے مطلب کے تحت مزید لکھتے ہیں یعنی انہیں اس بات پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت سے بنی اسماعیل کو کیوں نوازا (البیان ص:۳۴)

غامدی کے علاوہ مفسرین ان تیرہ آیتوں کو منافقین مدینہ عرب کے ساتھ جوڑ رہے ہیں چنانچہ علامہ قرطبی لکھتے ہیں

''رَوىٰ ابن جريج عَنْ مُجَاهِد قَالَ: نزلت اَربَع آيَاتٌ مِّنْ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاثْنَتَانِ فِيْ نَعْتِ الْكَافِرِيْنَ وَثَلاث عَشْرَة فِي الْمُنَافِقِيْنَ، وروىٰ اسباط عن السدى فِيْ قَوْلِهٖ وَمِنَ النَّاسِ قَالَ هُمُ الْمُنَافِقُوْنَ (تفسیر قرطبی ج ۱ ص:۱۹۲)

ترجمہ: یعنی ابن جریج نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا کہ سورۃ بقرہ کی ابتدا میں چار آیات مؤمنین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور پھر دو آیتیں کافروں سے متعلق نازل ہوئی ہیں اور تیرہ آیات منافقین سے متعلق اتری ہیں اور شیخ اسباط نے

مفسر سدی رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ "وَمِنَ النَّاسِ" سے مراد منافقین ہیں
(تفسیر قرطبی ج ا ص:۱۹۲)

اس واضح تفسیر اور واضح مطلب کو چھوڑ کر غامدی صاحب نے نہ معلوم ان آیات کو یہود کے ساتھ کیوں جوڑ دیا ہے حالانکہ یہود کا ذکر تو خالص کفار کی دو آیتوں کے ضمن میں آ گیا ہے نیز ان آیات میں جن قبیح افعال واقوال کا ذکر ہوا ہے وہ سب منافقین کی صفات تھیں اسی طرح اہل کتاب کی اصطلاح قرآن میں یہود ونصاریٰ کے لیے استعمال کی جاتی ہے یہاں اہل کتاب کا ذکر بھی نہیں ہے غامدی صاحب نے کسی خاص مقصد کے تحت ان صفات کو یہود کے ساتھ جوڑ دیا ہے نہ ان کو مفسرین کا خیال ہے نہ کسی حدیث اور روایت کا خیال ہے نہ قرآن کے سیاق وسباق کا خیال ہے، نہ شان نزول کا خیال ہے بس بلا دلیل اپنی رائے کے مطابق تفسیر بالرائی کر رہے ہیں جو حرام ہے مولانا خلیل احسن ندویؒ نے اپنی کتاب تدبر قرآن پر ایک نظر ص:۳۷ اور ۳۸ میں اس طرح تفسیر پر بھرپور تنقید کی ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۴:

جاوید احمد غامدی صاحب نے سورت بقرہ کی آیت ۲۱ ﴿یَآ اَیُّھَا النَّاسُ﴾ میں غلطی کی ہے وہ یہ کہ اس نے النَّاس کے عام لفظ کو مدینہ کے عرب مشرکین کے ساتھ خاص کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں یہود سے صرف نظر کر کے یہ ذرا دیر کے لیے یثرب (مدینہ) اور اس کے نواح کے مشرکین کی طرف التفات ہے (البیان ص:۳۹)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے ایک غلطی یہ کی ہے کہ "وَمِنَ النَّاسِ" سے اب تک ان تمام آیات کو یہود کے ساتھ جوڑ دیا ہے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ ﴿یَآاَیُّھَا النَّاسُ﴾ کے عام خطاب کو صرف مدینہ کے مشرکین کے ساتھ خاص کیا ہے حالانکہ تمام مفسرین اور اہل لغت اور علماء کا اس پر اتفاق ہے

کہ اَلْعِبرَۃُ لِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ لَا لِخُصُوْصِ الْمَوَارِدِ۔قرآن کی آیتوں میں الفاظ کے عموم کو دیکھا جائے گا واقعہ کی تخصیص کا اعتبار نہیں ہوگا۔

علامہ قرطبی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں انـہ عَـامٌ فِیْ جَمِیْعِ النَّاسِ فَیَکُوْنُ خِطَابُہ لِلْمُؤْمِنِیْنَ باستدامۃ الْعِبَادَۃ وَلِلْکَافِرِیْنَ بِابْتِدَائِھَا (قرطبی ج۱ص:۲۲۵)

یعنی الناس کا لفظ تمام انسانوں کے لیے عام ہے تو مؤمنین سے خطاب اس طرح ہے کہ وہ دائمی عبادت میں لگے رہیں اور کافروں سے خطاب ابتدائی ہے کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔

اب سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب نے آخر کس دلیل کی بنیاد پر اس کو اہل مدینہ کے ساتھ خاص مانا ہے؟بس ان کے ذہن میں ربط کا ایک نقشہ ہے کہ اصل مخاطب سورت بقرہ میں یہود ہیں اب تھوڑی دیر کے لیے یہود سے صرف نظر کی گئی اور خطاب مشرکین مدینہ سے کیا گیا حالانکہ یہ عام الفاظ ہیں قیامت تک تمام انسان اس کے مخاطب ہیں پچھلے صفحات میں غامدی کی عبارت میں یہ تصریح تھی کہ قرآن کی آیات میں تخصیص کا حق خود پیغمبر علیہ السلام کو بھی نہیں ہے اور یہاں خود تخصیص کررہا ہے۔

''تدبر قرآن پر ایک نظر'' کے صفحہ ۱۹ پر مولانا جلیل احسن ندوی صاحب نے اس طرح تفسیر وتخصیص پر سخت تنقید کی ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر۵:

﴿وَقُلْنَا یَا آدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ﴾ (بقرہ:آیت:۲۵)

غامدی کا ترجمہ اس طرح ہے اور ہم نے آدم سے کہا تم اور تمہاری بیوی دونوں اس باغ میں رہو۔

شیخ الہندؒ نے اس طرح ترجمہ کیا ہے اور ہم نے کہا اے آدم رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں۔

اس آیت میں جاوید غامدی صاحب نے یہ غلطی کی ہے کہ اس نے جنت سے زمین کا کوئی باغ مرادلیا ہے چنانچہ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں یہ غالباً اسی دنیا کا کوئی باغ تھا جسے آدم وحوا کا

مستقر قرار دیا گیا (البیان ص:۵۱)

غامدی صاحب نے یہاں مفسرین سے مختلف بات لکھی ہے اور معتزلہ کی رائے کو اپنالیا ہے معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ جنت دنیا کا کوئی باغ تھا جو عدن کی زمین پر قائم تھا علامہ قرطبی رحمہ اللہ معتزلہ پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وَلَا اِلْتِفَاتَ لِمَا ذَهَبَتْ اِلَيْهِ الْمُعْتَزِلَةُ وَالْقَدَرِيَّةُ مِنْ انه لَمْ يَكُنْ فِيْ جَنَّةِ الْخُلْدِ وَاِنَّمَا كَانَ فِيْ جَنَّةٍ بِاَرْض "عَدْن" (قرطبی ص:۳۰۲)

ترجمہ: معتزلہ اور قدریہ کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنۃ الخلد میں نہیں تھے بلکہ وہ سرزمین عدن کے کسی باغ میں بسائے گئے تھے۔

جس طرح علامہ قرطبی نے لکھا ہے میں بھی کہتا ہوں کہ جاوید غامدی اور ان کے استاذوں نے جو لکھا ہے وہ ناقابل التفات بات ہے بات وہی صحیح ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق جب ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جنۃ الخلد میں بسایا یہ تمام اہل سنت کے علماء اور فقہاء اور سلف صالحین کی رائے ہے غامدی صاحب نے جب یہاں ٹھوکر کھا کر غلطی کی تو اس کے بعد کی آیتوں میں بھی غلطی پہ غلطی کرتے چلے گئے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر۶:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (بقرۃ: آیت:۲۵)

جاوید غامدی صاحب اس درخت سے توالد و تناسل کا درخت مراد لیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

سورۃ طٰہ میں اسے شجرۃ الخلد کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ لفظ الشجرۃ یہاں مجازی مفہوم میں ہے شجرۃ الخلد کے لفظ سے جو معنی ظاہر ہوتے ہیں وہ اس بات کی طرف صاف اشارہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہی شجرہ تناسل ہے (البیان ص:۵۱)

جاوید غامدی مزید لکھتے ہیں شیطان سب سے بڑھ کر اسی کو فتنے کا ذریعہ بناتا ہے اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا ہے اور انہیں اجازت دی کہ وہ لباس پہن کر

اس درخت کا پھل کھائیں لیکن شیطان ہمیشہ انہیں اس لباس کے بغیر ہی اس کا پھل کھانے کی ترغیب دیتا رہتا ہے(البیان ص:۵۲)

تبصرہ:

جاوید غامدی نے تمام مفسرین کا راستہ چھوڑ کر اپنی طرف سے ایک مضحکہ خیز داستان بنا کر اس کو تفسیر قرار دیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کا مذاق اڑایا اور تفسیر بالرأی کا ارتکاب کیا نہ اس کے پاس دلیل ہے نہ حدیث ہے نہ کسی تفسیر کا حوالہ ہے نہ کوئی سند ہے ناظرین حضرات خود دیکھ لیں کہ کیا غامدی صاحب کا کلام رب ذوالجلال کی عظیم کتاب کی تفسیر کے شایانِ شان ہوسکتی ہے؟

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۷:

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (بقرہ: آیت:۳۶)

اس آیت کی تفسیر میں غامدی صاحب نے یہ غلطی کی ہے کہ اس اترنے کو زمین کے کسی حصہ سے کسی حصہ میں اترنا مراد لیا ہے چونکہ غامدی صاحب نے پہلے ایک غلطی کی ہے کہ حضرت آدم کو دنیا کے کسی باغ میں ٹھہرایا گیا تھا اس نے جنت الخلد میں بسانے کا انکار کیا جس طرح معتزلہ کا عقیدہ ہے اب اسی غلطی پر دوسری غلطی کر رہا ہے کہ یہاں ''اتر جاؤ'' کا حکم ہے یہ جنت الخلد سے اترنے کا نہیں ہے بلکہ یہ زمین ہی سے زمین کے کسی حصہ کی طرف اترنے کا حکم تھا چنانچہ غامدی صاحب اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اصل میں لفظ اِهْبِطُوْا استعمال ہوا ہے اس میں ''اترو'' کا مفہوم وہی ہے جو اسی سورت کی آیت:۶۱ کے الفاظ اِهْبِطُوْا مِصْرًا میں ہے یعنی اے آدم وحوا!! اور ابلیس تم سب اس باغ سے نکل کر زمین میں اتر جاؤ (البیان ص:۵۲)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے اھبطوا کے لفظ کو متبادر معنی سے ہٹا کر غیر متبادر معنی کی طرف لے گئے

ہیں تاکہ آسمان کی جنت سے نزول کا انکار برقرار رہے جو غامدی نے کیا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ وَالْهُبُوطُ النُّزُوْلُ مِنْ فَوْقَ اِلٰى اَسْفَل الخ: یعنی ہبوط اوپر سے نیچے کی طرف اترنے کو کہتے ہیں تو حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان کے علاقہ سراندیپ میں بوذ نامی پہاڑ پر اتارے گئے اور حضرت حوا ''جدہ'' میں اتاری گئی اور ابلیس بصرہ کے قریب ''ابلہ'' مقام پر اتارا گیا اور سانپ سجستان میں اتارا گیا (قرطبی ج ا ص: ۳۱۹، و ۳۲۰)

اب دیکھنا یہ ہے کہ سارے مفسرین یہ بتا رہے ہیں کہ حضرت آدم جنت میں داخل کرا کر بسائے گئے پھر جنت سے زمین پر اتارے گئے لیکن غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہ زمین ہی کا کوئی باغ تھا نہ جنت میں داخلہ ہوا اور نہ اخراج ہوا۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اس طرح نقل فرمائی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ افضل دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے اس میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اسی جمعہ کے دن میں جنت میں داخل کیے گئے اور اسی جمعہ کے دن جنت سے نکالے گئے (رواہ مسلم ونسائی ابن کثیر ج ا ص: ۸۰)

ان تصریحات وتفصیلات وتشریحات سے معلوم ہوا کہ جناب غامدی صاحب نے اس آیت کا مفہوم غلط بیان کیا ہے اور صرف اپنی رائے کی بنیاد پر ایسا کیا ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

سورت اعراف کی آیت ۲۴ میں اس طرح تصریح ہے ﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ یعنی ایک وقت تک تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے اگر یہ زمین کا کوئی باغ تھا تو آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا کیونکہ وہ باغ خود زمین میں تھا ساتھ والی آیت کا ترجمہ ہے کہ اسی زمین میں تم زندہ رہو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم قیامت میں نکالے جاؤ گے۔ یہ واضح تصریحات ہیں کہ غامدی صاحب کا نظریہ اور اس کی تفسیر غلط ہے۔

غامدی صاحب کی غلطی نمبر ۸:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ (بقرہ:۴۳)

ترجمہ: نماز کا اہتمام کرو اور زکوۃ ادا کرو اور ان جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔

جناب غامدی صاحب کا ایک خطرناک عقیدہ ہے وہ اس طرح ہے کہ ان کے نزدیک دین اسلام پہلے سے عرب معاشرہ میں موجود تھا اس طرح نماز روزہ زکوۃ اور حج کا نقشہ پہلے سے یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے پاس موجود تھا وہ ان تمام چیزوں کو جانتے تھے لہذا قرآن نے جب ان چیزوں کا حکم دیا تو لوگ سمجھ گئے مزید کسی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی نہ نبی اکرم نے ان چیزوں کی ابتدا کی ہے چنانچہ بدقسمت غامدی صاحب اپنی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں۔

نماز اور زکوۃ سے یہود پوری طرح واقف تھے وہ اگرچہ انہیں عملاً ترک کر چکے تھے اور اسی بناء پر انہیں یہ دعوت دی گئی ہے لیکن یہ ان کے لیے کوئی اجنبی چیزیں نہ تھیں خدا کی ہر شریعت میں انہیں بنیادی احکام کی حیثیت حاصل رہی ہے قرآن کے سب مخاطبین انہیں جانتے تھے چنانچہ ان کی ہیئت اور شرح ونصاب وغیرہ کے بارے میں کسی تفصیل کی ضرورت نہ تھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ابتدا نہیں کی، یہ پہلے سے جاری سنن تھیں جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق تجدید واصلاح کے بعد اپنی امت میں قائم رکھا ہے (البیان ج ۱ ص:۵۹)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب کا یہ نظریہ انہوں نے اپنی مختلف کتابوں میں بھی لکھا ہے اور یہاں اپنی تفسیر بالرائی میں اس کو داخل کر کے اسلام کے خلاف بڑی قبیح جسارت کی ہے غامدی صاحب نے غلط بیانی کی ہے کہ یہود نمازوں اور روزوں سے پوری طرح واقف تھے حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہاں پانچ نمازیں نہیں تھیں پھر رکعات وکیفیات کا یہ نظام کہاں تھا روزہ اور حج اور زکوۃ کی یہ تفصیلات کہاں تھیں۔ بے شک ان کے ہاں اجمالی طور پر یہ احکامات تھے لیکن اسلام کے احکامات اور ان

کی شریعت کے احکامات میں زمین و آسمان کا فرق تھا چنانچہ خالص عرب میں سے یا یہود و نصاریٰ میں سے کوئی مسلمان ہوتا تو سالہا سال تک ان کو دین اسلام کے احکامات سیکھنے پڑتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دس سال میں صرف سورۃ بقرۃ کو سیکھا اور سمجھا دوسروں کا کیا حال ہوگا؟ جاوید غامدی صاحب نے کسی دلیل اور کسی سند و حوالہ کے بغیر ایک غلط بات ہانک لی اور سوچا کہ کوئی سمجھنے والا ہوگا نہیں اس لیے بات چل پڑے گی۔

دراصل قصہ یہ ہے کہ غامدی اور اس کے اساتذہ کے ہاں احادیث مقدسہ کی کوئی حیثیت نہیں بقول غامدی حدیث سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے اس لیے مجبوراً ان کو یہ دعویٰ کرنا پڑا کہ یہود و مشرکین پہلے سے ان احکامات کو سمجھتے تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ابتدا نہیں کی اسی جھوٹے دعوے اور غلط عقیدے کی وجہ سے غامدی اور ان کے اساتذہ نے موجودہ شریعت کے روشن چہرے کو مسخ کر کے رکھدیا ہے مذکورہ بالا عبارت پر ذرا نظر ڈالئے اور سوچیئے کہ غامدی بد بخت کس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو نبوت کے عالیشان مرتبہ سے نیچے گرا کر ان کو ایک مجدد اور مصلح ظاہر کر رہا ہے اور کھلے الفاظ میں کہتا پھرتا ہے کہ دین اسلام کے احکامات کی ابتداء نبی اکرم سے پہلے ہو چکی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ان احکامات کو اجاگر کر کے قائم رکھا ہے۔

میں مسلمانوں سے دست بستہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ خود سوچیں اس طرح گمراہ شخص کیا تفسیر قرآن لکھنے کا اہل ہے؟ اور کیا اس کی تفسیر پڑھنے کا قابل ہے؟ افسوس یہ ہے کہ آج کل اسلام کی حیثیت اس لاوراث لاش کی طرح ہوگئی ہے جو جنگل میں پڑی ہوئی ہو اور درندے چاروں طرف سے آکر اس کو بھمبھوڑ رہے ہوں اور کوئی روکنے والا نہ ہو۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

دراصل یہاں ایک پوشیدہ حقیقت ہے جس پر غامدی اور ان کے ساتھی کام کر رہے ہیں وہ وحدتِ ادیان کا فلسفہ ہے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تمام مذاہب اور ادیان کو اکٹھا کریں اور سب لوگ حضرت

ابراہیم علیہ السلام کے دین پر آجائیں تو یہود و نصاریٰ اور مسلمان ایک دین پر آجائیں گے جس سے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے سکھ اور ہندو بھی کسی نہ کسی انداز سے حضرت ابراہیم کو مانتے ہیں لہذا پوری دنیا کے مذاہب آپس میں شیر و شکر بن کر رہیں گے لیکن یہ غامدی صاحب کی غلط فہمی ہے کیونکہ ایک طرف زندہ و تابندہ دین اسلام ہے جس کا شوشہ شوشہ قرآن و حدیث میں محفوظ ہے اور دوسری طرف مردہ ادیان ہیں جو مدتوں سے اپنی طبعی عمر پوری کر چکے ہیں غامدی اور ان کے ساتھی اب اس کو زندہ نہیں کر سکتے ہیں ان ادیان کی مثال اس دوا کی ہے جو ڈیٹ ایکسپائر ہو چکی ہے ڈیٹ ایکسپائر دوا کو استعمال کرنا خودکشی کے مترادف ہے غامدی صاحب سینگ لگانے کے چکر میں کہیں کان کٹوا کر واپس نہ آجائے اسی نظریہ کے پیش نظر غامدی صاحب اور ان کے استاذ امین احسن اصلاحی صاحب اور ان کے استاذ حمید الدین فراہی صاحب تورات و انجیل اور سموئیل اور یوحنا اور لوقا کے صحیفوں کو اپنی تفاسیر میں بہت ہی اہمیت دیتے ہیں بلکہ اصول تفسیر کے لیے اس کو اہم بنیاد قرار دیتے ہیں اور قرآن کی آیات بینات کی تفسیر میں مسلسل اس کو پیش کرتے رہتے ہیں حالانکہ وہ کتب و صحائف محرف بھی ہیں اور منسوخ بھی ہیں اگر کہیں پر تحریف نہیں ہے تو منسوخ تو بہر حال ہیں ایسے مفلوج و منسوخ معلومات کی طرف جانا تو اس شعر کے مترادف ہے

؎ چراغ مردہ کجا نور آفتاب کجا
ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا

یعنی کہاں بجھا ہوا چراغ اور کہاں روشن آفتاب ذرا دیکھ لیں راستہ کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۹:

﴿ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (بقرہ: آیت: ۵۶)

پھر تمہاری اس موت کے بعد ہم نے تمہیں کھڑا کیا اس لیے کہ تم شکر گزار بن کر رہو

(ترجمہ غامدی)

پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے تا کہ تم احسان مانو (ترجمہ شیخ الہندؒ)

غامدی صاحب نے اپنے مطلب کے لیے ترجمہ بھی غلط کیا اور تفسیر بھی غلط لکھدی چنانچہ تفسیر میں وہ لکھتے ہیں ''عربی زبان میں موت کا لفظ اگر قرینہ موجود ہو تو نیند اور بیہوشی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے یہاں جس موقع پر یہ لفظ آیا ہے اور جس طرح آیا ہے اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ بیہوشی ہی کے معنی میں ہے۔ (البیان ج۱ص:۶۹)

تبصرہ ۵:

ترجمہ میں غامدی صاحب نے ''تمہاری اس موت کے بعد'' کا جملہ اختیار کیا ہے ''اس موت'' کا جو لفظ ہے یہ قرآن عظیم میں نہیں ہے قرآن میں صرف موت کا لفظ ہے غامدی صاحب نے ''اس'' کے لفظ سے خاص موت کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ ان کے نزدیک بیہوشی ہے جس طرح اس نے اپنی تفسیر میں تصریح کر دی ہے کہ یہ بیہوشی ہی کے معنی میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب قرآن میں موت کا لفظ موجود ہے تو اس کا حقیقی معنی چھوڑ کر غامدی صاحب مجازی معنی کی طرف کیوں جاتے ہیں ان کا تو دعویٰ ہے کہ قرآن میزان ہے اور فرقان ہے اس کے کسی لفظ کو کسی وجہ سے ادھر ادھر نہیں کریں گے نہ تخصیص کریں گے نہ تحدید کریں گے یہاں ظاہر کو چھوڑ کر مجازی معنی کی طرف غامدی صاحب شاید اس وجہ سے چلے گئے ہیں کہ ان کے بڑوں نے اس طرح مطلب لیا ہے اور یہ لوگ حتی الامکان کرشماتی اور معجزاتی باتوں سے بھاگتے ہیں اور عقل کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں۔

تفسیر قرطبی میں امام قرطبی لکھتے ہیں ''اَیْ اَحْیَیْنَاکُمْ قَالَ قَتَادَۃ مَاتُوْا وَذَھَبَتْ اَرْوَاحُھُمْ ثُمَّ رُدُّوْا لاسْتِیْفَاءِ آجَالِھِمْ'' (قرطبی ج۱ص:۴۰۴)

یعنی ہم نے تم کو زندہ کیا شیخ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مر گئے اور ان کی ارواح چلی گئیں پھر طبعی عمر پورا کرنے کے لیے ان کی ارواح واپس کر دی گئیں۔ کچھ مفسرین نے اس موت کے دیگر معنی بھی لیے ہیں علامہ قرطبی فرماتے ہیں وَالْاَوَّلُ اَصَحُّ لِاَنَّ الْاَصْلَ الحَقِیْقَۃُ

(قرطبی ۴۰۵) موت کو موت ہی کے معنی میں لینا زیادہ صحیح ہے کیونکہ قرآن میں اور کلام میں اصل یہ ہے کہ اس کو حقیقت پر حمل کیا جائے۔

تفسیر عثمانی میں سورت بقرہ کی تفسیر میں شیخ الہند رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یعنی اس وقت کو بھی ضرور یاد کرو کہ باجود اس قدر احسانات کے جب تم نے کہا تھا کہ اے موسی! ہم ہرگز تمہارا یقین نہ کریں گے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جب تک آنکھوں سے صریحاً خدائے تعالیٰ کو نہ دیکھ لیں اس پر بجلی نے تم کو ہلاک کیا اس کے بعد موسیٰ کی دعاء سے ہم نے تم کو زندہ کیا (تفسیر عثمانی ص:۱۱)

اکثر مفسرین نے اسی طرح تفسیر فرمائی ہے کہ اس موت سے حقیقی موت اور حیات مراد ہے غامدی صاحب نے کسی کی شاذ تفسیر کو لیا ہے جس کو علامہ قرطبی مسترد کرتے ہیں کسی دلیل کے بغیر غامدی صاحب نے قرآن عظیم کے صریح مطلب کو اپنے مطلب کے تحت دوسری طرف موڑ دیا اور جمہور مفسرین کو نظر انداز کیا۔ اور اپنی مرجوح اور شاذ تفسیر میں حصر کیا اور کہا یہ موت بیہوشی ہی کے معنی میں ہے کسی دلیل کے بغیر اس طرح حصر کرنا بے جا جسارت ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۱۰:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ (بقرہ آیت:۶۳)

اس آیت کی تفسیر میں غامدی صاحب نے یہ غلطی کی ہے کہ بنی اسرائیل سے کوہ طور پر جو میثاق لیا گیا تھا اور ان کے سروں پر کوہ طور کو لٹکایا گیا تھا وہ حقیقی معاملہ نہیں تھا بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے سروں پر پہاڑ کھڑا کیا گیا ہے جو گرا جا رہا ہے چنانچہ غامدی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں قرآن اور بائبل دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ عہد پہاڑ کے دامن میں اس طرح لیا گیا کہ کوہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ کر سائبان کی طرح ان کے سروں پر لٹک رہا تھا اور انہیں لگتا تھا کہ وہ ان پر گر کر رہے گا قرآن نے یہاں اس حالت کو پہاڑ کے ان پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔ (البیان ج ا ص:۷۹)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے کوہ طور کو میثاق کے وقت بنی اسرائیل کے سروں پر اٹھانے کو حقیقی اٹھانے یا لٹکانے کے بجائے تصوراتی اور محسوساتی انداز میں اٹھالینا مراد لیا ہے اوپر ان کی عبارت میں ''نہیں لگتا تھا'' کا جملہ اور اس کے بعد کا جملہ کہ قرآن نے یہاں اس حالت کو پہاڑ کے ان پر اٹھالینے سے تعبیر کیا ہے یہ واضح الفاظ ہیں کہ غامدی صاحب کوہ طور کو حقیقی معنوں میں سروں پر اٹھالینے کو تسلیم نہیں کرتا ہے بلکہ یہ ایک محسوساتی اور خیالی انداز تھا کہ ان کو ایسا لگتا تھا فی الواقع ایسا نہ تھا تاہم غامدی صاحب یہاں حد سے زیادہ باہر نہیں گئے ہیں ان کے مقابلے میں امین احسن اصلاحی سر سید احمد خان جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور دوسرے اہل باطل نے واضح الفاظ میں تصوراتی اور محسوساتی انداز میں اس کو بیان کیا ہے اس سے پہلے امین احسن اصلاحی کی تفسیر پر جو کلام میں نے کیا ہے وہاں دیکھ لینا چاہیے۔ مزید اعادہ کی ضرورت نہیں ہے جاوید غامدی صاحب قرآن کے فرقان و بیان اور میزان ہونے پر بہت زور دیتا ہے لیکن یہاں وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ کے واضح الفاظ سے گردن کشی کرتے ہیں اور اس کو غیر واضح الفاظ پر حمل کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں ﴿واذ نتقنا الجبل﴾ کے الفاظ میں تو حقیقی طور پر چیرنے پھاڑنے کا ذکر ہے۔ اس کا کیا جواب ہوگا۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۱۱:

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ (بقرہ آیت:۶۵)

جناب غامدی نے دبے الفاظ میں یہ مطلب حاصل کرنا چاہا ہے کہ بنی اسرائیل ظاہری طور پر بندر نہیں بنے تھے بلکہ باطنی اور معنوی طور پر بندر بن گئے تھے چنانچہ یہاں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ لعنت کا جملہ ہے مطلب یہ ہے کہ ان پر لعنت بھیجی گئی تھی وہ حقیقت میں بندر نہیں بنے تھے غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ آگے کی بات سے واضح ہے اس کے نتیجے میں بندروں سے جس

طرح مشابہ ہوئے اس کی نوعیت ایسی محسوس تھی کہ گرد و پیش کی بستیوں کے لوگ اسے دیکھ کر عبرت حاصل کر سکتے تھے (البیان:۸۱)

تبصرہ:

غامدی صاحب کا عقیدہ وہی ہے جیسا کہ امین احسن اصلاحی کا عقیدہ ہے کہ بنی اسرائیل ظاہراً مسخ ہو کر بندر نہیں بنے تھے بلکہ باطنی اور معنوی طور پر بندر بن گئے تھے اس سے غامدی صاحب یہ مطلب حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کوئی معجزاتی کرشماتی معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ لوگ انسان رہتے ہوئے بندروں کے اخلاق اور صفات پر آ گئے تھے بندروں کی طرح حریص اور لالچی ہو گئے تھے غامدی صاحب نے دبے الفاظ میں اپنا یہ مطلب حاصل کرنا چاہا ہے امین احسن اصلاحی نے انتہائی وضاحت کے ساتھ یہ مطلب لکھا ہے میں نے اس سے پہلے اس آیت کے تحت اصلاحی صاحب کی رائے پر بھرپور کلام کیا ہے گزشتہ بقرہ کی آیت ۶۵ کی تفسیر میں اصلاحی صاحب کا شاذ نظریہ ۸ دیکھ لیا جائے جلیل احسن ندوی صاحب نے اصلاحی صاحب کی اس شاذ رائے پر شدید تنقید کی ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۱۲:

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً﴾ (بقرہ: ۶۷)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ آیت یہاں بنی اسرائیل کے تنازع قصہ میں مؤخر مذکور ہے اور بعد میں آنے والی آیت ﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَأْتُمْ فِيهَا﴾ قصہ کی ترتیب سے مقدم ہے اصل ترتیب اس طرح ہے ﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَأْتُمْ فِيهَا. فَقَالَ مُوسٰى لقومه إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً﴾ یعنی مقتول کے بارے میں تنازع پیدا ہو گیا کہ قاتل کون ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فیصلہ سنا دیا کہ تم ایک گائے ذبح کر دو پھر اس کے جسم کا کوئی ٹکڑا مردے پر مار دو مردہ زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہو گیا مردے نے اپنا قاتل بتا دیا

اور پھر مر گیا علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ گائے ہی کو ذبح کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا تا کہ یہود کے دل ودماغ سے گائے کی الوہیت اور عبادت کا تصور ختم ہو جائے اور ان کے معبود کی تذلیل ہو جائے بہر حال مردے کا زندہ ہونا ایک معجزاتی معاملہ بن گیا تھا۔ جاوید غامدی صاحب نے سارے مفسرین سے الگ ایک راستہ اختیار کیا اور کہا کہ گائے کو قسامہ کے طور پر ذبح کیا گیا تھا وہ اس طرح کہ بنی اسرائیل میں قسامہ میں سچی قسم کھانے کے لیے یہ احتیاط اختیار کی جاتی تھی کہ گائے ذبح کر کے اس کے خون سے منتخب اشخاص کو رنگین کیا جاتا تھا تا کہ وہ غلط قسم نہ کھائے چنانچہ غامدی صاحب لکھتے ہیں اس کے بعد جو واقعہ سنایا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ بنی اسرائیل کو گائے کی اس قربانی کا حکم قسامہ یعنی خون پر قسمیں کھانے کے لیے دیا گیا تھا تورات میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ (البیان ج ا ص: ۸۲)

جناب غامدی صاحب نے اسی قصہ میں آیت ۷۳ کی تفسیر میں لکھا ہے اصل الفاظ یہ ہیں ﴿اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا﴾ ان میں ھا کی ضمیر جس طرح آئی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بھی اوپر بیان کیے گئے قانون کے مطابق پہلے گائے ذبح کر کے قسامہ کا طریقہ اختیار کیا گیا، لیکن جب ان لوگوں نے جھوٹی قسمیں کھالیں اور ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تنبیہ اور انہیں آخرت کی یاد دہانی کے لیے معجزہ دکھایا۔

تبصرہ:

جناب غامدی صاحب نے یہاں قَسامہ کو پیدا کر لیا ہے عام مفسرین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے نہ اس کا اس آیت کے ساتھ کوئی جوڑ ہے چونکہ حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی نے اس کا ذکر چھیڑا ہے تو غامدی صاحب نے بھی ان کی پیروی کی۔

اب سوال یہ ہے کہ قسامہ کا عمل جب مکمل ہو جاتا ہے تو قسمیں سچی ہوں یا جھوٹی ہوں اس پر حکم مرتب ہو جاتا ہے اس کے بعد گائے کے جسم کے کسی ٹکڑے کا مردے کے جسم پر مارنے کی کیا

ضرورت تھی؟ اور مردے کے زندہ ہونے کی کیا ضرورت تھی اور اپنے قاتل بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ قسامہ کے عمل سے تو پورا معاملہ صاف ہو جانا چاہیے تھا غامدی گروپ کی بس ایک عادت ہے کہ مفسرین کی روایات سے بھاگتے ہیں اور احادیث کی تصریحات سے وحشت محسوس کرتے ہیں پھر اس طرح پگڈنڈیوں میں گھومتے پھرتے ہیں چونکہ جاوید غامدی صاحب کے پاس اپنے مدعا پر اسلام میں کوئی دلیل نہیں مل سکتی تھی اس لیے اس نے یہود کا رخ کیا اور تورات کی ایک لمبی چوڑی عبارت نقل کر ڈالی نہ معلوم وہ عبارت محرف ہے یا نہیں اگر محرف نہ بھی ہو تو منسوخ تو یقیناً ہے۔ اپنے دین متین کے شواہد پر اعتماد نہ کیا مفسرین پر اعتماد نہ کیا اور جا کر تورات کو قرآن کی تفسیر کے لیے ڈھونڈ لایا۔ مسلمانوں کے مفسرین کے قول نقل کر کے حوالہ دیتے تو کلام میں برکت ہوتی علامہ قرطبی فرماتے ہیں مِنْ بَرَكَةِ الْعِلْمِ اَنْ يُّضَافَ الْقَوْلُ اِلٰى قَائِلِه (قرطبی ج ا ص:۳)

ترجمہ: علم کی برکت میں سے یہ ہے کہ بات کو اس کے کہنے والے کی طرف منسوب کیا جائے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر۱۳:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ﴾ (بقرہ: آیت ۸۷)

مذکورہ آیت میں جاوید غامدی صاحب نے "بِالرُّسُلِ" کے لفظ میں رسول پر بحث کی ہے جس میں غامدی صاحب نے ایک جدید تصور پیش کی ہے اس کو سمجھنے کے لیے آپ غامدی صاحب کا یہ عقیدہ سمجھ لیں کہ ان کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کوئی رسول نہیں آیا ہے صرف حضرت عیسیٰ رسول بن کر آئے ہیں، اس کے علاوہ جو پیغمبر آئے ہیں وہ سب انبیاء تھے ان میں کوئی رسول نہیں تھا۔ زیر بحث آیت میں چونکہ "بِالرُّسُلِ" کا لفظ صراحت کے ساتھ مذکور ہے اس لیے غامدی صاحب اس میں تاویل کرتے ہیں کہ رسل سے انبیاء مراد ہیں چنانچہ لکھتے ہیں: "اصل میں لفظ الرسل آیا ہے یہ نبوت سے آگے ایک خاص منصب کے حاملین کے لیے بھی آتا ہے اور خدا کے فرستادوں کے لیے ایک عام لفظ کے طور پر بھی، قرآن میں جبریل

امین کو اسی دوسرے معنی میں ﴿رَسُوْل کَرِیْم﴾ کہا گیا ہے یہ معلوم ہے کہ پہلے معنی میں رسول کی حیثیت بنی اسرائیل کے لیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد صرف حضرت مسیح کو حاصل تھی۔ اس وجہ سے یہ بات بالکل قطعی ہے کہ یہاں یہ لفظ دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ (البیان ج ۱ ص: ۹۵)

تبصرہ:

جاوید غامدی نے اپنی اس عبارت میں دو غلطیاں کی ہیں پہلی غلطی یہ کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کوئی رسول نہیں آیا ہے جو آئے ہیں وہ سب انبیاء تھے یہ غامدی صاحب کا غلط دعویٰ ہے ان کو کہاں سے معلوم ہوا کہ تقریباً دو ہزار سال کے طویل عرصہ میں کوئی رسول نہیں آیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کے احوال کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی بیان نہیں فرمائے قرآن کا اعلان ہے ﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْکَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا﴾ (مائدہ: ۱۶۴)

سورت مؤمن میں ہے ﴿مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْکَ﴾ مومن آیت: ۷۸) جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے رسولوں کا حال معلوم نہیں تھا تو غامدی صاحب کو کہاں سے علم ہو گیا؟۔

دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ حضرت موسیٰ کے بعد ہم نے مسلسل رسول بھیج دیے ہیں ''الرسل'' کے صریح لفظ کو غامدی صاحب نبیوں پر کیوں حمل کرتے ہیں اپنے غلط دعویٰ کے اثبات کے لیے قرآن عظیم کے ظاہر کو چھوڑ کر دوسری طرف کیوں جاتے ہیں۔
غامدی نے یہاں دوسری غلطی یہ کی ہے کہ رسول کا لفظ فرشتوں پر بھی بولا جاتا ہے لہٰذا یہاں جو بالرسل کا لفظ آیا ہے اس سے رسول مراد نہیں بلکہ قطعی طور پر اس سے بنی اسرائیل کے انبیاء مراد ہیں غامدی صاحب سے اگر پوچھا جائے کہ اگر الرسل سے انبیاء بنی اسرائیل مراد ہیں اور رسول

مراد نہیں تو وہ اسے فرشتوں کے فرستادہ رسول کیوں مراد نہیں لیتے ہیں جب رسول کے اصلی معنی سے اس لفظ کو ہٹا دیا تو اس کو انبیاء میں کیوں منحصر کرتے ہیں؟ اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ غامدی صاحب نے اپنی تفسیر کے آیندہ صفحہ ۱۸۱ پر یوحنا یعنی یحییٰ علیہ السلام کو بھی رسول مانا ہے حالانکہ وہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان آئے ہیں۔ اپنی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں چنانچہ جس طرح نوح ابراہیم، موسیٰ اور یوحنا مسیح ہمارے لیے خدا کے رسول ہیں اسی طرح فرشتے ان رسولوں کے لیے خدا کے رسول ہیں (البیان ج ۱ ص:۱۸۱)

غامدی کا ایک غلط عقیدہ یہ بھی ہے کہ کوئی رسول قتل نہیں ہوا ہے اور نہ قتل ہوسکتا ہے جو بھی شہید کردیئے گئے ہیں وہ سارے نبی تھے غامدی صاحب سے پوچھا جائے کی نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر کے یہودیہ نے جو زہر دیا تھا اور وفات کے وقت اس زہر نے اثر دکھایا اور حضور اکرم شہید ہوگئے تو کیا رسول شہید ہوئے یا نہیں؟ نیز اسی آیت کے آخری جملوں میں ﴿وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ﴾ یعنی تم رسولوں کے ایک فریق کو جھٹلاؤ گے اور ایک فریق کو قتل کرو گے۔ اس آیت میں تو واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہود نے رسولوں کے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کردیا پھر غامدی کس بنیاد پر کہتا ہے کہ کوئی رسول کبھی بھی قتل نہیں ہوا ہے کسی حدیث یا کسی تفسیر کا کوئی حوالہ بھی نہیں دیا ہے حالانکہ علامہ قرطبی فرماتے ہیں: مِنْ بَرَكَةِ الْعِلْمِ اَنْ يُّضَافَ الْقَوْلُ اِلٰى قَائِلِهٖ، یعنی علم کی برکت یہ ہے کہ قول کا حوالہ دیا جائے (قرطبی ج ۱ ص:۳)

جاوید غامدی کی غلطی نمبر۱۴:

﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ﴾ (بقرہ:۱۰۲)

اور اس علم کے پیچھے ہولئے جو اترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے۔

جناب غامدی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں بھی غلطی کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں اس علم کے لیے "مَآ اُنْزِلَ" کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے اور اس کے فرشتوں پر اتارے

جانے اور ان کی طرف اس کے لیے لفظ ''فتنة'' کے استعمال سے بھی صاف مترشح ہے کہ یہ سحر وساحری سے جسے قرآن نے یکسر کفر قرار دیا ہے بالکل مختلف کوئی علم تھا لہٰذا ان لوگوں کی رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے جو اسے جادو سمجھتے ہیں (البیان ج ا ص:۱۰۵)

تبصرہ:

جاوید غامدی نے یہاں بھی وہی غلطی دہرائی ہے کہ تمام مفسرین کی تفاسیر کو چھوڑ کر الگ راستہ اختیار کیا ہے اور اس غلطی پر دگنی غلطی یہ کی ہے کہ مفسرین کی صحیح تفاسیر کو غلط قرار دیا جنہوں نے اس علم کو جادو کہا ہے پھر غامدی صاحب پریشان ہو گئے کہ اگر یہ جادو نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟ اس کے جواب کے لیے غامدی صاحب نے اپنے استاذ امین احسن اصلاحی کا کلام یہاں اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے اور جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ تعویذوں اور گنڈوں کا کوئی خاص علم تھا جس میں تاثیرات کا خاصہ پڑا تھا یہود کے صوفیوں اور پیروں نے اس کو استعمال کیا۔ امین احسن اصلاحی کے شاذ نظریات کے بیان میں شاذ نظریہ ۱۰ کے تحت میں نے اس پر خوب تبصرہ کیا ہے وہی تبصرہ غامدی کے لیے بھی کافی ہے۔

یہاں میں مزید اتنی بات عرض کروں کہ غامدی صاحب نے تمام مفسرین کی تفسیر کو غلط قرار دیا ہے جنہوں نے اس کو جادو کہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب اور ان کے استاذ اصلاحی صاحب نے جب یہ اقرار کیا کہ یہ تعویذوں اور گنڈوں کا کوئی علم تھا تو کیا وہ گنڈے اور تعویذات جادو پر مشتمل نہیں تھے؟ اگر تھے تو جس چیز سے یہ حضرات بھاگ رہے ہیں آخر اسی میں واپس آ کر پڑ گئے ہاں البتہ تمام مفسرین سے الگ راستہ اختیار کرنے کا شوق پورا ہو گیا۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۱۵

﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا﴾ (بقرہ:۱۰۶)

قرآن عظیم میں کسی حکم کے منسوخ ہونے کا غامدی گروپ قائل ہے یا نہیں ہے وہ الگ داستان

ہے یہاں ایک اور بڑی غلطی یہ سامنے آگئی کہ یہ لوگ زیر بحث آیت میں نسخ کا تعلق تورات وانجیل سے بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ جب ہم تورات یا انجیل کا کوئی حکم منسوخ کردیتے ہیں تو اس کے بدلے میں قرآن میں بہتر حکم نازل کردیتے ہیں۔ چنانچہ غامدی صاحب لکھتے ہیں: ''اس سے قرآن نے تورات کے ان احکامات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے یہود نے بے پرواہی برتی اور ان کے اس جرم کی پاداش میں وہ ان کے ذہنوں سے محو کردیئے گئے۔

(البیان ص:۱۱۱)

غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں یعنی تورات کے وہ ضابطے جو منسوخ کردیئے گئے تمدن کے ارتقاء اور حالات کی تبدیلی کے پیش نظر (ہم) ان سے بہتر ضابطے دیتے ہیں (بیان ص:۱۱۲)

تبصرہ:

غامدی صاحب کی یہ تفسیر غلط ہے اور یہ غلطی حمید الدین فراہی نے کی ہے پھر امین احسن اصلاحی نے کی ہے اب جاوید غامدی وہی غلطی کررہا ہے سارے مفسرین یہ تفسیر کررہے ہیں کہ اس نسخ کا تعلق قرآن کے احکامات سے ہے یہود نے اعتراض کیا تھا کہ تمہاری کتاب قرآن میں بعض آیات منسوخ ہوتی ہیں اگر یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تو جس عیب کی وجہ سے اب منسوخ ہوئی اس عیب کی خبر کیا خدا کو پہلے سے نہ تھی؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ عیب نہ پہلے تھا نہ اب ہے لیکن احکم الحاکمین مناسب وقت دیکھ کر جو حکم کرنا چاہے کردیتا ہے اس وقت وہی مناسب تھا اور اب دوسرا حکم مناسب ہے بندے کا کام ماننا ہے جاننا نہیں۔

اس آیت سے متعلق پوری تفصیل اس سے پہلے امین احسن اصلاحی صاحب کے شاذ نظریہ نمبر ۱۱ کے ذیل میں ہم نے لکھا ہے وہاں دیکھ لینا چاہیے مزید ار تفصیل ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی ۱۶:

﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ (بقرہ: آیت:۱۲۵)

غامدی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے اور حکم دیا کہ ابراہیم کی اس قیام گاہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ۔

غامدی صاحب اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں پہلے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو ذریت ابراہیم کا قبلہ ٹھہرایا پھر وضاحت کی ہے کہ اسی فیصلے کو روبہ عمل کرنے کے لیے ابراہیم اور اس کی ذریت کو حکم ہوا کہ ابراہیم کی اس قیام گاہ کے ایک حصے میں نماز کی جگہ بناؤ، بیت اللہ کو یہاں مصلّٰی یعنی نماز کی جگہ سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ یہود پر یہ حقیقت واضح کی جائے کہ خدا کا یہ گھر درحقیقت ایک مسجد کی حیثیت سے تعمیر کیا گیا تھا اور اب خدا کا آخری پیغمبر اس کی اسی حیثیت کی تجدید کے لیے مبعوث ہوا ہے اسی طرح مکہ کے لیے ابراہیم کی قیام گاہ کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہود نے مروہ کی قربان گاہ اور بیت اللہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بالکل کاٹ دینے کے لیے اپنی کتابوں کے بیانات میں جگہ جگہ تحریفات کر دی تھیں قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے انہیں تحریفات کی تردید کی ہے۔ (البیان ج ۱ ص:۱۲۶)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے ایک خاص مقصد کے لیے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے اور حکم دیا کہ مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ امین احسن اصلاحی اور جناب غامدی صاحب مقام ابراہیم کا انکار کرنا چاہتے ہیں جہاں حضرت ابراہیم ایک پتھر پر کھڑے ہوئے تھے اور لوگوں کو حج کے لیے پکارا تھا نیز یہ پتھر خود کار سیڑھی کا کام دے رہا تھا اور تعمیر بیت اللہ میں استعمال ہوا تھا جس پر حضرت ابراہیم کے قدموں کے نشانات اب بھی موجود ہیں اس انکار تک پہنچنے کے لیے اصلاحی صاحب نے مصلّٰی کا ترجمہ مسکن سے کیا ہے اور غامدی صاحب نے قیام گاہ سے ترجمہ کیا ہے دونوں ترجمے غلط ہیں شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے اور بناؤ ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ۔ مترجمین حضرات اسی طرح ترجمہ کرتے ہیں لیکن غامدی و اصلاحی گروپ نے

مقام ابراہیم کو مخصوص مقام مانتے ہیں اور نہ مقام ابراہیم میں پتھر کو تسلیم کرتے ہیں امین احسن صاحب نے لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر بیت اللہ کی تعمیر کی تھی یہ قول صحیح نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک یہ تفسیر صحیح ہے کہ مقام ابراہیم سے مسکن و مستقر مراد ہے اس سے پہلے شاذ نظریہ ۱۲ میں ہم نے مکمل تفصیل لکھدی ہے یہاں غامدی صاحب نے بھی اصلاحی صاحب کا غلط راستہ اختیار کیا ہے اور پیچ وتاب کھا کر مقام ابراہیم کو اور اس کی حقیقت کو غائب کر دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ سلفاً وخلفاً مسلمانوں نے بطور یادگار اس کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور اس کو محفوظ رکھا ہے غامدی صاحب اور ان کی پارٹی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے صرف اپنے ذہنی اختراعات اور تصورات کے پیچھے اندھا دھند دوڑ رہے ہیں یہاں غامدی صاحب نے اپنے بزرگوں فراہی واصلاحی کی اس غلطی کو بھی ذکر کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مروہ کے پاس ذبح کیا تھا اس سے یہ لوگ منی کے مذبح خانہ کی ثابت شدہ حقیقت چھپانا چاہتے ہیں اور ان غلط تاویلات کی وجہ سے سینکڑوں احادیث کا انکار کرنا چاہتے ہیں امین احسن اصلاحی کے شاذ نظریہ ۱۲ کو پھر دیکھ لیا جائے اوپر مذکورہ عبارت اور تفسیر میں غامدی صاحب نے اپنا وہی مشہور غلط نظریہ دہرایا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف تجدید واصلاح کے لیے آئے تھے دین پہلے سے موجود تھا۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر: ۱۷

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (بقرہ: آیت ۱۲۹)

ترجمہ غامدی: جو تیری آیتیں انہیں سنائے اور انہیں قانون اور حکمت سکھائے اور (اس طرح) انہیں پاکیزہ بنائے۔

غامدی صاحب نے اپنے مطلب کا ترجمہ کیا ہے اور اسی کی روشنی میں اس طرح تفسیر اختیار کی ہے لکھتے ہیں۔

''اَلْکِتَاب'' قرآن کی زبان میں جس طرح خط اور کتاب کے معنی میں آتا ہے اسی طرح قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہے قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اور ''الحکمۃ'' جب اس طرح عطف ہو کر آتے ہیں تو الکتاب شریعت اور الحکمۃ سے دین کی حقیقت اور ایمان واخلاق کے مباحث مراد ہوتے ہیں یہاں بھی یہی صورت ہے آگے لکھتے ہیں اس لحاظ سے دیکھئے تو تزکیہ قانون اور حکمت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ انہیں دونوں کا حاصل ہے آگے لکھتے ہیں: انسان جب اس قانون وحکمت کو پوری طرح اختیار کر لیتا ہے تو تزکیہ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر اسے حاصل ہو جاتا ہے اس کے لیے کہیں اور جانے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے (البیان ج ا ص:۱۳۳) تزکیہ وتصوف سے متعلق غامدی صاحب نے سورۃ بقرہ کی آیت ۱۵۱ کے تحت بھی اسی طرح لکھا ہے الفاظ وکلمات ایک جیسے ہیں۔

تبصرہ:

غامدی صاحب نے اپنے مطلب کے تحت آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے ان سے پوچھا جائے کہ ان کے ترجمہ میں انہیں قانون اور حکمت سکھائے، کے جملہ میں قانون کس لفظ کا ترجمہ ہے پھر ان سے پوچھا جائے کہ ڈیش لگا کر (اس طرح) انہیں پاکیزہ بنائے کا ترجمہ غامدی نے کیوں کیا ہے جس میں انہوں نے ویزکیھم کے الگ حکم تزکیہ نفوس کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی الگ مسئولیت اور ذمہ داری کو سابقہ دو ذمہ داریوں میں چھپا کر کیوں مندمج کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ غامدی نے اَلْحِکْمَۃ کو حکمت قرار دیکر اَحادیث سے راہ فرار اختیار کیا ہے حالانکہ اَلْحِکْمَۃ سے سنت وحدیث کا معنی لینا واضح بھی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کی تصریح بھی ہے اور عام مفسرین کے نزدیک الفاظ کے اختلاف کے باوجود سنت وحدیث کے معنی پر اتفاق بھی ہے اس کے بعد غامدی صاحب نے اپنی خود ساختہ تفسیر میں تصریح کر دی کہ کتاب وحکمت کے بعد کسی تزکیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے غامدی صاحب نے تصوف کے پورے میدان کو مار لیا

ہے اس لیے کہ غامدی صاحب تصوف کے ذریعے سے تزکیہ نفوس کو غلط کہتے ہیں ان کے نزدیک تصوف ایک بڑا جرم ہے نیا دین اور بدعات وخرافات کا مذہب ہے جس طرح انہوں نے اپنی کتاب البرہان میں تصوف کے رد میں کئی صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں وہاں دیکھ لیا جائے۔

شیخ الہند رحمہ اللہ اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں کا کہ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو کتاب اور تہہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو۔

شیخ الہند رحمہ اللہ نے کتاب سے قرآن عظیم مراد لیا ہے اور یہی متبادر ترجمہ ہے اور الْحِكْمَة سے تہہ کی باتیں مراد لی ہیں مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ الْحِكْمَة کا لفظ جب غیر اللہ کے لیے بولا جائے تو (اس کے معنی) موجودات کی صحیح معرفت اور نیک اعمال کے لیے جاتے ہیں شیخ الہند کے ترجمہ میں تہہ کی باتیں اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ مفسرین صحابہ وتابعین اس جگہ لفظ حکمت کے معنی بیان کرتے ہیں اگر چہ ان کے الفاظ مختلف ہیں لیکن خلاصہ سب کا ایک ہی ہے یعنی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (معارف القرآن ج ا ص: ۳۳۰)

جاوید غامدی کی غلطی ۱۸:

﴿وَكَذَالِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (بقرہ: آیت: ۱۴۳)

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تا کہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا (شیخ الہند)

غامدی صاحب نے ان آیتوں کا ترجمہ اس طرح کیا ہے، اسی طرح تمہیں بھی ایک درمیان کی جماعت بنا دیا ہے تا کہ تم دنیا کے سب لوگوں پر حق کی شہادت دینے والے بنو اور اللہ کا رسول تم پر یہ شہادت دے۔

اس ترجمہ سے غامدی صاحب نے یہ مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے کہ یہ گواہی دنیا کے لوگوں پر

دنیا میں امت محمد یہ کی گواہی ہے اس کا آخرت کی گواہی سے کوئی تعلق نہیں ہے جو طویل احادیث میں مذکور ہے گویا احادیث کا وہ آخرت والا نقشہ ہی صحیح نہیں ہے۔

چنانچہ غامدی صاحب یہاں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ''اُمَّۃً وَّسَطًا'' یعنی وہ جماعت جس کے ایک طرف اللہ و رسول اور دوسری طرف دنیا کی سب اقوام تھیں اور وہ ان پر حق کی شہادت کے لیے مامور کیے گئے۔ غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ شہادت کے معنی گواہی کے ہیں جس طرح گواہی سے فیصلے کیلئے حجت قائم ہو جاتی ہے اسی طرح حق جب اس درجے میں واضح کر دیا جائے کہ اس سے انحراف کی گنجائش باقی نہ رہے تو اسے شہادت سے تعبیر کیا جاتا ہے (بیان ج۱ص:۱۴۳)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے یہاں آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے کہ ہم نے تم کو درمیان کی جماعت بنا دیا ہے حالانکہ تمام مفسرین نے یہاں وسط کا ترجمہ معتدل اور متوسط سے کیا ہے غامدی نے درمیان کا ترجمہ کیا ہے۔ پھر اس ترجمہ کے پیش نظر ایک غلط تفسیر پیش کی ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ ایک طرف اللہ اور رسول کو کھڑا کیا ہے اور دوسری طرف دنیا کی اقوام کو پیش کیا ہے اور درمیان میں اس امت کو گواہی کے لیے مامور کیا گیا ہے اس تفسیر سے غامدی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس سارے مقدمے کو آخرت کی بجائے دنیا کے ساتھ جوڑ رہے ہیں اور مسند احمد کی طویل حدیث کا انکار کرنا چاہتے ہیں امین احسن اصلاحی نے شاذ نظریہ ۱۳ میں صاف لکھا ہے کہ اس مقدمہ کو مفسرین نے آخرت سے جوڑا ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے یہ دنیا کا قضیہ ہے غامدی صاحب نے جو تفسیر لکھی ہے یہ عجیب ان فہم تفسیر ہے جو خالص اپنی رائے سے بنائی گئی ہے عام مفسرین کی تفاسیر کی طرف التفات تک نہیں کیا جس کی وجہ سے راہ راست سے گم ہو گیا۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۱۹

﴿اَلَّذِیْنَ آتَیْنَاهُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ﴾ (بقرہ:۱۴۶)

غامدی صاحب نے اپنے مطلب کے مطابق اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس چیز کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

جناب غامدی صاحب نے اس آیت کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت سے ہٹا کر قرآن کی معرفت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ جو عام مفسرین کی تفاسیر کے خلاف ہے پھر غامدی صاحب نے اس آیت کی تفسیر اس طرح لکھی ہے۔ یہ صالحین اہل کتاب کا ذکر ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک مہجور باپ اپنے یوسف گم گشتہ کو پہچانتا ہے اسی طرح یہ صالحین اہل کتاب بھی قرآن مجید اور اس کے پیش کردہ حقائق کو اپنے صحیفوں کی روشنی میں جانتے پہچانتے ہیں اور اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ (البیان ج۱ص:۱۴۹)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ اس چیز کو ایسا پہچانتے ہیں یہ ترجمہ غلط ہے کیونکہ اس نے یَعْرِفُوْنَهٗ کی ضمیر چیز یعنی ''شَیْء'' کی طرف لوٹائی ہے جس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور نہ معین کوئی چیز ہے اس کو اس طرح مبہم بنانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ ضمیر کا معین مرجع مفسرین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے اگر غامدی نے ''چیز'' سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد لی ہے تو یہ بڑی گستاخی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ نے اس آیت کا ماسبق آیات سے ربط یوں بیان کیا ہے:

اس سے پہلی آیت میں اہل کتاب کا قبلۂ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان تھا اس آیت میں انہی اہل کتاب کا صاحب قبلہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے اس ربط کے بعد حضرت تھانویؒ نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات وانجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا (بلاشک وشبہ) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی

صورت سے) پہچانتے ہیں (بحوالہ معارف القرآن ج ا ص: ۳۸۵)
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے "اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں ان میں کبھی شبہ واشتباہ نہیں ہوتا اسی طرح تورات وانجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات ونشانات کا ذکر آیا ہے اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔ (معارف القرآن ج ا ص: ۳۸۶)
غامدی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں اہل کتاب کی معرفت کو قرآن مجید کے ساتھ جوڑا ہے سوال یہ ہے کہ تورات وانجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات کا ذکر تھا اور آپ سے متعلق پیشگوئیاں تھیں لیکن قرآن مجید کی کونسی علامت وہاں تھی جس کو تورات یا انجیل نے بیان کیا ہے؟ یہ غلطی صرف غامدی صاحب کی نہیں ہے بلکہ اس کے پیشرو امین احسن اصلاحی صاحب نے بھی آیت کو قرآن سے جوڑا ہے یہ ان حضرات کے شاذ نظریات ہیں جہاں کوئی الگ راستہ نظر آتا ہے یہ حضرات عام مفسرین کو چھوڑ کر اس پر دوڑتے ہیں مناسب تو یہ تھا کہ یہ لوگ تورات وانجیل پر جو گہری نظر رکھتے ہیں اگر وہیں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بشارتوں کو نکال کر اپنی تفسیروں میں لکھدیتے تو کتنا اچھا ہوتا لوگوں کو فائدہ ہوتا اور ان کی تفسیروں میں مزہ آتا لیکن نیکی کی توفیق تو اللہ جل جلالہ کے پاس ہے وہ جسے چاہتا دیتا ہے جناب غامدی صاحب نے مندرجہ بالا آیت میں دوسری بڑی غلطی یہ کی ہے کہ یہ آیت صالحین اہل کتاب کے بارے میں ہے یہی بات امین احسن اصلاحی صاحب نے تدبر قرآن ج ا ص: ۳۷۲ پر لکھی ہے حالانکہ سارے مفسرین اس آیت کو اہل کتاب کی ضد وحسد اور عناد وہٹ دھرمی سے وابستہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح اہل کتاب قبلہ کے بارے میں جانتے بوجھتے ہٹ دھرمی اور ضد وعناد سے کام لیتے ہیں اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے بوجھتے ہیں لیکن ضد وعناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۲۰

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾ (بقرہ:۱۵۸)

غامدی صاحب کا ترجمہ ''صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں چنانچہ وہ لوگ جو اس گھر کا حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں ان پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف بھی کرلیں (بلکہ یہ ایک نیکی کا کام ہے) اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کام کیا اللہ اسے قبول کرنے والا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں غامدی صاحب شعائر اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں اسی طرح صفا و مروہ کی سعی اسماعیل علیہ السلام کی قربان گاہ کا طواف ہے جو نذر کی علامت کے طور پر کیا جاتا ہے۔

(البیان ج ا ص:۱۶۱)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے اس آیت کا جو غلط ترجمہ کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے غامدی صاحب کو چاہیے تھا کہ قرآن کی عظمت و احترام کا خیال کرتے اور ہندوستان کے کسی مستند مفسر و مترجم کا ترجمہ لکھتے شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ اور شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ تراجم کے حوالہ سے جانے پہچانے اور مانے ہوئے بزرگ ہیں ان کا ترجمہ نقل کرتے تو یہ رسوائی اور جگ ہنسائی نہ ہوتی۔ ترجمہ کے بعد غامدی صاحب نے تفسیر میں ایک فحش غلطی کی ہے وہ یہ کہ ان کے نزدیک حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی مروہ کے پاس پیش کی گئی تھی اور اسی کے یادگار کے طور پر یہاں طواف کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ امت کے سارے فقہاء علماء اور محدثین تو یہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے منیٰ کے پاس ایک کونے میں حضرت اسماعیل کی قربانی پیش کی تھی اور نبی علیہ السلام نے اس جگہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا کہ ''هٰذَا مَذْبَحٌ'' کہ یہ قربان گاہ ہے سارے مسلمان منیٰ ہی میں قربانی

کرتے ہیں اب غامدی اور امین احسن اصلاحی اور حمید الدین فراہی نے شاید یہود و نصاریٰ کی کسی محرف اور منسوخ کتاب سے یہ لیا ہوگا اسی طرح بے شمار احادیث کا انکار کر کے سب نے لکھدیا کہ قربان گاہ مروہ کے پاس ہے علماء ایک طرف جا رہے ہیں اور غامدی اور ان کے اساتذہ دوسری طرف جا رہے ہیں سچ ہے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ تو می روی بترکستان است

اے دیہاتی مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ تک نہیں پہنچ سکو گے کیونکہ جس راستے پر تو چل پڑا ہے یہ ترکستان کو جاتا ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی ۲۱:

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾ (بقرہ: آیت:۱۵۸)

اس آیت کی تفسیر میں غامدی صاحب نے دوسری فحش غلطی یہ کی ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعی صرف حج وعمرہ کے موقع پر کی جاسکتی ہے اور اس موقع پر بھی یہ ایک نفلی عبادت ہے جو اگر کی جائے تو باعث اجر ہوگی یہ حج وعمرہ کے لازمی مناسک میں سے نہیں ہے (البیان ص:۱۶۴)

تبصرہ:

لو بھائی جاوید غامدی صاحب مفت کے مفتی بن گئے اور حج وعمرہ کے ساتھ صفا ومروہ کے درمیان سعی کا صفایا کر دیا کسی دلیل کی تو ان کو ضرورت نہیں ہوتی ہے ان کا ذہن ان کی سوچ ان کی تحریر وتقریر بس یہی انکی دلیل ہے۔ کسی فقیہ ومفتی اور عالم کے فتویٰ کی ان کو کیا ضرورت ہے جب یہ اجماع صحابہ اور اجماع امت کو نہیں مانتے ہیں تو کسی کے فتویٰ کی کیا حیثیت ہے لیکن ذرا صبر کریں

مرنے کے بعد کسی پوچھنے والے کے پاس جانا ہوگا پھر دیکھیں غامدی صاحب کیا جواب دیں گے
جاوید غامدی صاحب نے اپنی تفسیر میں سب چیزیں امین احسن اصلاحی سے لی ہیں مگر اس نقل کرنے میں بھی وہ غلطی کر دیتے ہیں۔

اصل میں جب خود علم پختہ نہ ہو اور کسی پختہ عالم کی طرف رجوع بھی نہ ہو تو پھر یہی ہوگا جو غامدی صاحب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''یا مرد بنو یا کسی مرد کے سائے میں بیٹھ جاؤ''۔ یہ حضرات نہ خود مرد بنے نہ کسی مرد کی طرف رجوع کیا تو امت کی گمراہی کا سبب بن رہے ہیں اب جو شخص غامدی کی یہ تفسیر پڑھے گا اور سخت گرمی میں حرم شریف جائے گا تھکا ماندہ ہوگا تو وہ یہی کہے گا کہ بھائی سعی چھوڑ دو غامدی صاحب نے اس کو مستحب لکھا ہے کوئی کرے نہ کرے یہ حج کا لازمی حصہ نہیں ہے اس طرح اس شخص کے لاکھوں روپے ضائع ہو جائیں گے نہ حج ہوگا نہ عمرہ صحیح ہوگا۔

جاوید غامدی بیچارے کو قرآن کی آیت ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ﴾ اور ﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ کے مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے دھوکہ ہوا جب ان کا علم اتنا سطحی ہے تو اس نے تفسیر کیوں لکھ دی اور اگر لکھنا بھی تھا تو دوسرے مفسرین کی تقلید کرتے آزاد کیوں بھٹکتے چلے گئے؟

جاوید غامدی کی غلطی ۲۲

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾

(بقرہ: آیت: ۱۷۳)

جناب غامدی صاحب کا عقیدہ ہے کہ شریعت میں صرف چار چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں یعنی مردار، خون، سُور کا گوشت، اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ اس کے علاوہ جو چیزیں ممنوع ہیں وہ شریعت نے نہیں بلکہ انسان کی فطرت نے حرام کیا ہے اس قاعدہ سے غامدی صاحب نے ان تمام احادیث کا انکار کیا جن سے دیگر درندے پرندے چرندے اور حیوانات حرام قرار دیے

گئے ہیں چنانچہ غامدی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ''کھانے اور پینے کی چیزوں میں قرآن نے اصلاً چار ہی چیزیں حرام قرار دی ہیں ان کے علاوہ جو چیزیں کھانے کے لیے موزون نہیں سمجھی جاتیں وہ ممنوعات فطرت ہیں چند سطر آگے غامدی لکھتے ہیں چنانچہ خدا کی شریعت نے اس معاملے میں انسان کو اصلاً اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچلی والے درندوں چنگال والے پرندوں جلاّلہ اور پالتو گدھے وغیرہ کا گوشت کھانے کی جو ممانعت روایت ہوئی ہے وہ اسی فطرت کا بیان ہے شراب سے متعلق قرآن کا حکم بھی اسی قبیل سے ہے۔

(البیان ج ا ص: ۱۷۵)

تبصرہ:

غامدی صاحب کے یہ سارے مفروضے غلط ہیں ان سے پوچھا جائے کہ ان چار اشیاء کی حرمت کے علاوہ سینکڑوں اشیاء ایسی ہیں جو احادیث کی وجہ سے حرام ہیں جب احادیث کی تصریح موجود ہے تو غامدی صاحب احادیث کو چھوڑ کر ''فطرت'' کی طرف کیوں جاتے ہیں؟ ان کے پاس کونسی دلیل ہے کہ فطرت بھی حل وحرمت کے لیے کوئی دلیل ہے پھر اس بے ادب کی اس جرأت کو دیکھیں کہ نبی علیہ السلام کی روایتوں سے جو چیزیں حرام ہوئی ہیں وہ بھی اسی فطرت کی وجہ سے ہے گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت اور روایت کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانی فطرت کی وجہ سے ان چیزوں کو حرام کہا ہے بلکہ قرآن نے شراب کو جو حرام کہا ہے وہ بھی قرآن واسلام کا حکم نہیں ہے بلکہ فطرت کی بنیاد پر شراب کو حرام کہا ہے۔

غامدی صاحب یہ بتائیں کہ آج کل دنیا میں انسانوں کی اس فطرت نے کن کن چیزوں کو حرام کیا ہے؟ یا ممنوع قرار دیا ہے؟ چین کے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں دنیا میں کونسی قبیح چیز ہے جس سے ان کی فطرت نے انکار کیا ہے سانپ بچھو چوہے کتے گدھے بندر لومڑی بلی بلکہ ہر قسم کے کیڑے مکوڑے خوب مزے سے کھاتے ہیں یورپ اور مغرب میں یہود ونصاریٰ کی فطرت نے کس قبیح

چیز سے انکار کیا ہے ہندو گائے کا پیشاب پیتے ہیں گوبر کو متبرک سمجھ کر اس کو چہروں پر ملتے ہیں اور کمروں میں گوبر سے پلستر کر کے کمرے کو مقدس سمجھتے ہیں زندہ بندر کے دماغ کو نکال کر لوگ کھاتے ہیں آخر کب تک گنوں گا ان قبیح اشیاء کے استعمال کے وقت ان تعلیم یافتہ طبقے کی فطرت کہاں گئی؟ فطرت نے کیوں نہیں روکا؟ حقیقت یہ ہے کہ جاوید غامدی صاحب نے احادیث کو ٹھکرانے کے لیے یہ حیلے بہانے تراش لیے ہیں دنیا کا کونسا با اثر انسان ہے جس نے اس لیے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا کہ اس کی فطرت اس سے انکار کرتی ہے۔ غامدی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بہت غلط لکھا ہے اور بلا دلیل لکھا ہے۔

دراصل غامدی صاحب کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا کوئی احترام نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کا تو حوالہ دیا لیکن آپ کی شریعت اور آپ کی احادیث کو مسترد کر دیا۔ پھر غامدی کی مذکورہ عبارت کتنے بڑے جھوٹ پر مبنی ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ خدا کی شریعت نے اس معاملے میں انسان کو اصلاً اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے سوال یہ ہے کہ اگر فطرت اور عقل ہی فیصلہ کے لیے کافی تھی تو مذکورہ چار اشیاء کو قرآن نے کیوں حرام کیا اس کو بھی فطرت کے فیصلے پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ دراصل غامدی صاحب وحدت ادیان کا نظریہ رکھتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ انسان کو دیکھو اور اس کی فطرت کو دیکھو۔ اور اسی پر کار بند رہو اور زندگی گزارو شریعتوں کے قصے کہانیاں چھوڑ دو۔

جاوید غامدی کی غلطی ۲۳

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾

(بقرہ:۱۷۸)

جاوید غامدی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں اصل الفاظ ہیں ''فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ'' لفظ ''معروف'' قرآن میں بھلائی اور خیر کے معنی میں بھی آیا ہے اور رواج اور دستور کے معنی میں

بھی۔ یہاں ''اَدَآءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ '' کے الفاظ اس کے بعد دلیل ہیں کہ یہ دوسرے معنی میں ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ قرآن نے دیت کی کوئی خاص مقدار خود متعین کر دینے کے بجائے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس معاملے میں معاشرے کے دستور کی پیروی کریں۔ قرآن کے اس حکم کے مطابق ہر معاشرہ اپنے ہی دستور کا پابند ہے۔ جس معاشرے میں دیت کا کوئی قانون پہلے سے موجود نہیں ہے، وہاں مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو اختیار ہے کہ چاہیں تو عرب کے اس دستور کو برقرار رکھیں جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں دیت کے فیصلے کیے اور چاہیں تو اس کی کوئی دوسری صورت تجویز کریں۔ وہ جو صورت بھی اختیار کریں گے، معاشرہ اسے قبول کر لیتا ہے تو اس کے لیے وہی دستور قرار پائے گی اور اس کے مطابق دیت ادا کر دینے سے قرآن کا منشا یقیناً پورا ہو جائے گا۔ (البیان ج۱ص:۱۸۷)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے دیت سے متعلق جمہور امت کے خلاف ایک غلط راستہ اختیار کیا ہے ان کو یہاں ''بِالْمَعْرُوْفِ'' کا لفظ نظر آ گیا تو اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تمام احادیث کو نظر انداز کر دیا جو دیت کے متعلق وارد ہیں اور یہ فیصلہ صادر کیا کہ قرآن نے لوگوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ دیت کے معاملے میں معاشرے کے دستور کی پیروی کریں، پھر ہر معاشرہ اپنے اپنے دستور کا پابند ہے اگر معاشرہ میں پہلے سے کوئی قانون موجود نہ ہو تو وقت کے ارباب حل واقتدار کو اختیار ہوگا کہ وہ عرب کے جاہلیت کے دستور کو ڈھونڈ لائے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیت کے فیصلے ان کے دستور کے مطابق کیا کرتے تھے یا خود سے کوئی دوسری صورت تجویز کرے اس گمراہ کن عبارت کو پڑھئے اور پھر اپنے سر کو پکڑیئے کہ اس قسم کے لوگ بھی قرآن کے مفسر بنے ہوئے ہیں جاوید غامدی کے منشور سے متعلق میں نے دیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے ماہنامہ بینات نے اس کو شائع بھی کیا ہے اور ''جاوید غامدی کا منشور'' نامی کتاب

چھپ بھی گئی ہے وہاں تفصیلات کو دیکھیے یہاں میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ قرآن کریم میں کیا معروف سے معاشرہ ہی کا دستور مراد ہے کیا اس کا معنی بھلائی اچھائی اور معقول نہیں ہوسکتا ہے نیز معروف تو ماعرفه الشرع کو کہتے ہیں یعنی جس کو شریعت نے معروف کہا ہو وہی معروف ہے اب سوچیئے غامدی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے نظر انداز کیے اور خود سے جاہلیت کی جہالت کو معروف قرار دیا۔

حضرت تھانوی نے معروف کی تفسیر میں لکھا ہے:

کہ مدعی یعنی مقتول کے وارث کے ذمہ معقول طور پر اس مال کا مطالبہ کرنا معروف ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیت سے متعلق حدیث کی کچھ تفصیل لکھدیا جائے مکمل بحث میری کتاب غامدی کا منشور میں موجود ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اِلٰی اَهْلِ الْیَمَنِ وَکَانَ فِیْ کِتَابِهٖ اَنَّ مَنْ اِعْتَبَطَ مُؤْمِنًا قَتْلًا فَاِنَّهٗ قَوَدُ یَدِهٖ اِلَّا اَنْ یَّرْضٰی اَوْلِیَآءُ الْمَقْتُوْلِ وَفِیْهِ اَنَّ الرَّجُلَ یُقْتَلُ بِالْمَرْاَةِ وَفِیْهِ فِی النَّفْسِ الدِّیَةُ مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ وَعَلٰی اَهْلِ الذَّهَبِ اَلْفُ دِیْنَارٍ وَفِی الْاَنْفِ اِذَا اُوْعِبَ جَدْعُهٗ الدِّیَةُ مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ وَفِی الْاَسْنَانِ الدِّیَةُ وَفِی الشَّفَتَیْنِ الدِّیَةُ وَفِی الْبَیْضَتَیْنِ الدِّیَةُ وَفِی الذَّکَرِ الدِّیَةُ وَفِی الصُّلْبِ الدِّیَةُ وَفِی الْعَیْنَیْنِ الدِّیَةُ وَفِی الرِّجْلِ الْوَاحِدَةِ نِصْفُ الدِّیَةِ وَفِی الْمَامُوْمَةِ ثُلُثُ الدِّیَةِ وَفِی الْجَائِفَةِ ثُلُثُ الدِّیَةِ وَفِی الْمُنَقَّلَةِ خَمْسَ عَشْرَةَ مِنَ الْاِبِلِ وَفِیْ کُلِّ اِصْبَعٍ مِنْ اَصَابِعِ الْیَدِ وَالرِّجْلِ عَشْرٌ مِنَ الْاِبِلِ وَفِی السِّنِّ خَمْسٌ مِنَ الْاِبِلِ (رواه النسائی والدارمی) وَفِیْ رِوَایَةِ مالک وَفِی الْعَیْنِ خَمْسُوْنَ وَفِی الْیَدِ خَمْسُوْنَ وَفِی الرِّجْلِ خَمْسُوْنَ وَفِی الْمُوْضِحَةِ خَمْسٌ

(مؤطا امام مالک)

اور حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم اپنے والد (حضرت محمد ابن عمرو) سے اور وہ

یا ظاہر ہوگئی ہو پانچ اونٹ ہیں۔ (مؤطا امام مالک)

دین اسلام کا یہ واضح قانون احادیث کی معتبر کتابوں میں انتہائی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اگر کوئی شخص ایمان واسلام کا دعویٰ رکھتا ہو تو وہ اس واضح شاہراہ کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہے نہ کسی حاکم یا قاضی یا عرف پر اس کو چھوڑ سکتا ہے جناب غامدی صاحب دین اسلام کے مبارک چہرہ کو مسخ کرنا چاہتا ہے مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ دین کا چہرہ روشن رہے گا خود ان کا چہرہ مسخ ہو جائے گا۔

جاوید غامدی کی غلطی ۲۴

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ (بقرۃ:۱۸۹)

غامدی صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے ''وہ تم سے حرام مہینوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہدو یہ لوگوں کی بہبود اور حج کے اوقات ہیں''۔ غامدی صاحب نے اپنے مطلب تک پہنچنے کے لیے یہ غلط ترجمہ کیا ہے صحیح ترجمہ اس طرح ہے، شیخ الہندؒ لکھتے ہیں: تجھ سے پوچھتے ہیں حال نئے چاند کا کہدے کہ یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے (ترجمہ شیخ الہند)

جاوید غامدی نے اپنے ترجمے میں یہ غلطی کی ہے کہ صحابہ کے سوال کو چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بجائے اشہر حرم کے چار مہینوں کے ساتھ جوڑا ہے جس سے کئی احادیث کا انکار لازم آتا ہے جس کو حضرت ابن عباس اور دیگر مفسرین ومحدثین نے نقل کی ہیں چنانچہ جاوید غامدی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں اصل الفاظ ہیں ''وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الأهِلَّةِ'' ان میں ''اَهِلَّه'' ھلال کی جمع ہے، ہلال شروع ماہ کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور اس سے مراد مہینہ بھی ہوتا ہے۔ جمع کی صورت میں بالخصوص اس کا استعمال مہینوں ہی کے لیے معروف ہے اس پر الف لام ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سوال کچھ مخصوص مہینوں کے بارے میں ہے اور جواب سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حرام مہینوں (اشہر الحرم) اور اسکے آداب سے متعلق تھا (البیان ج اص:۲۰۲)

ابوبکر کے دادا (حضرت عمرو ابن حزم) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے پاس ایک ہدایت نامہ بھیجا جس میں لکھا ہوا تھا کہ جو شخص قصداً کسی مسلمان کو ناحق مار ڈالے (یعنی قتل عمد کا ارتکاب کرے) تو اس کے ہاتھوں کے فعل کا قصاص ہے (یعنی اس نے اپنے ہاتھوں کے فعل اور تقصیر کے ذریعہ جو قتل عمد کیا ہے اس کی سزا میں اس کو بھی قتل کر دیا جائے) الا یہ کہ مقتول کے ورثاء راضی ہو جائیں (یعنی اگر مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیں یا اس سے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو اس کو قتل نہ کیا جائے) اس ہدایت نامہ میں یہ بھی تھا کہ (مقتول) عورت کے بدلے میں (قاتل) مرد کو قصاص میں قتل کیا جائے، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جان کا خون بہا سو اونٹ ہیں (یعنی جس کے پاس اونٹ ہوں وہ خون بہا میں مذکورہ تفصیل کے مطابق سو اونٹ دے) اور جس کے پاس سونا ہو وہ ایک ہزار دینار دے، اور ناک کی دیت جب کہ وہ پوری کاٹی گئی ہو ایک سو اونٹ ہیں اور دانتوں کی دیت (جب کہ وہ سب توڑے گئے ہوں) پوری دیت (یعنی ایک سو اونٹ کی تعداد) ہے اور ہونٹوں کی دیت (جب کہ وہ پورے کاٹ دیئے گئے ہوں) پوری دیت ہے اور دونوں خصیوں کے کاٹے جانے کی بھی پوری دیت ہے اور پیٹھ کی ہڈی توڑے جانے کی پوری دیت ہے اور عضو خاص کے کاٹے جانے کی بھی پوری دیت ہے اور دونوں آنکھوں کو پھوڑ دینے کی بھی پوری دیت ہے، اور ایک پیر کاٹنے پر آدھی دیت ہے، اور سر کی جلد زخمی کرنے پر تہائی دیت ہے اور پیٹ میں زخم پہنچانے پر بھی تہائی دیت ہے اور اس طرح مجروح کرنے پر کہ ہڈی ایک جگہ سے سرک گئی ہو پندرہ اونٹ دینے واجب ہیں اور ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں سے ہر ایک انگلی (کاٹنے) پر دس اونٹ دینے واجب ہیں، اور ہر ہر دانت کا بدلہ پانچ پانچ اونٹ ہیں۔ (نسائی، دارمی) اور امام مالک رحمہ اللہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ایک آنکھ (پھوڑنے) کی دیت پچاس اونٹ ہیں اور ایک ہاتھ اور ایک پیر کی دیت پچاس پچاس اونٹ ہیں اور ایسا زخم پہنچانے کی دیت جس میں ہڈی نکل آئی ہو

یا ظاہر ہو گئی ہو پانچ اونٹ ہیں۔ (مؤطا امام مالک)

دین اسلام کا یہ واضح قانون احادیث کی معتبر کتابوں میں انتہائی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اگر کوئی شخص ایمان واسلام کا دعویٰ رکھتا ہو تو وہ اس واضح شاہراہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے نہ کسی حاکم یا قاضی یا عرف پر اس کو چھوڑ سکتا ہے جناب غامدی صاحب دین اسلام کے مبارک چہرہ کو مسخ کرنا چاہتا ہے مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ دین کا چہرہ روشن رہے گا خود ان کا چہرہ مسخ ہو جائے گا۔

جاوید غامدی کی غلطی ۲۴

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ (بقرۃ:۱۸۹)

غامدی صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے ''وہ تم سے حرام مہینوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دو یہ لوگوں کی بہبود اور حج کے اوقات ہیں''۔ غامدی صاحب نے اپنے مطلب تک پہنچنے کے لیے یہ غلط ترجمہ کیا ہے صحیح ترجمہ اس طرح ہے، شیخ الہندؒ لکھتے ہیں: تجھ سے پوچھتے ہیں حال نئے چاند کا کہدے کہ یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے (ترجمہ شیخ الہند)

جاوید غامدی نے اپنے ترجمے میں یہ غلطی کی ہے کہ صحابہ کے سوال کو چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بجائے اشہر حرم کے چار مہینوں کے ساتھ جوڑا ہے جس سے کئی احادیث کا انکار لازم آتا ہے جس کو حضرت ابن عباس اور دیگر مفسرین ومحدثین نے نقل کی ہیں چنانچہ جاوید غامدی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں اصل الفاظ ہیں ''وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ '' ان میں ''اَهِلَّه'' ھلال کی جمع ہے، ہلال شروع ماہ کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور اس سے مراد مہینہ بھی ہوتا ہے۔ جمع کی صورت میں بالخصوص اس کا استعمال مہینوں ہی کے لیے معروف ہے اس پر الف لام ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سوال کچھ مخصوص مہینوں کے بارے میں ہے اور جواب سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حرام مہینوں (اشہر الحرم) اور اسکے آداب سے متعلق تھا (البیان ج۱ص:۲۰۲)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے پہلی غلطی یہ کی ہے کہ ''اَھِلَّـہ'' سے چاند کے بجائے مہینے لیے ہیں حالانکہ ہلال ہر مہینے کی پہلی چاند کو کہتے ہیں جو یہاں متعین ہے جس پر صحابہ کا سوال دلالت کر رہا ہے جنہوں نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سوال کیا تھا جواب میں کہا گیا کہ یہ لوگوں کے اوقات کے معلوم کرنے کے لیے ہے اور ان کے معاملات و معاہدات اور عورتوں کی مدت حیض و نفاس اور طلاق وغیرہ کی وجہ سے عدت کی مدت معلوم کرنے اور حج وغیرہ امور کے لیے ہے اگر یہ سوال اشہر حرم کے بارے میں تھا تو جواب میں مہینوں کا ذکر آنا چاہیے تھا اوقات کے ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے غامدی نے یہاں دلائل دینے کی کوشش بھی کی ہے اور کہا ہے کہ ہلال نئے چاند کو بھی کہتے ہیں اور مہینے کو بھی کہتے ہیں ان کا یہ کہنا غلط ہے مہینہ کو براہ راست ہلال نہیں کہتے ہیں۔ ہلال مہینہ کے ابتدائی چاند کو کہتے ہیں۔

غامدی نے کہا ہے کہ جمع کی صورت میں اس کا استعمال مہینوں ہی کے لیے معروف ہے غامدی کا یہ کہنا بھی غلط ہے یہ عربیت کا کوئی قاعدہ نہیں ہے بلکہ قرآن کی یہی آیت صریح دلیل ہے کہ جمع کی صورت میں یہ ہر نئے چاند کے لیے استعمال ہوا ہے سال کے بارہ مہینوں کے چاندوں کے بارے میں سوال تھا تو یہاں جمع کے سوا کیا لفظ بولا جا سکتا تھا؟ غامدی نے الف لام سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے تو عرض ہے کہ یہاں الف لام عہد خارجی کے لیے نہیں ہے اور نہ یہاں کوئی معہود مہینے تھے مہینوں کا تو سوال بھی نہیں تھا چاندوں کا سوال تھا بلکہ یہ الف لام جنس کے لیے ہے اور الف لام استغراق کا بھی ہوسکتا ہے غامدی صاحب اکثر لکھتے ہیں کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے اور قرآن کا اسلوب وہ ہے یہ رعب ڈالنے کے لیے الفاظ کا دباؤ اور تعیش ہے تمام عرب وعجم کے مفسرین کو اسلوب کا پتہ نہیں چلا اور غامدی صاحب غلط راستے پر چل کر اسلوب کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ اس آیت کے بعد چونکہ جہاد و قتال کا مضمون آگیا ہے تو غامدی صاحب نے نظم قرآن اور

ربط کی غرض سے چاند سے متعلق اس آیت کو اشہر حرم کے ساتھ جوڑ دیا تا کہ قتال کا تعلق اشہر حرم سے ہو جائے اور احادیث سے بھی جان چھوٹ جائے اس ربط کا کیا فائدہ ہوا کہ جس سے قرآن کریم میں تحریف بھی کی اور احادیث کا انکار بھی کیا اور خود ساختہ ربط پیدا کر دیا۔

جاوید غامدی کی غلطی ۲۵

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآءِ كُمْ﴾ (بقرہ:۱۸۷)

اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے درگزر کیا (غامدی ترجمہ) غامدی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں غلطی کی ہے اور یہ تأثر دیا ہے کہ رات کے وقت کا روزہ صحابہ نے یہود کو دیکھ کر خود سے رکھنا شروع کر دیا تھا چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں، یعنی اپنے خیال کے مطابق یہ سمجھتے ہوئے کہ رمضان کی راتوں میں بیویوں کے پاس جانا جائز نہیں اس کی خلاف ورزی کر رہے تھے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے بعد معاً شروع ہو جاتا تھا اور روزے کی رات میں کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے مسلمانوں نے اس سے گمان کیا کہ ان کے لیے بھی یہی قانون ہوگا لیکن پھر ان میں سے بعض لوگ یہ گمان اپنے دلوں میں رکھتے ہوئے اس کی خلاف ورزی کر بیٹھے قرآن نے اسنے اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ (البیان ج۱ص۱۹۹)

تبصرہ:

غامدی صاحب کا خیال ہے کہ رات کے افطار کے بعد روزہ رکھنا صحابہ نے خود سے شروع کیا تھا چنانچہ اس نے اوپر تفسیر میں اپنے خیال کے مطابق کا لفظ استعمال کیا ہے جاوید غامدی کا یہ خیال بھی غلط ہے اور یہ تفسیر بھی غلط ہے وہ مفسرین جو اکثر صحابہ کے شاگرد ہیں یا خود صحابہ میں سے ہیں مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یا ان کے شاگرد مجاہد وعطاء سعید بن جبیر طاؤس سالم وعبداللہ وعمرو بن دینار وحسن وقتادہ وزہری وضحاک ابراہیم نخعی وسدّی اور عطاء خراسانی اور مقاتل بن

حیان وغیرہ سب کی تفسیر اس طرح ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے رخصت اتری ہے اور اس پابندی کو اٹھالیا گیا جو ابتداء اسلام میں تھی وہ اس طرح کہ کوئی شخص جب روزہ افطار کرتا تھا تو عشاء کی نماز تک کھانا پینا جائز ہوتا تھا یا سوجانے تک جائز ہوتا تھا اس سے پہلے اگر کوئی سوجاتا تو پھر کھانا حلال نہیں رہتا تھا جب عشاء کا وقت ہوجاتا یا کوئی اس سے پہلے سوجاتا تو پھر اگلی رات تک کھانا حرام ہوجاتا تھا اس وجہ سے بڑی مشقت تھی بلکہ اس میں بعض صحابہ سے خلاف ورزی ہوئی تھی حتی کہ حضرت عمر فاروق کے ساتھ اس طرح واقعہ پیش آیا انہوں نے آنحضرت کے سامنے شکایت کی۔ حضرت صرمہ بن قیس رضی اللہ عنہ اور کعب بن مالک سے بھی اس طرح غلطی ہوگئی تب اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اٹھالیا اب ناظرین غور کریں یہ اسلام کا حکم تھا یا صحابہ نے یہود کو دیکھ کر خود سے ایک پابندی اپنے آپ پر لگائی تھی؟ آنحضرت کی موجودگی میں حاشا وکلا صحابہ اس طرح کر سکتے تھے حالانکہ وہ ایک ایک نقل وحرکت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیتے تھے جمہور مفسرین کو چھوڑ کر خود ساختہ تفسیر کرنے کا یہی انجام ہوتا ہے جناب مودودی صاحب اور دیگر خود ساختہ مفسرین نے بھی اس آیت کی اسی طرح وہم پر مبنی تفسیر لکھدی ہے حالانکہ قرآن کی آیت ''أُحلَّ لکم'' کہ تمہارے لیے یہ حلال کیا گیا کی آیت کا اسلوب کلام تو یہ ہے کہ یہ حرمت کے بعد حلت کا اعلان ہے پھر اس کے بعد ''انکم کنتم تختانون'' کے جملہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خیانت تو ایک جرم کا نام ہے اگر یہ حلال تھا تو اس کے خلاف کرنے کو خیانت کیوں کہا؟ خلاصہ یہ کہ مفسرین نے صحیح لکھا ہے اور غامدی صاحب کی تفسیر غلط ہے ان آیتوں میں غامدی صاحب نے ایک اور غلطی بھی کی ہے، وہ لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے کی یہ اجازت صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہوجانے تک ہے اس وجہ سے معمولی تقدیم وتاخیر پر اپنے یا دوسروں کے روزے مشتبہ قرار دے بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ (البیان ص:۲۰۰)

تبصرہ:

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ صبح صادق کے واقع ہو جانے کے بعد ایک منٹ بھی ایسا نہیں ہے جس میں کھانا کھایا جائے یا جماع کیا جائے صبح صادق سے پہلے اذان جائز نہیں اور اذان کے بعد کھانا پینا جائز نہیں دارومدار صبح صادق پر ہے اللہ کی کتاب کا بھی یہی اعلان ہے اب غامدی صاحب نے یہ گنجائش کہاں سے نکالی ہے کہ معمولی تقدیم یا تاخیر سے کچھ نہیں ہوتا؟ ان کے پاس کیا دلیل ہے دلیل کے بغیر کیا مسلمانوں کے روزوں کو خراب کرنے کے لیے تفسیر لکھ ڈالی؟ ان کو تفسیر بالرائے لکھنے کے جرم کی سزا ہو سکتی ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی ۲۶

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ (بقرہ:۱۹۳)

غامدی صاحب نے اپنے مطلب کے لیے یہ ترجمہ کیا ہے اور تم یہ جنگ ان سے برابر کیے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (اس سرزمین میں) اللہ ہی کا ہو جائے۔

غامدی صاحب نے اس آیت کی تفسیر اس طرح لکھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قتال کا حکم یہاں دیا گیا ہے اس کی غایت صرف یہ نہیں ہے کہ حج کی راہ میں قریش کی مزاحمت ختم کر دی جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی ہے کہ (۱) فتنہ باقی نہ رہے (۲) اور سرزمین عرب میں دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے۔ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو جنگ کا حکم انہی دو مقاصد کے لیے دیا گیا ہے۔ (البیان ج۱ص:۲۰۶)

اس کے بعد آگے غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ اس دوسرے مقصد کے لیے قتال اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ (البیان ص:۲۰۷)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے مندرجہ بالا عبارت میں ایک غلطی یہ کی ہے کہ انہوں نے یہاں حج کے راستے میں قریش کی مزاحمت کو ختم کرنا جہاد کے مقاصد میں شمار کیا ہے یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ جہاد سے عام امن آجاتا ہے حجاج کرام کے اسفار کے راستے محفوظ ہو جاتے ہیں اور یہ مقصود بھی ہے لیکن یہاں جہاد کا ذکر حجاج کے راستوں کی حفاظت کی وجہ سے نہیں کیا گیا ہے جہاد کا حکم تو ہجرت کے ساتھ متصل آیا تھا جو دو ہجری سے پہلے تھا اور حج کا حکم راجح قول کے مطابق نو ہجری کو آیا تھا تو جہاد کی ان آیات کو حج کے ساتھ جوڑنا غامدی صاحب کی غلطی ہے لیکن غامدی صاحب نے چونکہ ''الاھلہ'' کا مطلب چاندوں کے بجائے اشہر الحرم کی طرف موڑ دیا ہے لہٰذا ان کو مجبوراً کہنا پڑا کہ جہاد کی غایت حج کے راستوں میں قریش کی مزاحمت ختم کرنا تھا بہر حال ان آیات میں جہاد کی غایت کے لیے دو چیزوں کا ذکر ہوا ہے ایک یہ کہ دنیا سے فتنہ وفساد ختم ہو جائے فتنہ کا تعلق اگر عقیدہ سے ہو تو وہ شرک ہے اور شرک تب ختم ہوگا کہ اسلام کو قبول کیا جائے یا مسلمانوں کے سامنے کافروں کی طاقت مغلوب ہو جائے جہاد کی غایت کے لیے دوسری چیز یہ ہے کہ دین مکمل طور پر اللہ کے لیے ہو جائے یہ دوسری چیز فی الحقیقت کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ پہلی چیز سے حاصل شدہ نتیجہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے مقابلے میں بطور غالب اور بطور قوت کوئی دین باقی نہ رہے جو رہے تو مغلوب رہے یعنی اگر کوئی باطل مذہب باقی بھی رہے تو مغلوب رہے۔ غامدی صاحب نے یہاں دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اس نے دین اسلام صرف اللہ ہی کا ہو جائے کے ساتھ یہ جملہ لگا دیا کہ ''سرزمین عرب میں دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے''۔

اس سے غامدی صاحب یہ بات نکالنا چاہتا ہے کہ اسلام کا غلبہ اور جہاد کا حکم صرف سرزمین عرب کے لیے ہے اس کے باہر دنیا کے لیے نہیں ہے چنانچہ اس نے اگلی عبارت میں صاف لکھا ہے کہ

اس دوسرے مقصد کیلئے قتال اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ جاوید غامدی صاحب اور اس کے پیروکاروں کا یہی عقیدہ ہے کہ جہاد کا حکم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور جزیرۂ عرب پر اسلام کے غلبے تک محدود تھا جب وہ حاصل ہو گیا تو اب جہاد ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے اسی مقصد کے لیے غامدی نے یہ غلط ترجمہ کیا کہ دین اس سرزمین میں اللہ ہی کا ہو جائے حالانکہ قرآن کی آیت میں اس طرح کوئی تخصیص نہیں ہے غامدی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ قرآن کی مطلق آیت میں تحدید و تخصیص کر رہا ہے یہی عقیدہ قادیانیوں کا ہے اور یہی عقیدہ بددینوں کا ہے حالانکہ قرآن وحدیث کی نصوص میں کوئی تخصیص و تحدید نہیں ہے بلکہ احادیث میں قیامت تک جہاد کے جاری رہنے کے واضح احکامات موجود ہیں پھر خلفائے راشدین اور صحابہ نے جزیرۂ عرب سے نکل کر شام کی سرزمین میں ہزاروں جنگیں لڑیں مصر میں جنگیں ہوئیں دیار بکر سے ہوتے ہوئے صحابہ کرام عراق تک جہاد کرتے چلے گئے پھر افغانستان تک جہاد کے لیے گئے پھر تابعین اور تبع تابعین نے مسلسل جہاد کیا اندلس فتح کیا افریقہ فتح کیا ہندوستان فتح کیا اور قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ و مہدی کی معیت میں مسلمان دجال کے مقابلے میں لڑیں گے پھر دین اسلام خالص دین اسلام رہ جائے گا اور غامدی جلتا رہے گا۔ غامدی نے اپنے اس خود ساختہ کلام سے دسیوں احادیث کا انکار کیا ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی ۲۷

﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ (بقرہ:۱۹۵)

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے۔

جناب غامدی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں اپنا غلط عقیدہ اور نظریہ بیان کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں، ان عبادات کا ذکر یہاں جس طریقے سے ہوا ہے اس سے واضح ہے کہ اہل عرب کے لیے یہ کوئی اجنبی چیزیں نہ تھیں ان کی تاریخ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ حج وعمرہ کے

مناسک اور حدود و آداب سے وہ پوری طرح واقف تھے اس میں شبہ نہیں کہ ان میں بعض بدعات انہوں نے داخل کر دی تھیں لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ عبادات کیا ہیں (البیان ص:۲۱۱)

تبصرہ:

غامدی صاحب اور ان کے شاگرد چونکہ احادیث کا انکار کرتے ہیں اس لیے احادیث کے حوالہ اور تفصیلات کے بجائے وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے جن احکامات کو بیان کیا ہے عرب وہ پہلے سے سمجھتے تھے صرف قرآن نے نام لیا کہ حج یا صلوۃ یا زکوۃ یا صوم یا بیوعات وغیرہ ادا کیا کرو تو ان احکامات کے نام کو سنتے ہی عرب پوری تفصیل جانتے تھے اس لیے صرف قرآن کافی شافی ہے احادیث کی ضرورت نہیں ہے۔ غامدی صاحب نے اپنا یہ غلط عقیدہ بار بار اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے یہ اتنا غلط نظریہ ہے جس کی غلطی آسمان کے سورج کی طرح روشن اور پہاڑ سے بھی زیادہ بھاری ہے اسی نظریہ کے پیش نظر غامدی گروپ پوری شریعت کے باغی ہیں غامدی صاحب نے دھوکہ دینے کے لیے اپنی کتاب المیزان میں مسائل کے اثبات کے لیے احادیث کا مسلسل ذکر کیا ہے وہ محض دھوکہ ہے تاکہ لوگوں کو کہہ سکیں کہ غامدی احادیث کا منکر نہیں ہے ورنہ غامدی صاحب کی اس پوری تفسیر میں انہوں نے حدیث کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا الا فی عدۃ مواضع قلیلۃ

جاوید غامدی کی غلطی ۲۸

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ (بقرہ: آیت:۲۴۳)

جاوید غامدی نے اپنے مطلب کا یہ ترجمہ کیا ہے، کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھر چھوڑ کر ان سے نکل کھڑے ہوئے اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مردے ہو کر جیو، پھر اللہ نے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی، اس ترجمہ میں غامدی صاحب نے ایک غلطی یہ کی ہے کہ مردے ہو کر جیو کے ترجمہ سے ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ

حقیقت میں مرے نہیں تھے بلکہ ان کی زندگی موت کی طرح ذلت آمیز بن گئی تھی دوسری غلطی یہ کی کہ انہی دوبارہ زندگی عطا کی سے غامدی یہ تاثر دیتا ہے کہ ان کو دوبارہ قومی حیثیت سے ترقی عطا کی چنانچہ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں، اصل میں لفظ مُوتُوا آیا ہے یعنی مرجاؤ یہ قومی حیثیت ہے ذلت اور نامرادی سے تعبیر ہے "ثُمَّ اَحْيَاهُمْ" یہ زندگی اسی قانون کے مطابق دی گئی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے توبہ واستغفار کر کے از سرنو ایمان واسلام کی راہ اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے صلے میں انہیں قومی حیثیت سے از سرنو زندہ کر دیا اور دشمنوں کے مقابلے میں عزت وسربلندی عطا فرمائی۔ (البیان ص:۲۶۲)

تبصرہ:

غامدی کے الفاظ کچھ دبے دبے ہیں مگر امین احسن اصلاحی نے صاف صاف لکھدیا ہے کہ "مُوتُوا" سے مراد بیہوشی ہے یا اخلاقی موت اور تنزل مراد ہے اور اَحْيَاهُمْ سے نئی زندگی نئی تحریک نیا جذبہ مراد ہے چنانچہ اصلاحی صاحب کے شاذ نظریہ نمبر ۱۷ کے تحت میں نے سب کچھ لکھدیا ہے اور مفسرین کی صحیح تفسیر بھی لکھدی ہے کہ وبائی مرض کے خوف سے یا دشمن کے خوف سے یہ دس ہزار لوگ گھروں کو چھوڑ کر بھاگے تھے اللہ تعالیٰ نے موت دیدی تا کہ یہ تعلیم ہو جائے کہ موت صرف جہاد سے نہیں بلکہ دوسرے اسباب سے بھی آتی ہے۔ وہاں میں نے شیخ الہند رحمہ اللہ کا صحیح ترجمہ اور صحیح تفسیر بھی پیش کی ہے اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

جاوید غامدی کی غلطی ۲۹

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ أَنْ تَضِلَّ اِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدَاهُمَا الْاُخْرٰى﴾ (بقرہ:۲۸۲)

ترجمہ: اور گواہ کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تا کہ اگر بھول جائے ایک عورت ان میں

سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری (ترجمہ شیخ الہند)

چونکہ قرآن کریم میں مردوں اور عورتوں کی گواہی میں واضح فرق ہے کہ اگر ایک مرد ہو تو گواہی کا نصاب پورا کرنے کیلئے دوسرے مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی ایک عورت کی گواہی معتبر نہیں ہے قرآن مجید میں چونکہ اس آیت میں تصریح ہے کہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے ورنہ گواہی معتبر نہیں ہوگی تو غامدی صاحب نے اس آیت میں مختلف صورتیں اور مختلف شکلیں بنائی ہیں اور کہا ہے کہ ایک گواہی واقعاتی ہوتی ہے اور دوسری گواہی دستاویزی ہوتی ہے اس آیت کا تعلق واقعاتی شہادت سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق دستاویزی شہادت سے ہے چنانچہ غامدی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ''اس آیت میں گواہی کا جو ضابطہ بیان ہوا ہے اس کے بارے میں دو باتیں واضح رہنی چاہیے ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ اس ضابطے کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ صرف دستاویزی شہادت سے متعلق ہے ہر شخص جانتا ہے کہ دستاویزی شہادت کے لیے گواہ کا انتخاب ہم کرتے ہیں اور اتفاقی شہادت میں گواہ کا موقع پر موجود ہونا ایک اتفاقی معاملہ ہوتا ہے۔ (البیان ص:۳۰۶)

غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ دوسری بات یہ کہ اس آیت کے موقع ومحل اور اسلوب بیان میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اسے قانون وعدالت سے متعلق قرار دیا جائے اس آیت میں عدالت کو مخاطب کر کے یہ بات نہیں کہی گئی کہ اس طرح کا کوئی مقدمہ اگر پیش کیا جائے تو مدعی سے اس نصاب کے مطابق گواہ طلب کرو۔ (البیان ص:۳۰۷)

تبصرہ:

جناب غامدی صاحب نے اپنی تصنیف البرہان میں مکمل وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کا قانون شہادت قرآن کی مذکورہ آیت سے ثابت نہیں ہوتا ہے جاوید غامدی صاحب نے اپنے منشور کے صفحہ ۱۸ پر بھی قانون شہادت سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے میں

نے اس پر مواخذہ بھی کیا ہے اور بینات میں شائع بھی ہو گیا ہے اور ''جاوید غامدی کا منشور'' کے نام سے ایک کتاب بھی چھاپ کر شائع کیا ہے اسی کتاب کے چند مندرجات قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ملاحظہ فرمائیں:

قانون شہادت سے متعلق غامدی صاحب کا نظریہ

''حدود وتعزیرات'' کے بڑے عنوان کے تحت دفعہ ۵ کے ضمن میں قانون شہادت کے متعلق اپنے منشور کے ص:۱۸ پر جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ ''شہادت کے معاملے میں بھی یہ حقیقت تسلیم کی جائے کہ حدود وتعزیرات، قصاص ودیت، مالی حقوق، نکاح وطلاق، غرض یہ کہ تمام معاملات میں یہ قاضی کی صواب دید پر ہے کہ وہ کس کی گواہی قبول کرتا ہے اور کس کی گواہی قبول نہیں کرتا، اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے عورت اگر اپنے بیان میں الجھے بغیر واضح طریقے پر گواہی دیتی ہے تو اسے محض اس وجہ سے رد نہیں کر دیا جائے گا کہ اس کے ساتھ کوئی دوسری عورت یا مرد نہیں ہے اور مرد کی گواہی میں اگر اضطراب وابہام ہے تو اسے محض اس وجہ سے قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ مرد ہے عدالت اگر گواہوں کے بیانات اور دوسرے قرائن وحالات کی بنا پر مطمئن ہو جاتی ہے کہ مقدمہ ثابت ہے تو وہ لامحالہ اسے ثابت قرار دے گی اور وہ اگر مطمئن نہیں ہوتی تو اسے یہ حق بے شک حاصل ہے کہ وہ دس مردوں کی گواہی کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دے (منشور: ص:۱۸)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے اپنے منشور کی مذکورہ عبارت میں واضح طور پر مسلمانوں کے سارے اسلامی احکام اور معاملات کو ججوں کے حوالے کر دیا ہے اور ججوں کو کسی شریعت وقانون کا پابند نہیں رکھا بلکہ سب کچھ ان کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے کہ جج جو کچھ کرنا چاہتا ہے ان کو مکمل اختیار ہے کہ کسی کی گواہی قبول کرے یا رد کرے گواہ عورت ہو یا مرد ہو کوئی فرق نہیں ہے یہ غامدی صاحب کی

بہت بڑی گمراہی ہے اس طرح اس نے شریعت مقدسہ کے اصول وقواعد کو معطل کر کے پارہ پارہ کر دیا ہے حالانکہ قاضی مسلمانوں کے اسلامی حاکم کی طرف سے شریعت کے اسلامی فیصلوں پر مقرر ہوتا ہے اور شریعت کے ہر ضابطے کا پابند ہوتا ہے اس کا منصب اتنا حساس ہے کہ وہ غصہ کی حالت میں یا قضاء حاجت کی ضرورت کی حالت میں یا بھوک و پیاس کی حالت میں فیصلہ نہیں سنا سکتا ہے کیونکہ ان احوال میں ان کی گرفت شرعی مسئلہ پر مضبوط نہیں ہوتی ہے مبادا غلط فیصلہ نہ کر بیٹھے، قاضی کو شریعت نے قطعاً آزاد نہیں چھوڑا ہے کہ وہ اپنی صواب دید پر فیصلے سنایا کرے بلکہ اس کو سب سے پہلے قرآن پھر سنت پھر اجماع امت کے فیصلوں کے پابند بنایا ہے چنانچہ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت اس طرح ہے:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَهُ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ كَيْفَ تَقْضِيْ اِذَا عرضَ لَكَ قَضَاءٌ قَالَ اَقْضِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ؟ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ اَجْتَهِدُ رَائِيْ وَلاَ آلُو قَالَ فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى صَدْرِهٖ وَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لِمَا يَرْضٰى بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو (قاضی بنا کر) یمن بھیجا تو ان سے پوچھا کہ جب تمہارے سامنے کوئی قضیہ پیش ہوگا تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے انہوں نے کہا کہ میں کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا آنحضرت نے فرمایا کہ تمہیں اگر وہ مسئلہ (صراحۃ) کتاب اللہ میں نہ ملا؟ انہوں نے فرمایا کہ پھر سنت رسول اللہ (حدیث نبوی) کے مطابق فیصلہ کروں گا فرمایا کہ اگر تمہیں وہ مسئلہ سنت رسول اللہ میں بھی (صراحۃ) نہ ملا؟ انہوں نے کہا کہ پھر میں اپنی رائے سے اجتھاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا حضرت معاذ فرماتے ہیں

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک معاذ کے سینے پر مارا اور فرمایا تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ کے قاصد (معاذؓ) کو اس چیز کی توفیق عطا کی جس سے اللہ کا رسول راضی ہوا (ترمذی ابوداؤد)

شہادت اور گواہی سے متعلق قرآن کی آیت اس طرح ہے:

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى﴾

(سورۃ بقرہ:۲۸۲)

ترجمہ: اور گواہ کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تا کہ اگر بھول جائے ایک (عورت) ان میں سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری''۔

شیخ الہند رحمہ اللہ ترجمہ کے بعد اس آیت کی مختصر تفسیر میں اس طرح فرماتے ہیں اور تم کو چاہیے کہ اس معاملہ پر کم سے کم دو گواہ مردوں میں سے یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں اور گواہ قابل پسند یعنی لائق اعتبار اور اعتماد ہوں (تفسیر عثمانی ص:۶۱)

قرآن عظیم کی یہ واضح آیت ہے جس میں مرد اور عورت کی گواہی کا معیار بیان ہوا ہے تمام مفسرین نے اس کی تفسیر میں کوئی شک نہیں کیا اور نہ اس میں شقیں بنا کر اس فرق کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے نہ محدثین نے مردوں اور عورتوں کی گواہی کے اس فرق کا انکار کیا ہے اور نہ فقہاء کرام نے شہادت کے اس نصاب پر کلام کیا ہے آخر میں غامدی صاحب تشریف لائے تو اس نے مغرب اور یورپ کو خوش کرنے کے لیے اس واضح آیات میں اگر چہ مگر چہ اور ایں چنیں و آنچناں شروع کر دیا اور باطل تاویلیں اختیار کیں اور فقہاء کرام پر ناسمجھی کا فتویٰ لگا دیا اور کہا کہ ''اس آیت سے فقہاء کا استدلال ہمارے نزدیک دو وجوہ سے محل نظر ہے ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ اس آیت کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں یہ دستاویزی شہادت سے متعلق ہے۔ (برھان: ص:۲۹)

تبصرہ:

میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اس آیت میں قرآن مجید کے مخاطب اگر عدالت نہیں ہے تو آپ ہمیں بتائیں وہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ شرعی قضاوت کا حکم دے رہا ہے اور پھر نصاب شہادت کی رہنمائی فرما رہا ہے کیا غامدی صاحب نے اس سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ ان کے دفتر اور آفس کا معاملہ ہے؟ غور کرو یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کا تعلق خالص عدالت سے ہے گواہوں کی بات ہے قاضیوں کو حکم ہے اور پھر نصاب شہادت کے پورے ہونے کی بات ہے اگر مردوں سے یہ نصاب پورا نہیں ہوتا ہے تو پھر دو عورتوں سے اس نصاب کو پورا کیا گیا ہے پھر اس کی وجہ بھی بتلائی گئی ہے کہ دو عورتیں ایک مرد کے مساوی کیوں ہیں اس میں عورت کی تخلیقی کمزوری کیطرف اشارہ بھی کیا گیا ہے جس کی پوری تفصیل بخاری و مسلم کی اس حدیث میں موجود ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو ناقصات عقل قرار دیا تو عورتوں میں سے ایک ہوشیار عورت کھڑی ہوگئی اور اس نے اس کی وجہ پوچھی تو آنحضرت نے فرمایا کہ کیا دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر نہیں ہے عورتوں نے کہا ہاں اسی طرح ہے تو آنحضرت نے فرمایا کہ یہ ان کی عقل کی کمزوری کی دلیل ہے۔

خلاصہ یہ کہ غامدی صاحب نے قرآن مجید کی نص قطعی میں ردوبدل کیا احادیث مقدسہ کا انکار کیا تمام مفسرین سے الگ راستہ اختیار کیا تمام فقہاء کی فقہی اجتہادات کو غلط قرار دیا اور یہ سب کچھ دلیل کے بغیر کیا اس آیت کی انہوں نے جو کچھ تفسیر لکھی ہے اس میں انہوں نے کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کی آخر ان کے پاس کونسی بنیاد ہے جس کی بنیاد پر وہ اتنی بڑی جرأت کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت فرمائیں آمین۔

آخر میں عرض ہے کہ سورت بقرہ سے متعلق جناب غامدی صاحب کی انتیس ۲۹ بڑی غلطیوں کو میں نے اب تک واضح کر دیا ہے ان کے ترجمے کی غلطیوں کو میں واضح نہ کر سکا وہ الگ ایک بڑی

تبصرہ:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ غامدی کون ہے اور اس کے ''نزدیک'' کیا ہے جو لکھتا ہے کہ ''ہمارے نزدیک'' بھائی غامدی صاحب آپ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ آپ کی الگ فقہ ہو اور آپ کی تمام امت کے برعکس کوئی قابل احترام رائے ہو علماء اور فقہاء کی تفسیر و تحقیق کی اتباع کرو اس پر چلو بھلائی اسی میں ہے کیونکہ فقہاء کرام کی تحقیق قرآن وحدیث کے عین مطابق ہے غلطی آپ کی ہے فقہاء کو غلط نہ کہو شاعر نے کہا

چوں بشنوی سخنِ اہل دل مگو کہ خطا است

سخن شناس نۂ دلبرا خطاء ایں جا است

یعنی جب اہل اللہ علماء وفقہاء کی بات سنو تو یہ نہ کہو کہ یہ غلط ہے میرے پیارے بزرگوں کی بات نہ سمجھنا ہی آپ کی بڑی غلطی ہے، غامدی صاحب نے یہاں آیت میں یہ تاویل کی ہے کہ اس شہادت کا تعلق دستاویزی شہادت سے ہے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ دستاویزی شہادت ہو یا واقعاتی شہادت کی آپ کی منطق ہو آخرکار مقدمہ تو عدالت ہی کے پاس جائے گا وہ وہاں جانچ پڑتال کرے گی کہ نصاب شہادت قرآن وحدیث کے مطابق مکمل ہے یا مکمل نہیں ہے جب معاملہ ایسا ہے تو غامدی صاحب الگ الگ شقیں بنانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے اور اگر چہ مگر چہ اور ایں چنیں اور آں چناں سے کام کیوں لے رہا ہے غامدی صاحب دوسری تاویل کر کے لکھتے ہیں کہ آیت کے موقع ومحل اور اسلوب بیان میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اسے قانون وعدالت سے متعلق قرار دیا جائے اس میں عدالت کو مخاطب کر کے یہ بات نہیں کہی گئی کہ اس طرح کا کوئی مقدمہ اگر پیش کیا جائے تو مدعی سے اس نصاب کے مطابق گواہ طلب کرو۔

(برہان ص:۳۰)

کام ہے اور ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں الگ ایک داستان ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑی محنت کا متقاضی ہے جاوید غامدی صاحب نے اپنی تفسیر میں تورات وانجیل اور یہود ونصاریٰ کے صحیفوں کا اچھا خاصا حصہ اپنی تفسیر میں موقع بموقع نقل کیا ہے یا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن سے وافر مقدار میں عبارات نقل کی ہیں، غامدی صاحب کی اپنی تفسیر ایک مبہم کلام ہے جس کو پڑھنے سے نہیں لگتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم کتاب قرآن مجید کی تفسیر ہے ہاں جہاں غامدی صاحب غلط راستہ اختیار کرتے ہیں تو وہاں بڑا واضح بیان کرتے ہیں اپنی تفسیر میں غامدی صاحب نے احادیث کے نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے اور مفسرین کی تفاسیر کی طرف بھی التفات نہیں کیا ہے اس وجہ سے بھی ان کی تفسیر ایک بے معنی تفسیر ہو کر رہ گئی ہے۔ اب سورۃ بقرہ کے بعد سورت آل عمران کی تفسیر اور اس میں غلطیاں ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ آل عمران

جناب غامدی صاحب نے سورت بقرہ کی تفسیر میں موٹی موٹی انتیس غلطیاں کی ہیں جس کی تفصیل میں نے سورت بقرہ میں لکھدی اب سورت آل عمران شروع ہو رہی ہے دیکھئے کہ غامدی صاحب اس میں کتنی غلطیاں کریں گے۔

جاوید احمد غامدی کی غلطی نمبر ۳۰

''الــم'' آل عمران کی آیت نمبر ا کی غامدی نے یہ ترجمہ کیا ہے یہ سورت الف لام میم ہے جاوید غامدی نے یہاں یہ غلطی کی ہے کہ انہوں نے ان حروف مقطعات کا ترجمہ کیا ہے حالانکہ یہ حروف مقطعات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان راز ہے امت محمدیہ میں کسی نے اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے سلف صالحین کا مسلک یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ''اللــہ أعلــم بـمـراده

بــــذالک ''یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان حروف کے مطلب کو جانتے ہیں ہمارا اس پر ایمان ہے بعض متأخرین مفسرین نے ان کے احتمالی مطالب کو بیان کیا ہے لیکن سب نے اعتراف کیا ہے کہ یہ ان حروف کے تاویلی معنی ہیں یقینی معانی نہیں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب نے ان حروف کو یقینی معنی کیسے دیے ہیں اور یہ ترجمہ کیسے کیا ہے کہ یہ سورت الٓـم ہے دوسرا سوال یہ ہے کہ الٓــــم کے حروف چند دیگر سورتوں کی ابتداء میں بھی آئے ہیں مثلاً سورت بقرہ سورت آل عمران سورت روم سورت سجدہ سورت عنکبوت سورت لقمان سب کی ابتدامیں الٓـم کے حروف ہیں اگر یہ سورت کا نام ہے تو یہ کیسا نام ہے کہ سورت بقرہ کا نام بھی سورت الف لام میم ہے سورت آل عمران کا نام بھی سورت الف لام میم ہے سورت عنکبوت اور سورت روم کا نام بھی سورت الف لام میم ہے سورت سجدہ کا نام بھی سورت الف لام میم ہے سورت لقمان کا نام بھی سورت الف لام میم ہے۔ جمہور کا راستہ چھوڑ کر غامدی صاحب نے قرآن کے ساتھ یہ کیا کھیل بنا رکھا ہے؟ ادھر غامدی کے استاذ امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کا ترجمہ یہ ہے ''یہ الف لام میم ہے'' وہ مبتدا کو محذوف مان کر کہتے ہیں کہ یہ الف لام میم ہے۔ سوال یہ ہے کہ الف لام میم تو نظر آرہے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے عظیم کلام کا فائدہ کیا ہوا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ الف لام میم ہے اس سے قبل سورت بقرہ کی ابتدامیں امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید غامدی صاحب دونوں کی تفاسیر میں اس لفظ پر بھرپور کلام ہو چکا ہے وہاں بھی ملاحظہ فرمائیں یہاں غامدی صاحب نے کچھ مزید کلام بھی پیش کیا ہے لکھتے ہیں کہ سورت بقرہ کی طرح اس سورت کا نام بھی الف لام میم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ دونوں سورتیں توام (یعنی جڑواں بھائی) ہیں اس نام کے معنی کیا ہیں اس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورت بقرہ کی آیت نمبر ا کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب کا یہ عجیب کلام ہے جب دوسورتوں کا مضمون قریب قریب ایک ہوتو کیا ان دونوں کا نام بھی ایک ہو جائے گا؟ پھر تو قرآن میں حوامیم سبعہ کے مضامین قریب قریب ایک جیسے ہیں پھر ان سات سورتوں کا نام بھی ایک ہونا چاہیے۔ غامدی صاحب کی یہ منطق تو سمجھ سے بالاتر ہے پھر ان سے پوچھا جائے کہ اگر ان سورتوں کا نام الف لام میم ہے تو پھر غامدی صاحب اپنی تفسیر میں نمایاں طور پر ان کو سورت بقرہ سورت آل عمران سورت روم سورت سجدہ اور سورت لقمان کیوں کہتے ہیں؟ جدت پسندی اور علیحدگی پسندی کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے سورت بقرہ کی ابتدا میں تفصیل کے ساتھ اس پر کلام ہو چکا ہے امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید احمد غامدی صاحب دونوں کی غلطی ایک جیسی ہے اور دونوں کی تفسیر نا قابل اعتماد ہے۔

جاوید احمد کی غلطی نمبر ۳۱

﴿هُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْکِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾(آل عمران :۷)

جاوید غامدی صاحب اس آیت کی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں اس سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت یا نقمت کا بیان تمثیل اور تشبیہ کے انداز میں ہوا ہے (البیان ص:۳۱۸)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے متشابہات کو مشابہات کے مفہوم میں سمجھ لیا ہے متشابہات کے بارے میں یہ ان کی طرف سے پہلی غلطی ہے کیونکہ متشابہات میں التباس اور کئی احتمالات ہوتے ہیں اور مشابہات میں مماثلت اور موافقت ہوتی ہے متشابہات میں غامدی صاحب نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ انہوں نے آخرت کے مغیبات اور آنکھوں سے اوجھل اشیاء کو متشابہات کہدیا ہے حالانکہ

مغیبات کا متشابہات سے کوئی نسبت اور تعلق نہیں ہے اصل میں جاوید غامدی صاحب اور امین احسن اصلاحی صاحب اور ان کے استاد حمید الدین فراہی صاحب کا یہ مشترکہ نظریہ ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کا معنی ومطلب کسی پر پوشیدہ ہو۔ یہ کلام الٰہی ایسا ہے جو ہر ایک پر واضح ہے یہ بیان ہے یہ فرقان ہے یہ میزان ہے لہٰذا اس میں کوئی ایسا جملہ نہیں ہے جس کا مطلب ہر ایک پر بالکل واضح نہ ہو۔ ان حضرات نے جب دیکھا کہ حروف مقطعات کے معنی پوشیدہ ہیں نہ نفسِ معنی معلوم ہے اور نہ معنی مراد معلوم ہے اسی طرح متشابہات کی دوسری قسم ید اللہ، وجہ اللہ، ساق اللہ، وجاء ربک وغیرہ کے معنی مراد پوشیدہ ہیں اگرچہ نفس معنی واضح ہیں اس صورت حال سے یہ حضرات پریشان ہو گئے تو انہوں نے متشابہات کی دونوں قسموں کا انکار کر دیا اور متشابہات کو معنی ومطالب پہنانے شروع کر دیئے تو حروف مقطعات کے معنی بھی کر دیئے اور دوسری قسم کے متشابہات کو بھی واضح کرنا شروع کر دیا تو عجیب عجیب تاویلات شروع کر دیں جس سے متشابہات کا انکار نکل آیا میں نے جناب امین احسن اصلاحی کے شاذ نظریات میں سے سورت آل عمران کی آیت نمبر ۷ کے تحت شاذ نظریہ نمبر ۱۸ میں اس پر بھرپور کلام کیا ہے اس پر ایک نظر ضرور ڈال دینا چاہیے تا کہ پوری حقیقت سامنے آجائے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳۲

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران: ۲۸)

غامدی صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے ''ایمان والے اب مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ غامدی صاحب نے اس آیت کے ترجمہ میں الفاظ کا خیال نہیں رکھا ہے ''اب'' کا لفظ آخر کس لفظ کا ترجمہ ہے نیز اس سے قرآن کے الفاظ کے عموم کو اور اس کے مفہوم کو وقت حاضر کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے جس سے پوری آیت کا مقصد بدل گیا ہے۔ شیخ الہند محمود حسنؒ نے اس طرح ترجمہ کیا ہے: نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر۔ جاوید غامدی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں بھی غلطی کی ہے اور اس آیت میں مخلص مسلمانوں کو مشکوک منافقین قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ

اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ''یہ ان مسلمانوں کے لیے تنبیہ ہے جو اپنے ایمان کے تقاضوں کو سمجھنے میں ابھی پوری طرح یکسو نہیں تھے اور اس مرحلے پر بھی (یکسو نہیں تھے) جبکہ یہود و نصاریٰ کے لیے اللہ کا فیصلہ صادر ہونے والا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ان کی طرف میلان رکھتے تھے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں میں ان کے آلہ کار بن جاتے تھے (البیان ج۱ص:۳۳۷)

تبصرہ:

اس آیت کی تفسیر میں جناب غامدی صاحب نے مخلص صحابہ کرام کو منافقین کے زمرہ میں داخل کر کے فحش غلطی کی ہے یہاں قرآن کے الفاظ میں کوئی اشارہ یا قرینہ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ اس سے کوئی خاص منافق مسلمان مراد ہیں عام مفسرین نے آیت کو عام مانا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مخلص مسلمان مراد ہیں۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ''اس آیت میں مسلمانوں کو کافروں سے قطع تعلق کا حکم دیا جا رہا ہے پہلے بیان فرمایا کہ مالک الملک معزّ ومذل اور قادر مطلق صرف اللہ ہی ہے اس لیے اسی پر بھروسہ رکھو اور کافروں کی پرواہ نہ کرو (جواہر القرآن ج۱ص:۱۴۹) تفسیر عثمانی اور ابن کثیر اور روح المعانی سب نے اس آیت کو مخلص مسلمانوں سے متعلق مانا ہے قرآن عظیم کی اصطلاح اور اسلوب کلام اور روئے سخن بھی بتاتا ہے کہ اس میں خطاب مخلص مسلمانوں کو ہے علماء اصول کا ضابطہ بھی ہے کہ: ''اَلْعِبْرَةُ لِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ لَا لِخُصُوْصِ الْوَاقِعَةِ'' لہٰذا یہاں ''اَلْکَافِرِیْنَ'' سے بھی مطلق کفار مراد لیے جائیں گے اگرچہ واقعہ کا تعلق خاص یہود کے ساتھ ہو۔ بہرحال اس آیت میں یہ غلطی اس سے ذرا زیادہ واضح انداز میں امین احسن اصلاحی نے کی ہے میں نے امین احسن اصلاحی کے شاذ نظریہ ۱۹ کے تحت کافی تفصیل سے لکھا ہے اس کو ضرور دیکھنا چاہیے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳۳:

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ (آل عمران:۳۷)

جاوید غامدی کا ترجمہ: جب زکریا محراب میں اس کے پاس جاتا تو وہاں اللہ کی عنایت دیکھتا تھا'' غامدی

صاحب نے اپنے غلط مطلب تک پہنچنے کے لیے غلط ترجمہ کیا ہے اور رزق کا ترجمہ عنایت کے ساتھ کیا ہے اس کی تفسیر میں غامدی صاحب لکھتے ہیں اصل میں رزقاً کے الفاظ آئے ہیں ان میں رزق سے مراد وہ حکمت و معرفت ہے جو اللہ کی طرف سے کسی شخص کو عطا ہوتی ہے۔ (البیان ج ا ص:۳۴۴)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے آیت میں رزق کا ترجمہ ''عنایت'' کے الفاظ سے کیا ہے اور تفسیر میں لکھا ہے کہ رزق سے مراد حکمت و معرفت ہے دونوں جگہ غامدی نے غلطی کی ہے شیخ الہند نے آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے، جس وقت آتے اس کے پاس زکریا حجرے میں پاتے اس کے پاس کچھ کھانا۔ جاوید غامدی صاحب نے ظاہر قرآن کے ظاہر الفاظ کو چھوڑ کر رزق سے حکمت اور معرفت لیا ہے یہ مطلب قرآن کے اسلوب کلام کے بھی منافی ہے اور ظاہر الفاظ کے بھی منافی ہے اور تمام مفسرین کی تفاسیر کے بھی منافی ہے غامدی اور ان کے استاد امین احسن اصلاحی وغیرہ پوری جماعت کی یہ کوشش رہتی ہے کہ قرآن سے کوئی معجزہ و کرامت اور مافوق الفطرت چیز اگر ثابت ہوتی ہے تو ممکن حد تک اس کو چھپایا جائے اور اس معجزاتی کراماتی کرشماتی عمل کو موڑ کر اس کی حقیقت کو مسخ کر دیا جائے اور اس کو مادی معنی پہنایا جائے یہاں بھی حضرت مریم کی کرامت کو غامدی صاحب نے چھپا کر اس کو ایک دوسرے مطلب میں ظاہر کر دیا ہے۔ امین احسن اصلاحی صاحب نے اس پر زیادہ تفصیل سے کلام کیا ہے اس کے شاذ نظریہ نمبر ۲۰ میں میں نے اس پر بھر پور کلام کیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔ حضرت سید یوسف بنوریؒ نے اس تاویل پر خوب تنقید کی ہے

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳۴

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ (آل عمران:۵۵)

غامدی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ''اس وقت جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا۔ اور اپنی طرف اٹھالوں گا۔

شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ! میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف۔ جناب غامدی صاحب نے ترجمہ میں کہا ہے کہ اے عیسیٰ میں نے فیصلہ کیا ہے یہ ترجمہ غلط ہے ''میں نے فیصلہ کیا ہے'' قرآن عظیم کے کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ ترجمہ میں غامدی صاحب نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ تجھے وفات دوں گا۔ اسی غلط ترجمہ کے پیش نظر غامدی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

''یعنی روح قبض کر کے تیرا جسم بھی اپنی طرف اٹھالوں گا تا کہ یہ ظالم اس کی توہین نہ کرسکیں مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے اور رسولوں کے بارے میں یہ قانون اللہ کے قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ ان کی حفاظت کرتا ہے اور جب تک ان کا مشن پورا نہ ہو جائے ان کے دشمن ہرگز ان کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان کی توہین وتذلیل بھی اللہ تعالیٰ گوارا نہیں کرتے اور جو لوگ اس کے درپے ہوں انہیں ایک خاص حد تک مدت دینے کے بعد اپنے رسولوں کو لازماً ان کی دست بُرد سے محفوظ کردیتے ہیں۔ (البیان ص:۳۶۰)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے یہاں اس آیت میں دانستہ طور پر اپنے مطلب کے لیے ترجمہ غلط کیا ہے اور کہا ہے کہ میں تجھے وفات دوں گا ''مُتَوَفِّیکَ'' وفی یفی سے ہے پورا پورا لینے کے معنی میں آتا ہے تو اس کا اصلی معنی اور مصداق پورا لینا ہے موت کے لیے یہ مادہ ثانوی طور پر استعمال ہوتا ہے غامدی صاحب کا عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ ہے کہ وہ وفات پاچکے ہیں اور زندہ آسمانوں پر نہیں اٹھائے گئے ہیں اس لیے اس نے موت کا ترجمہ کیا ہے، شیخ الہند کا ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے کا اسہل نقل ہے جو برصغیر کے تراجم میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے انہوں نے ''لے لوں گا تجھ کو'' کا ترجمہ کیا ہے۔ غامدی کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ حضرت عیسیٰ کی روح قبض کرلی گئی اور پھر ان کے جسم کو آسمانوں پر اٹھا لیا گیا سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب کو کہاں سے معلوم ہوا کہ جسم کو آسمانوں پر اٹھالیا گیا ان کے پاس

دلیل کہاں ہے؟ غامدی صاحب کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے جسم کی توہین کرنے کا خطرہ تھا اور رسول کے جسم کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس گھر میں حضرت عیسیٰ محصور ہو گئے تھے اور یہود نے ان کے شبہ میں اپنے آدمی کو مارا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمانوں پر اٹھالیا تو وہاں روح کہاں قبض ہوئی؟ اگر یہود نے اس موقع پر حضرت عیسیٰ کو مار ڈالا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض فرمالی تو غامدی کا وہ بنیادی دعویٰ کہاں چلا گیا کہ کوئی رسول قتل نہیں ہوا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں اور غامدی کے بیان کے مطابق وہ قتل ہو گئے روح قبض کر لی گئی اور جسم آسمانوں پر اٹھالیا گیا غامدی صاحب کا یہ متضاد دعویٰ اور کئی سوالات کو جنم لینے والا یہ بیان دراصل اس عمل کی سزا ہے کہ غامدی صاحب احادیث کو نظر انداز کر دیتے ہیں مفسرین کی تفاسیر کو مسترد کر دیتے ہیں اور اپنا اختراعی مفروضہ پیش کر کے الجھن پیدا کرتے ہیں واضح شاہراہ کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں میں چل پڑتے ہیں۔

غامدی صاحب کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ کوئی رسول قتل نہیں ہوا ان سے پوچھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کے احوال آنحضرت پر بیان فرمائے ہیں اور بعض کے احوال بیان نہیں فرمائے جس طرح یہ آیت ہے ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِکَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْکَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْکَ﴾ (سورۃ مومن: ۷۸) تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض رسولوں کے احوال معلوم نہیں ہیں تو غامدی صاحب کو کہاں سے پتہ چلا کہ کوئی رسول قتل نہیں ہوا؟ غامدی بتائیں کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر کی یہودیہ عورت نے زہر کھلا کر شہید نہیں کیا؟ فوری شہادت نہ سہی لیکن یہی زہر وفات کے وقت دوبارہ ظاہر ہو گیا اور اس کے نتیجے میں آنحضرت شہید ہو گئے احادیث کی تمام کتابوں میں اس کا مستند قصہ موجود ہے نیز قرآن مجید کی تقریباً چار آیات اس پر گواہ ہیں کہ نبیوں کی طرح رسول بھی قتل کر دیئے گئے ہیں چنانچہ سورت آل عمران کی آیت ۱۴۴ میں ہے ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ﴾ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بس اللہ کے ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے

ہیں پس اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے؟

اس آیت میں آنحضرت کے قتل ہونے کا امکان بیان کیا گیا ہے اگر یہ ناممکن ہوتا تو اس طرح بیان نہ ہوتا دوسری آیت سورت بقرہ کی آیت ہے اس کا ایک ٹکڑا اس طرح ہے ﴿أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَاتَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾

ترجمہ ''یعنی ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا''۔

اس میں مستقبل کی خبر بھی ہے کہ یہود رسولوں کو قتل کریں گے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود نے ایک خاص انداز سے شہید کر دیا سورت آل عمران کی آیت ۱۸۳ میں بالکل تصریح ہے کہ یہود نے رسولوں کو قتل کیا ہے چنانچہ اس آیت کا آخری حصہ اس طرح ہے ﴿قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾

یعنی اگر تم سچے ہو تو بتا دو تم نے ان رسولوں کو جو تمہاری شرائط پر پورے اتر کر آئے تھے پھر تم نے ان کو کیوں قتل کیا۔

بہر حال جاوید احمد غامدی صاحب نے جمہور مفسرین کا راستہ چھوڑ دیا تو اب الگ تھلگ ٹامک ٹوئیاں مار کر قلابازیاں کھا رہے ہیں انہوں نے حضرت عیسیٰ کی وفات کی بات کر کے دسیوں صحیح احادیث کا دیدہ دلیری سے انکار کر دیا اور دجال کے قتل حضرت عیسیٰ کی دسیوں جنگوں کا انکار کر دیا۔ پھر جو تفسیر لکھدی وہ محض تفسیر بالرائے ہے جو الگ بڑا جرم ہے تمام مفسرین ومحدثین وعلماء وفقہاء ایک طرف اور غامدی صاحب ایک طرف کھڑے ہیں پھر تعجب اس پر کہ بالکل بلادلیل کھڑے ہیں۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳۵:

﴿وَاِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ﴾ (آل عمران آیت:۸۱)

جاوید غامدی صاحب نے ترجمہ اس طرح کیا ہے (اور انہیں یاد دلاؤ) جب اللہ نے نبیوں کے بارے میں ان سے عہد لیا۔ غامدی صاحب کا یہ ترجمہ غلط ہے انہوں نے اپنے مطلب کے لیے یہ ترجمہ کیا

ہے ان کا مطلب اور مقصد یہ ہے کہ یہ عہد و میثاق بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا کہ جب تمہارے پاس کوئی نبی آجائے اور وہ حق پر ہو تو تم ان کی مدد و نصرت کرو گے اور اس پر ایمان لاؤ گے یہ بات تو اپنی جگہ صحیح ہے کہ بنی اسرائیل سے یہی مطالبہ تھا کہ تم رسولوں کی تصدیق کرو لیکن یہاں آیت میں یہ مطالبہ اور یہ میثاق خود نبیوں سے لیا گیا تھا۔ سارے مفسرین یہی لکھ رہے ہیں کہ یہ میثاق انبیاء کرام سے لیا گیا تھا اب معلوم نہیں کہ امین احسن اصلاحی اور غامدی صاحب کو کیا فکر پڑی ہے کہ مفسرین کی تفسیر سے الگ راستہ اختیار کر رہے ہیں غامدی صاحب نے یہاں تفسیر تو نہیں لکھی ہے لیکن آیات کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اسی تفسیر کی روشنی میں ہے جو امین احسن اصلاحی کی تفسیر ہے جس کا تذکرہ میں نے ان کے شاذ نظریہ ۲۱ کے تحت کیا ہے وہاں میں نے ابن کثیر وغیرہ مفسرین کی تفاسیر کے حوالے نقل کر دیئے ہیں اور سورت احزاب کی آیت ۸ کو نقل کیا ہے جس میں بالکل واضح مذکور ہے کہ یہ عہد و میثاق انبیاء کرام سے لیا گیا تھا چنانچہ وہ آیت اس طرح ہے ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ﴾ الخ شیخ الہند نے یہ ترجمہ کیا ہے اور جب لیا ہم نے نبیوں سے ان کا قرار اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور عیسیٰ سے جو بیٹا ہے مریم کا اور لیا ہم نے ان (نبیوں) سے گاڑھا قرار۔ اس آیت کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ یوں لکھتے ہیں یعنی یہ قول و قرار کہ ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کریگا اور دین کے قائم کرنے اور حق تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا سورت آل عمران میں اس میثاق کا ذکر ہو چکا ہے۔ (تفسیر عثمانی ص:۵۵۴)

سورت آل عمران میں آیت ۸۲ کے تحت حضرت عثمانیؒ نے نہایت تفصیل سے نبیوں کے اس عہد و میثاق کا ذکر کیا ہے خلاصہ یہ کہ جاوید غامدی نے یہاں غلط ترجمہ کیا ہے جو یہ لکھا ہے کہ جب اللہ نے نبیوں کے بارے میں ان سے (بنی اسرائیل سے) عہد لیا، یہ ترجمہ امین احسن اصلاحی کی غلط تفسیر کے پیش نظر غامدی صاحب نے یہاں کیا ہے البتہ کوئی تفسیر نہیں لکھی ہے۔ کسی دوسرے مقام میں اپنے امام کی طرح تفسیر لکھی ہوگی۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳۶

﴿فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ﴾ (آل عمران:۹۷)

غامدی صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے، اس میں کھلی نشانیاں ہیں ابراہیم کا مسکن ہے۔ غامدی کا یہ ترجمہ ان کے اپنے مطلب کے لیے ہے جو غلط ہے۔ شیخ الہند نے یہ ترجمہ کیا ہے اس میں نشانیاں ہیں ظاہر، جیسے مقام ابراہیم۔

غامدی صاحب نے جو ترجمہ کیا ہے وہ انہوں نے اپنے خاص مطلب کے لیے کیا ہے ان کا عقیدہ ہے کہ مشہور مقام ابراہیم کی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ مقام ابراہیم سے مراد مسکن ابراہیم ہے جہاں حضرت ابراہیم ٹھہرے تھے اور وہ کعبہ اور حرم شریف ہے چنانچہ غامدی صاحب مقام ابراہیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں یعنی اس بات کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں کہ سیدنا ابراہیم کا بنایا ہوا گھر یہی ہے اس لیے قبلہ بھی اسی کو ہونا چاہیے اس کے بعد غامدی نے ان نشانیوں میں سے تین چیزوں کی طرف خاص اشارہ کیا ہے ایک یہ کہ یہ مقام ابراہیم ہے الخ (البیان ص:۳۸۳)

تبصرہ:

اس سے پہلے امین احسن اصلاحی صاحب کے شاذ نظریہ نمبر۱۲ میں مقام ابراہیم کی پوری بحث گزر چکی ہے وہاں امین احسن اصلاحی صاحب نے مقام ابراہیم کے پتھر سے متعلق تاریخی اور حدیثی روایات اور تمام حقائق کو غیر صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ مقام ابراہیم سے مراد مسکن ابراہیم ہے یہاں جاوید غامدی صاحب نے بھی ترجمہ میں یہی عقیدہ ظاہر کیا ہے جو تمام مفسرین کے برعکس ایک الگ نظریہ ہے اور اسلوب کلام اور اسلوب قرآن کا بالکل مخالف ہے کیونکہ فیہ آیات بینات کی ضمیر بیت اللہ کی طرف راجع ہے اور یہی بیت اللہ جو مکہ میں اول بیت ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے بنایا ہے اور اس میں ابراہیم علیہ السلام کے ثبوت کی نشانیاں ہیں ان میں ایک مقام ابراہیم ہے اور وہ وہ پتھر ہے جس پر آپ نے کھڑے ہو کر بیت اللہ کو تعمیر کیا تھا اور اس پتھر میں حضرت ابراہیم کے قدموں کا نشان ہے۔ علامہ ابن

کثیر مقام ابراہیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں:ای فمنهن مقام ابراهيم آيات بينات میں سے ایک مقام ابراہیم ہے علامہ ابن کثیرؒ نے اس پتھر کی پوری تفصیل بیان فرمائی ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی پھر ابن کثیرؒ نے ابو طالب کے مشہور قصیدہ کا ایک شعر نقل کیا ہے

وموطنى ابراهيم فى الصخر رطبة على قدميه حافيا غير ناعل

ترجمہ: اور ابراہیم علیہ السلام کے ننگے پاؤں کے رکھنے کا نشان مضبوط پتھر پر اب بھی تازہ بتازہ موجود ہے۔ مفسرین میں سے علامہ ابن کثیر نے کئی مفسرین کے اقوال نقل کئے ہیں سارے مشہور اقوال میں یہ تصریح ہے کہ مقام ابراہیم سے وہی پتھر مراد ہے جس پہ کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کو تعمیر فرمایا تھا یہ پتھر ایک خود کار سیڑھی کا کام دے رہا تھا شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے اور مقام ابراہیم سے وہ پتھر مراد ہے جس پر کھڑے ہو کر انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی (جواہر القرآن ص:۱۶۷)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے مقام ابراہیم کے متعلق بہت عمدہ تفسیر لکھی ہے فرماتے ہیں اس کے پاس (یعنی بیت اللہ کے پاس) مقام ابراہیم کی موجودگی پتہ دے رہی ہے کہ یہاں ابراہیم کے قدم آئے ہیں اور اس کی تاریخ جو تمام عرب کے نزدیک بلانکیر مسلّم چلی آرہی ہے بتلاتی ہے کہ یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کیا تھا اور خدا کی قدرت سے اس پتھر میں ابراہیم علیہ السلام کے قدم کا نشان پڑ گیا تھا جو آج تک محفوظ چلا آتا ہے۔ (تفسیر عثمانی:۸۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورت النساء

جاوید غامدی کی غلطی ۳۷

﴿يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً﴾ (سورۃ النساء: آیت ۱)

شیخ الہند نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں (ترجمہ شیخ الہند)

شیخ الہندؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے اول تو حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا پھر ان دونوں سے تمام مرد اور عورتوں کو پیدا کیا۔ (تفسیر عثمانی: ۹۸)

جناب غامدی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیں۔ جاوید غامدی صاحب نے اپنے نظریہ کے تحت آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے اور کہا کہ اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس ترجمہ میں غامدی نے یہ تأثر دیا اور یہ حقیقت ظاہر کیا کہ حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام کے جسم سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ آدم علیہ السلا[illegible] یعنی جنس انسان کی طرح ایک انسان بنایا گیا اور حو[illegible] آدم علیہ السلام کا جوڑا مقرر کیا گیا گویا تخلیق میں حضرت آدم اور حضرت حوا کی تخلیق ایک جیسے ہوئی چنانچہ غامدی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں اس مفہوم کے لیے اصل میں ''خلق منها زوجها'' کے الفاظ آئے ہیں انہیں سورت النحل کی آیت ۷۲ ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا﴾ کی روشنی میں دیکھئے تو ان کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے (یعنی جو ترجمہ غامدی نے کیا ہے) اسے اس میں سے یا اس کے اندر سے کے معنی میں لینے کی ضرورت نہیں ہے (البیان ج ۱ ص: ۴۴۵)

غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم ہی کی جنس سے بنایا ہے اس وجہ سے عورت کوئی ذلیل، حقیر، فروتر اور فطری گنہگار مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ بھی شرف انسانیت میں برابر کی شریک ہے۔ (البیان ص: ۴۴۶)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے قلم کو پیچ وتاب دے کر اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت حوا مستقل تخلیق کے ساتھ پیدا کی گئی ہے یہ حضرت آدم کے جسم سے پیدا نہیں ہوئی ہے غامدی کی طرح دیگر روشن خیال لوگوں کا خیال بھی اسی طرح ہے لیکن اس سے ایک نقصان یہ ہے کہ قرآن عظیم کے ظاہری الفاظ اور حقیقت کو چھوڑ کر غیر ظاہر کی طرف جانا پڑے گا کیونکہ ''خلق منها زوجها'' بالکل واضح ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ انہیں کے جسم سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے غامدی صاحب نے اس کو سورت نحل کی آیت پر قیاس کیا وہ آیت یہ ہے

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا﴾ (آیت:۷۲)

سورت نحل کی آیت کے الفاظ کی ترکیب وترتیب اور اسلوب بالکل الگ تھلگ ہے اس پر اس آیت کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے وہاں جَعَلَ کا لفظ ہے یہاں خَلَق کا لفظ ہے وہاں مِنْ اَنْفُسِكُمْ کا کلمہ ہے یہاں مِنْهَا کا لفظ ہے وہاں اَزْوَاجًا جمع کا صیغہ ہے یہاں زَوْجَهَا ہے پھر ضمیر اور اس کا مرجع یہاں ہے وہاں نہیں ہے لہٰذا مفسرین نے سورت نحل میں مِنْ اَنْفُسِكُمْ سے مِنْ جِنْسِكُمْ مراد لیا ہے یعنی نوع انسان سے تم کو جوڑے دیئے چنانچہ شیخ الہند سورت نحل کی آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں اور اللہ نے پیدا کیں تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے عورتیں، وہاں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں یوں لکھا ہے: یعنی نوع انسان ہی سے تمہارا جوڑا پیدا کیا تاکہ الفت وموانست قائم رہے (تفسیر عثمانی ص:۳۶۳)

بہرحال جاوید غامدی صاحب نے قلم کی نوک سے یکسر دسیوں احادیث کا انکار کیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرمایا کہ عورت ذات ٹیڑھی کچی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ بخاری ومسلم کی صحیح احادیث کو غامدی نے چھوڑ دیا اور اپنے ایجاد بندہ کے پیچھے چل پڑا اور کہا کہ ترجمہ میں اس میں سے یا اس کے اندر سے حواء پیدا کی گئی کی طرف جانے کی ضرورت نہیں

ہے اوپر غامدی کی تفسیر پڑھ لو تو ان کی ذہنیت معلوم ہو جائے گی۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳۸

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ (نساء آیت:۲)

جو عورتیں ہیں ان میں سے جو تمہارے لیے موزوں ہوں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو (غامدی ترجمہ)

جناب غامدی صاحب نے اپنے مطلب کے تحت یہ ترجمہ کیا ہے ''جو تمہارے لیے موزون ہوں'' اس ترجمہ سے غامدی صاحب یہ مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں تعدد ازواج کا ذکر اور اجازت کوئی قانون وقاعدہ نہیں ہے بلکہ یہ یتیم بچیوں کے مصالح اور خدمت کے پیش نظر عرب معاشرہ میں جاری ایک رواج سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب ہے۔ چنانچہ غامدی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں یہ آیت اصلاً تعدد ازواج سے متعلق کوئی حکم بیان کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئی بلکہ یتیموں کی مصلحت کے پیش نظر تعدد ازواج کے اس رواج سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب کے لیے نازل ہوئی ہے جو عرب میں پہلے سے عام تھا قرآن نے دوسرے مقامات پر صاف اشارہ کیا ہے کہ انسان کی تخلیق جس فطرت پر ہوئی ہے اس کی رُو سے خاندان کا ادارہ اپنی اصلی خوبیوں کے ساتھ ایک ہی مرد وعورت میں رشتہ نکاح سے قائم ہوتا ہے چنانچہ جگہ جگہ بیان ہوا ہے کہ انسانیت کی ابتداء سیدنا آدم سے ہوئی ہے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی بیوی پیدا کی تھی۔ (البیان ج ا ص:۴۴۸)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے یہاں اپنی تفسیر کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی تعدد ازواج کی حوصلہ شکنی پر کلام کیا ہے چنانچہ جناب غامدی صاحب نے اپنے منشور کے ص:۱۲ پر لکھا ہے کہ تعدد ازواج کی مطلق اباحت کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ غامدی صاحب نے یہاں یہ غلطی کی ہے کہ تعدد ازواج کو یتیموں [illegible] کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ یہ نئی عورتیں یتیموں کی خدمت کے لیے اکٹھی

ہو جائیں گی اور یتیموں کی خدمت کریں گی۔ یہ تفسیر غلط ہے تمام مفسرین نے یہ تفسیر کی ہے جو حضرت عائشہ سے منقول ہے وہ فرماتی ہیں کہ لوگ اپنی یتیم بچیوں سے مال و جمال کی وجہ سے نکاح کرنا چاہتے تھے لیکن ان کو پورا مہر نہیں دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم ان یتیم بچیوں میں انصاف نہیں کر سکتے ہو یعنی پورا مہر نہیں دیتے ہو تو پھر ان سے نکاح نہ کرو دوسری عورتیں بہت ہیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو۔ ابن کثیر رحمہ اللہ اس طرح لکھتے ہیں:

اَیْ اِذَا کَانَ تَحْتَ حجر اَحَدکُم یَتِیمَة وَخَاف اَلَّا یُعْطِیُھَا مَھْر مِثْلِھَا فَلْیَعْدِلْ اِلٰی مَا سِوَاھَا مِنَ النِّسَآءِ فَاِنَّھُنَّ کَثِیْر وَلَمْ یُضیق اللّٰهِ عَلَیْهِ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص:۴۴۹)

یعنی جب تم میں سے کسی کی پرورش میں کوئی یتیم بچی ہو اور سرپرست کو خوف ہو کہ وہ اس کو پورا مہر نہیں دے گا تو اس کو چاہیے کہ اس یتیم کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کی طرف چلا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بارے میں ان پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس طرح کئی عبارات اور روایات حضرت عائشہ سے نقل فرمائی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی یتیم لڑکی خوبصورت بھی ہوتی تھی اس کے پاس مال بھی ہوتا تھا تو ولی سرپرست اس کے ساتھ نکاح تو خوشی سے کرتا تھا لیکن مہر بہت کم دیتا تھا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب تم مہر دینے میں انصاف نہیں کر سکتے ہو تو ان کے ساتھ نکاح نہ کرو دوسری عورتیں بہت ہیں دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو، یتیم لڑکی کی دوسری صورت یہ ہوتی تھی کہ ولی سرپرست اس کے نکاح میں رغبت نہیں رکھتا تھا مگر ولی سرپرست یہ خیال کرتا تھا کہ اگر اس یتیم لڑکی سے کسی اور شخص نے نکاح کر لیا تو اس کا مال اس کے قبضے سے نکل کر دوسرے شخص کے پاس چلا جائے گا اس خوف سے اس غیر مرغوبہ لڑکی سے نکاح تو کر لیتا تھا مگر اس یتیمہ منکوحہ سے رغبت و محبت نہیں ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر یتیم لڑکی کے بارے میں انصاف نہیں کر سکتے ہو تو اس کے علاوہ لڑکیاں بہت ہیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو تفسیر عثمانی میں شیخ الہند لکھتے ہیں کہ اس (بے انصافی) پر یہ آیت اتری۔ اور اولیاء کو ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اس بات کا ڈر ہے کہ تم یتیم لڑکیوں کی بابت انصاف نہ کر سکو گے اور ان کے مہر اور ان کے ساتھ حسن معاشرت میں تم

سے کوتاہی ہوگی تو تم ان سے نکاح مت کرو بلکہ اور عورتیں جو تم کو مرغوب ہوں ان سے ایک چھوڑ کر چار تک کی تم کو اجازت ہے قاعدہ شریعت کے مطابق ان سے نکاح کرو۔

شیخ الہند مزید لکھتے ہیں جاننا چاہیے کہ مسلمان آزاد کے لیے زیادہ سے زیادہ چار نکاح تک اور غلام کے لیے دو تک کی اجازت ہے اور حدیثوں میں اس کی تصریح ہے اور ائمہ دین کا بھی اس پر اجماع ہے اور تمام امت کے لیے یہی حکم ہے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور آپ کا امتیاز ہے کہ اس سے زیادہ کی اجازت ہے (تفسیر عثمانی ص:۹۹)

غامدی صاحب کے نزدیک یہ آیت تعدد ازواج کے لیے نازل نہیں ہوئی ہے یہ کتنا غلط دعویٰ ہے اور اسلام کے قواعد سے کتنا بڑا انحراف ہے اور کتنی کتنی احادیث کا انکار ہے اور قرآن کی کتنی بڑی تحریف ہے اور مفسرین سے الگ اپنی رائے کے مطابق کیسی تفسیر ہے یہ کتنا بڑا ظلم اور کتنی بڑی جرأت ہے غامدی صاحب اپنے اسی نظریہ کے تحت اپنے منشور کے ص ۱۲ اور دفعہ ۸ کے تحت لکھتے ہیں دوسری شادی کو لازمی طور پر ضرورت سے مشروط کیا جائے اور اس کے بارے میں مطلق اباحت کا جو تصور مسلمانوں میں موجود ہے اس کی حوصلہ شکنی کی جائے (منشور ۱۲)

اب غور کا مقام ہے قرآن مجید میں امر کا صیغہ ہے کہ دو تین تین چار چار پسند کی عورتوں سے شادی کرو افسوس ہے کہ اس کے مقابلے میں غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ اس کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں غامدی صاحب نے اپنے دعویٰ پر حضرت آدم علیہ السلام کے نکاح کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ حضرت آدم نے صرف حضرت حوا کے ساتھ نکاح کیا دوسرا نکاح نہیں کیا غامدی کو داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نظر نہیں آئے جنہوں نے سوسو کے قریب بیویوں کو رکھا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازواج ان کو نظر نہیں آیا کہ اتنا دور چلا گیا کہ حضرت آدم تک پہنچ گیا غامدی صاحب سے اگر پوچھا جائے کہ حضرت حواء سے پیدا شدہ لڑکیاں تو حضرت آدم علیہ السلام کی بیٹیاں یا پوتیاں یا نواسیاں تھیں ان سے نکاح کیسے ہوسکتا تھا؟ بہر حال غامدی صاحب لغو باتیں کرتا رہتا ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳۹

﴿وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ﴾ (سورۃ النساء:۱۵)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں ان پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو:

(ترجمہ غامدی) شیخ الہندؒ نے یہ ترجمہ کیا ہے اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ ان پر چار مرد اپنوں میں سے۔ جناب غامدی صاحب نے اپنے مطلب نکالنے کے لیے ترجمہ کیا ہے اور کہا ہے کہ تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کرتی ہیں'۔ غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ عورتیں قحبہ گر اور کسب گر عورتیں تھیں جن کا کام ہی یہی تھا اس لیے اس نے یوں ترجمہ کیا ہے ''اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں'' اس ترجمہ میں غامدی صاحب نے استمرار کا معنی پیدا کیا ہے حالانکہ شیخ الہندؒ نے یہ ترجمہ کیا ہے ''اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے''۔ شیخ الہند کے ترجمہ میں استمرار کا مفہوم نہیں ہے اور نہ قحبہ گر عورتوں کا اشارہ ہے۔

غامدی صاحب نے اپنے ترجمہ کے پیش نظر اس آیت کی تفسیر اس طرح لکھی ہے: یعنی اس بات کے گواہ کہ یہ فی الواقع زنا کی عادی قحبہ عورتیں ہیں سورت نور میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی یہ شرط اسی طرح برقرار رکھی ہے۔ (البیان ص:۴۶۵)

تبصرہ:

مندرجہ بالا آیت میں غامدی صاحب نے زنا کرنے والی عورتوں کو کسب گر کنجری اور قحبہ عورتیں قرار دیا ہے قرآن مجید میں جو حکم ہے وہ صرف زنا کرنے والی عورتوں کا مذکور ہے اس میں قحبہ کا مفہوم شامل کرنا غامدی صاحب کی غلطی بھی ہے اور ایک غلط سوچ کا نتیجہ بھی ہے وہ غلط سوچ یہ ہے کہ غامدی صاحب سورت نساء کی اس آیت کو سورت نور کی آیت کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ یہاں جو سزا مذکور ہے وہ تا حکم ثانی گھروں میں بند رکھنے کی سزا ہے پھر سورت نور کی آیت کی وجہ سے یہ آیت منسوخ ہوگئی اور سورت نور میں سو کوڑوں کی سزا کا حکم آ گیا

اور آنحضرت کی حدیث کی وجہ سے کنواری عورتوں کے لیے سو کوڑے مقرر ہوئے اور شادی شدہ عورتوں کے لیے رجم اور سنگساری کا حکم آ گیا چنانچہ تفسیر ابن تفسیر کثیر میں اس طرح مذکور ہے:

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: خُذُوْا عَنِّیْ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا اَلْبِکْرُ بِالْبِکْرِ جَلْدُ مِاَةٍ وَتَغْرِیْبُ عَامٍ وَالثَّیِّبُ بِالثَّیِّبِ جَلْدُ مِاَةٍ وَالرَّجْمُ (رواہ مسلم قال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح۔ تفسیر ابن کثیر ج۱ص:۴۶۲)

ترجمہ حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے لو مجھ سے لے لو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے راستہ بنا دیا اب اگر کنوار مرد اور کنواری عورت نے زنا کیا تو ان کی سزا سو کوڑے ہیں اور ایک سال کے لیے انتظامی طور پر جلاوطن کرنا ہے اور شادی شدہ عورت یا شادی شدہ مرد اگر زنا کرے تو ان کی سزا سو کوڑوں کے ساتھ ساتھ رجم کرنا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کے تحت اس کی تفسیر میں اس قسم کی کئی احادیث کو نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور ان کے شاگرد حضرت عکرمہ اور حضرت سعید بن جبیر اور اسی طرح حسن بصری اور عطا خراسانی اور ابو صالح اور قتادہ رحمہم اللہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

کَانَ الْحُکْمُ کَذٰلِکَ حَتّٰی اَنْزَلَ اللّٰهُ سُوْرَةَ النُّوْرِ فَنَسَخَهَا بِالْجَلْدِ وَالرَّجْمِ

(ابن کثیر ج۱ص:۴۶۲)

یعنی سورت نساء کی مذکورہ آیت کا حکم ابتدا میں اسی طرح تھا (کہ گھر میں بند رکھو) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورت نور کو اتارا اور اس آیت کے حکم کو کوڑوں یا رجم کے ذریعہ سے منسوخ قرار دیا۔ جناب غامدی صاحب نے سورت نساء کے اس حکم کو منسوخ نہیں مانا ہے اس لیے مبہم کلام کر کے سورت نور کا حوالہ دیا ہے حالانکہ صریح اور صحیح حدیث میں مذکور ہے کہ یہ آیت سورت نور کی آیت سے منسوخ ہوگئی اور اب کوڑے اور رجم کی سزا مقرر ہوگئی ہے غامدی صاحب اور ان کے اساتذہ اور تلامذہ کے ہاں رجم کی سزا اسلام میں نہیں ہے صرف کوڑے ہیں۔ اس لیے غلط سمت کی طرف پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۹

﴿اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا﴾ (نساء آیت:۱۵)

علامہ غامدی صورت نساء کی اس آیت کے تحت مزید لکھتے ہیں اس سے واضح ہے کہ یہ ایک عارضی حکم تھا چنانچہ اس میں جس راہ نکالنے کا ذکر ہے وہ بعد میں اس طرح نکلی کہ قحبہ ہونے کی وجہ سے ان عورتوں کو زنا اور فساد فی الارض دونوں کا مجرم قرار دیا گیا اور ان جرائم کی جو سزائیں سورت نور کی آیت ۲ اور سورت مائدہ کی آیت ۳۳ میں بیان ہوئی ہیں وہ بعض روایتوں کے مطابق ان پر نافذ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ (البیان ص:۴۶۵)

تبصرہ:

غامدی صاحب نے یہاں نہایت خفیہ طریقہ سے اپنی تفسیر میں اپنا مخصوص نظریہ لکھدیا ہے چنانچہ اس نے سب سے پہلے مذکورہ آیت کے حکم کو عارضی قرار دیا ہے اور اس کے بدلے میں سورت نور کی آیت ۲ کے حکم کو مستقل قرار دیا پھر مذکورہ آیت کی عورتوں کو کسب گر زنا کار اور قحبہ کہہ کر ان کو فساد فی الارض کا مجرم قرار دیا اب ان عورتوں نے بقول غامدی زنا کاری کے ساتھ فساد فی الارض یعنی قتل ڈکیتی وغیرہ کا جرم بھی کیا لہذا اب ان کو سورت مائدہ کی آیت ۳۳ میں مذکور سزا کے مطابق سزا دی گئی اس لیے آنحضرت کے زمانہ میں جن صحابہ یا صحابیات سے زنا سرزد ہو گیا تھا اور اس کی پاداش میں ان کو سنگسار کیا گیا تھا تو وہ زنا کی سزا نہیں تھی بلکہ فساد فی الارض کی سزا تھی لہذا اسلام میں رجم کی سزا نہیں ہے دور اول میں جن کو سنگسار کیا گیا تھا وہ ڈکیت بدمعاش اوباش قسم کے غنڈے لوگ تھے سورت مائدہ کی آیت میں غامدی نے اسی طرح تفسیر لکھدی ہے یہی رائے امین احسن اصلاحی کی ہے اور یہی رائے حمید الدین فراہی صاحب کی ہے۔ غامدی کا منشور نامی کتاب میں، میں نے خوب تفصیل لکھدی ہے۔ قارئین حضرات ذرا غور فرمائیں یہ لوگ کس طرح خفیہ سازش کے ساتھ اسلام کے احکام بگاڑنے میں مصروف ہیں سورت مائدہ میں بھی یہ مسئلہ دوبارہ

آئے گا وہاں غامدی نے رجم کے سزا یافتہ صحابیات اور صحابہ کو ڈکیت اوباش بدمعاش آوارہ منش بے راہ اور اوباشی کے مجرم جیسے ناموں سے یاد کیا ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۴۱

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (نساء:۳)

پھر اگر ڈر ہو کہ (ان کے درمیان) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو (ترجمہ غامدی) جاوید غامدی صاحب کے غلط عقائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ غلاموں اور لونڈیوں کے نظام کو ہمیشہ کے لیے ختم سمجھتے ہیں چنانچہ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں یہ اس لیے فرمایا ہے (یعنی آیت میں غلاموں کا تذکرہ اس لیے ہے) کہ غلاموں کا ادارہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا تھا چنانچہ سورت محمد میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی ممانعت کے باوجود جو غلام پہلے سے معاشرے میں موجود تھے ان کے لیے یہ استثناء باقی رکھنا ضروری تھا بعد میں قرآن نے ان کے ساتھ لوگوں کو مکاتبت کا حکم دیدیا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ لوح تقدیر اب غلاموں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنی آزادی کی تحریر جب چاہیں رقم کر سکتے ہیں۔ (البیان ج ا ص:۴۴۹)

غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ یہ مصلحت تھی جس کی وجہ سے قرآن نے تدریج کا طریقہ اختیار کیا اور اس سلسلہ کی کئی اقدامات کے بعد بالآخر سورت نور کی آیت ۳۳ میں مکاتبت کا وہ قانون نازل فرمایا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے اس کے بعد نیکی اور خیر کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھنے والے کسی شخص کو بھی غلام بنائے رکھنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

(البیان ج ا ص:۴۵۰)

جناب غامدی صاحب سورت نساء کی آیت ۲۵ میں "فَمِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" کی تفسیر میں مزید لکھتے ہیں یہ بھی انہیں اقدامات میں سے ہے جو غلامی کے ادارے کو بتدریج ختم کر دینے کے لیے کیے گئے۔ (البیان ص:۴۷۹)

سورت نساء کی آیت ۹۲ میں ﴿فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ کی تفسیر میں غامدی صاحب لکھتے ہیں قرآن نے غلامی کو ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے یہ بھی انہیں میں سے ہے اس زمانے میں غلامی ختم ہو چکی ہے۔ (ص:۵۳۳)

تبصرہ:

غامدی صاحب کے اسلام مخالف عقائد میں سے ایک عقیدہ غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہے اس نے مغرب کو خوش کرنے کے لیے قرآن عظیم کی دسیوں آیات میں تحریف کی اور سینکڑوں احادیث کا انکار کیا انہوں نے قرآن عظیم میں مکاتبت کی آیات کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے مکاتبت غلامی کے مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے غلام کو مدبر بنانا اس کو معتق بنانا اس کو مکاتب بنانا یہ غلامی کے ادارے کے مختلف شعبے ہیں اب غلام کو سہولت دینے کے کسی شعبے مثلاً مکاتبت کا حکم اسلام نے دیا ہے اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ مکاتب بنانے کی اجازت سے غلامی ختم ہوگئی ہے بلکہ صحیح حدیث ہے کہ مکاتب پر ایک درہم بھی اگر بقایا ہو تو وہ مکاتب غلام ہی رہیگا مکاتبت کو بنیاد بنا کر اسلام سے غلامی کے سارے شعبوں کو ختم کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہے مگر غامدی صاحب کے نزدیک جہاد ختم ہو گیا ہے دیت ختم ہوگئی ہے جزیہ کا نظام موقوف ہو گیا ہے اس کے لیے جہاد کے میدان میں اترنا ختم ہو گیا ہے کسی کافر کو مارنا یا قید کرنا ختم ہو گیا ہے اس لیے غلامی کا ادارہ بھی ختم ہو گیا ہے مگر غامدی صاحب کو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں چودہ آیات موجود ہیں جس میں غلاموں کو مملوک بنائے رکھنے کا بیان ہے سورت نساء میں چار آیات جو آیت ۳ آیت ۲۴ آیت ۲۵ آیت ۳۶ ہیں سورت نحل سورت مومنون سورت نور سورت روم سورت احزاب اور سورت المعارج میں ملک یمین کے تحت غلاموں کا ذکر موجود ہے اور غلام کو رقبہ کے نام سے یاد کرنے یا عبد یا آقا یا مولیٰ کے نام سے یاد کرنے کا ذکر کثرت سے قرآن میں موجود ہے۔

جناب غامدی صاحب نے کسی بھی دلیل کے بغیر دسیوں آیات اور سینکڑوں احادیث کو اپنے قلم کے ایک جنبش سے یکسر اڑا دیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں امت

مسلمہ کے لیے ایک آخری پیغام دیا ہے وہ یہ ہے ''اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ''۔
(مشکوۃ شریف) یعنی نماز کی پابندی کرو اور اپنے غلاموں پر ظلم نہ کرو اس جملہ کے بعد آنحضرت نے امت کے لیے ایک لفظ بھی ادا نہیں فرمایا صرف اپنے لیے ایک جملہ ارشاد فرمایا ''اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی'' یہ کہہ کر آپ نے جان جان آفریں کے حوالہ کیا۔

اب غامدی صاحب سے پوچھا جائے کہ نبی اکرم کے اس آخری جملہ کے بعد غامدی کو کہاں سے معلوم ہوا کہ غلاموں کا ادارہ ختم کر دیا گیا ہے؟ اللہ کا خوف کرنا چاہیے آخر اللہ کے پاس جانا ہوگا اگر غلامی کا ادارہ ختم کر دیا گیا ہے تو قتل خطأ کی دیت میں غلاموں کی آزادی کا ذکر کیوں ہے؟ قسم کا کفارہ غلاموں کی آزادی کی شکل میں کیوں برقرار ہے رمضان کا روزہ توڑنے پر غلاموں کے آزاد کرنے کا کفارہ کیوں برقرار ہے یہ اور اس طرح دسیوں مسائل ہیں جن میں براہ راست غلاموں کی آزادی کا دخل ہے پھر ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے غلاموں کو خریدا ہے فروخت کیا اور آزاد کیا ہے مکاتب بنایا ہے کیا پوری امت اور اس کے علماء وفقہاء سارے بہک گئے اور غامدی صاحب محفوظ رہے؟ جناب غامدی صاحب کو اس کی توفیق تو نہیں ہوئی کہ وہ امریکہ اور برطانیہ یہود اور نصاریٰ اور یورپ ومغرب پر قلم اٹھائیں جنہوں نے پوری دنیا کے غریب ممالک کو غلام بنا رکھا ہے اور سب کی آزادی سلب کر رکھی ہے ان کی دہشت گردی تو غامدی صاحب کو نظر نہیں آتی ہے مگر قرآن وحدیث کے مقدس احکامات پر تیشہ چلا رہا ہے حالانکہ اسلام نے جنگی قیدیوں کو اس لیے غلام بنانے کی اجازت دی ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی غلامی سے بغاوت کر چکے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے غلاموں کے غلام بنا دیا ہے۔ آج کل غلام نہیں ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غامدی جیسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں ان کے ہاں نہ جہاد ہے نہ غلام ہیں۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۴۲

﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا﴾ (نساء:۹۲)

اور جو کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کرے اس کے ذمے ہے کہ ایک مسلمان کو غلامی سے آزاد کرے اور ان کے گھر والوں کو خون بہا دے الا یہ کہ وہ معاف کر دیں (ترجمہ غامدی) اس آیت کی تفسیر میں غامدی صاحب نے دو بڑی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے ایک غلطی کا تعلق ''فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ'' سے ہے غامدی اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک مسلمان کو غلامی سے آزاد کرے اس ترجمہ کے پیش نظر غامدی صاحب اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں قرآن نے غلامی کو ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کئے یہ بھی انہیں میں سے ہے اس زمانے میں غلامی ختم ہو چکی ہے لہذا اگر کوئی شخص روزے نہ رکھ سکے تو غلام کی قیمت کے تناسب سے قیدیوں کا جرمانہ ادا کر کے وہ انہیں رہا کرا سکتا ہے یا اسی تناسب سے کسی مسلمان کا قرض ادا کر سکتا ہے۔ (البیان ج ا ص:۵۳۴)

تبصرہ:

یہاں غامدی صاحب نے ''پہلی بڑی غلطی'' یہ کی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید پر بہتان باندھا ہے کہ قرآن نے غلامی کے ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کئے ہیں یہ انہیں میں سے ایک اقدام ہے سوال یہ ہے کہ یہاں تو قرآن مجید غلاموں کے ثبوت اور اس کی دیت میں اس کی آزادی کی بات کر رہا ہے یہاں غلاموں کے خاتمے کا کونسا اقدام ہے؟ معلوم ہوا غامدی غلطی کر رہا ہے لیکن دانستہ طور پر کر رہا ہے جب غامدی صاحب نے اپنے خیال کے مطابق غلاموں کا نظام ختم کر دیا تو اب غلام کی آزادی کو مسلمان کی آزادی کی طرف لے گیا چنانچہ اس نے ترجمہ بھی اسی مقصد کے پیش نظر کیا ہے کہ ایک مسلمان کو غلامی سے آزاد کرے پھر تفسیر میں اس کی وضاحت کر کے لکھتے ہیں کہ اب غلام کی قیمت کے تناسب سے کسی مسلمان قیدی کی رہائی میں وہ پیسہ لگایا جائے یا کسی مقروض کے قرض اتارنے میں صرف کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب غلام موجود نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے غلام کے بدلے روزوں کا حکم دیا ہے ارشاد عالی ہے ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ﴾ یعنی جس کے پاس غلام نہ ہو تو اسے لگاتار دو مہینے کے روزے رکھنا ہونگے تعجب اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ تو غلام کی عدم موجودگی میں

روزوں کا حکم دے رہے ہیں مگر غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ قاتل اگر روزے نہ رکھ سکے تو غلام کی قیمت سے کسی مسلمان قیدی کو رہا کرے یا کسی مسلمان کے قرض کو ادا کرے سبحان اللہ غامدی صاحب کس خاموشی اور کس ہوشیاری سے نئی شریعت ایجاد کر رہے ہیں گزشتہ غلطی ۳۱ میں غلاموں کے نظام کے خاتمہ سے متعلق میں نے مکمل طور پر لکھدیا ہے یہاں غامدی صاحب نے ''دوسری بڑی غلطی'' یہ کی ہے کہ انہوں نے قرآن میں مذکورہ دیت کا فیصلہ مخدوش بنادیا ہے شقیں اور صورتیں بنا بنا کر غامدی صاحب نے دیت کی مقدار کا صاف انکار کر دیا ہے اور جو کچھ تسلیم کیا ہے وہ حکومت وقت اور عرف کے حوالہ کر کے قرآن وحدیث کے انکار کا راستہ خوب ہموار کیا ہے چنانچہ دیت سے متعلق اس آیت کے تحت غامدی صاحب لکھتے ہیں؛

اصل میں ''دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلَى اَهْلِهِ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ان میں دیۃ کے معنی ہیں: وہ شے جو دیت کے نام سے معروف ہے اور ''دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلَى اَهْلِهِ'' کے الفاظ حکم کے جس منشا پر دلالت کرتے ہیں، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطب کے عرف میں جس چیز کا نام دیت ہے وہ مقتول کے ورثہ کے سپرد کر دی جائے۔ قرآن مجید نے دیت کی کسی خاص مقدار کا تعین کیا ہے نہ عورت اور مرد، غلام اور آزاد اور مسلم اور غیر مسلم کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھہرائی ہے۔ اس کا حکم یہی ہے کہ دیت معاشرے کے دستور اور رواج کے مطابق ادا کی جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے فیصلے اپنے زمانے میں عرب کے دستور کے مطابق کیے۔ فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیت کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں، وہ اسی دستور کے مطابق ہیں۔ عرب کا یہ دستور اہل عرب کے تمدنی حالات اور تہذیبی روایات پر مبنی تھا۔ زمانے کی گردش نے کتاب تاریخ میں چودہ صدیوں کے ورق الٹ دیے ہیں۔ تمدنی حالات اور تہذیبی روایات میں زمین وآسمان کا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ اب ہم دیت میں اونٹ دے سکتے ہیں، نہ اونٹوں کے لحاظ سے اس دور میں دیت کا تعین کوئی دانش مندی ہے۔ عاقلہ کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے اور قتل خطا کی وہ صورتیں وجود میں آ گئی ہیں جن کا تصور بھی اس زمانے میں ممکن نہیں تھا۔ قرآن مجید کی ہدایت

ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے ہے۔ چنانچہ اس نے اس معاملے میں معروف کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ پھر معروف پر مبنی قوانین کے بارے میں یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی سے ان میں تغیر کیا جاسکتا ہے اور کسی معاشرے کے ارباب حل وعقد اگر چاہیں تو اپنے اجتماعی مصالح کے لحاظ سے انہیں نئے سرے سے مرتب کر سکتے ہیں۔ (البیان ج۱ص:۵۳۳)

تبصرہ:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ غامدی صاحب کے پاس کونسی اتھارٹی ہے کہ وہ دیت وغیرہ شرعی احکام میں جوڑ توڑ کے لیے جج بنے ہوئے ہیں کیا چودہ سو سال سے جس مسئلہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں صحابہ کرام اور تابعین اور مجتہدین وفقہاء نے سُلجھا کر امت کے سامنے وضاحت کے ساتھ بیان کردیا اور اس کے لیے واضح قواعد رکھ کر امت کو شاہراہ اعظم پر لگادیا کیا وہ کافی وشافی نہیں ہے؟ اس کے بعد غامدی صاحب کی کس تحقیق کی ضرورت رہ گئی کہ وہ مجتہد بن کر پوچھے بغیر بلاضرورت تحقیق کے میدان میں اتر گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آج تک تمام علماء اور محققین کو کنارے کردیا اور اپنی خود ساختہ تحقیقات عرف اور دستور اور رواج اور شعراء جاہلیت کے اشعار کو امت پر مسلط کرنا شروع کردیا تعجب اس پر ہے کہ امت تو نبی اکرم رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور ان کے لیے قوانین وقواعد غامدی صاحب بنا رہے ہیں؟ میں نے کئی بار غامدی صاحب کی خدمت میں کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ غامدی صاحب! آپ کے اجتہاد کی ہمیں ضرورت نہیں ہے آپ جو کچھ لکھ رہے ہو اور نئی شریعت بنا رہے ہو اس سے آپ امت کو تشویش اور تشکیک میں ڈال رہے ہو کہ اس کا (یعنی اللہ کا) حکم یہی ہے کہ دیت معاشرے کے دستور اور رواج کے مطابق ادا کی جائے۔

کم از کم آپ کو خدا کا خوف نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن اترا اللہ تعالیٰ نے اس کی تفسیر وتبیین کا وعدہ بھی فرمایا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بیان بھی فرمایا نبی اکرم کے بیان کو چھوڑ کر آپ عرف اور دستور کے پیچھے لگے ہوئے ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف سطحی غلطی

نہیں بلکہ آپ کے دل ودماغ میں انکار حدیث اور دین اسلام کے مسخ کرنے کا ایک منصوبہ اور شوق پڑا ہوا ہے جب کسی حکم کے لیے نص موجود ہو تو تنصیص شرعی کے بعد آپ کو کس نے اجازت دی ہے کہ آپ عرف کی بات کرو اور معاشرے کے دستور اور رواج کی بات کرو یہی بات تو غلام احمد پرویز کرتا تھا کہ دین کا اصل اور مرکز حکومت اور گورنمنٹ ہے اور اللہ اور رسول سے مراد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ ہے میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ میں ذرا بھی انصاف ہے تو کیا نبی کی بات معیار ہونا چاہیے یا دستور اور رواج کی بات معیار ہونا چاہیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کی دیت کے لیے سو اونٹ مقرر فرمائے ہیں یہ دین ابراہیمی کا قدیمی طریقہ قریش کے پاس تھا یا عرب کا رواج تھا یا معاشرہ کا دستور تھا کچھ بھی تھا اللہ تعالیٰ کے رسول نے اس کو شریعت کا حصہ بنا دیا چنانچہ حضرت ابن عباس کی روایت کو طبقات ابن سعد نے اس طرح نقل کیا ہے:

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَعَبْدُالْمُطَّلِبِ اَوَّلُ مَنْ سَنَّ دِيَةَ النَّفْسِ مأةً مِنَ الابِلِ فَجَرَتْ فِيْ قُرَيْشٍ وَالْعَرَب مِأة مِنَ الابِلِ وَاقرَّهَا رَسُوْل اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَا كَانتْ عَلَيْهِ (طبقات کبری ج ۱ ص ۵۸،۵۹)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ عرب میں عبدالمطلب پہلا انسان ہے جنہوں نے جان کی دیت ایک سو اونٹ مقرر کردیئے پھر قریش اور عرب میں سو اونٹوں کا سلسلہ جاری رہا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی طور پر وہی سو اونٹوں کا سلسلہ اسلام میں برقرار رکھا،

غامدی صاحب کو جان لینا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیت کے قانون کو اسلامی قانون کی حیثیت سے اپنالیا اب یہ جاہلیت کا قانون نہیں رہا اور نہ زمانے کا عرف اور دستور رہا بلکہ اب یہ اسلام کا قانون بن گیا قول رسول اور فعل رسول کی طرح تقریر رسول بھی حدیث وسنت کا مقام رکھتی ہے ادھر مؤطا میں امام مالک رحمہ اللہ نے قتل خطاء کی دیت کے بارے میں صحیح سند کے ساتھ جو حدیث نقل فرمائی ہے اس میں صاف طور پر مذکور ہے "اِنَّ فِی النَّفْسِ مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ" یعنی جان میں دیت کی مقدار سو اونٹ ہے۔

(مؤطا مالک کتاب العقول وسنن النسائی کتاب القسامۃ والدیات)

امام بخاری رحمہ اللہ کے ہم عصر محدث محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ اپنی کتاب السنۃ میں یہ روایت نقل کرتے ہیں:

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلْقَمَةَ قَالَ كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِالْعَزِيْزِ فِي الدِّيَاتِ فَذَكَرَ فِي الْكِتَابِ وَكَانَتْ دِيَةُ الْمُسْلِمِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِاةٌ مِّنَ الابِلِ (کتاب السنة لابن مروزی)

یعنی محمد بن علقمہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے دیتوں سے متعلق ایک تحریر لکھی اس تحریر میں آپ نے ذکر کیا کہ مسلمان مرد کی دیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک سو اونٹ تھی۔

غامدی صاحب آنکھیں کھول کر ادھر بھی دیکھ لیں کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کو خود متعین کیا ہے یا معاشرے اور حکومت وقت پر چھوڑ رکھا ہے؟ آنے والی حدیث میں انسان اور انسان کے جسم کے مختلف اعضاء کی دیت کا تعین کیا گیا ہے حتی کہ خصیتین تک معاملہ جا پہنچا ہے اور خصیتین کی دیت کی مقدار ایک سو اونٹ بتائی گئی ہے غامدی صاحب اگر اس کو مقدار میں تعین نہیں مانتا ہے تو وہ آخر کیا تعین چاہتا ہے دیت کی تفصیل والی حدیث ملاحظہ ہو۔

جسم کے مختلف اعضاء کی دیت

وَعَنْ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اِلٰى اَهْلِ الْيَمَنِ وَكَانَ فِيْ كِتَابِهٖ اَنَّ مَنْ اِعْتَبَطَ مُؤْمِنًا قَتْلًا فَاِنَّهٗ قَوَدُ يَدِهٖ اِلَّا اَنْ يَّرْضٰى اَوْلِيَآءُ الْمَقْتُوْلِ وَفِيْهِ اَنَّ الرَّجُلَ يُقْتَلُ بِالْمَرْاَةِ وَفِيْهِ فِي النَّفْسِ الدِّيَةُ مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ وَعَلٰى اَهْلِ الذَّهَبِ اَلْفُ دِيْنَارٍ وَفِي الْاَنْفِ اِذَا اُوْعِبَ جَدْعُهُ الدِّيَةُ مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ وَفِي الْاَسْنَانِ الدِّيَةُ وَفِي الشَّفَتَيْنِ الدِّيَةُ وَفِي

الْبَيْضَتَيْنِ الدِّيَةُ وَفِي الذَّكَرِ الدِّيَةُ وَفِي الصُّلْبِ الدِّيَةُ وَفِي الْعَيْنَيْنِ الدِّيَةُ وَفِي الرِّجْلِ الْوَاحِدَةِ نِصْفُ الدِّيَةِ وَفِي الْمَامُوْمَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ وَفِي الْجَائِفَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ وَفِي الْمُنَقِّلَةِ خَمْسَ عَشْرَةَ مِنَ الْاِبِلِ وَفِي كُلِّ اِصْبَعٍ مِنْ اَصَابِعِ الْيَدِ وَالرِّجْلِ عَشْرٌ مِنَ الْاِبِلِ وَفِي السِّنِّ خَمْسٌ مِنَ الْاِبِلِ (رواه النسائی والدارمی) وَفِي رِوَايَةِ مالک وَفِي الْعَيْنِ خَمْسُوْنَ وَفِي الْيَدِ خَمْسُوْنَ وَفِي الرِّجْلِ خَمْسُوْنَ وَفِي الْمُوْضِحَةِ خَمْسٌ (مؤطا امام مالک)

اور حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم اپنے والد (حضرت محمد ابن عمرو) سے اور وہ ابوبکر کے دادا (حضرت عمرو ابن حزم) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے پاس ایک ہدایت نامہ بھیجا جس میں لکھا ہوا تھا کہ جو شخص قصداً کسی مسلمان کو ناحق مار ڈالے (یعنی قتل عمد کا ارتکاب کرے) تو اس کے ہاتھوں کے فعل کا قصاص ہے (یعنی اس نے اپنے ہاتھوں کے فعل اور تقصیر کے ذریعہ جو قتل عمد کیا ہے اس کی سزا میں اس کو بھی قتل کر دیا جائے) الا یہ کہ مقتول کے ورثاء راضی ہو جائیں (یعنی اگر مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیں یا اس سے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو اس کو قتل نہ کیا جائے) اس ہدایت نامہ میں یہ بھی تھا کہ (مقتول) عورت کے بدلے میں (قاتل) مرد کو قصاص میں قتل کیا جائے، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جان کا خون بہا سو اونٹ ہیں (یعنی جس کے پاس اونٹ ہوں وہ خون بہا میں مذکورہ تفصیل کے مطابق سو اونٹ دے) اور جس کے پاس سونا ہو وہ ایک ہزار دینار دے، اور ناک کی دیت جب کہ وہ پوری کاٹی گئی ہو ایک سو اونٹ ہیں اور دانتوں کی دیت (جب کہ وہ سب توڑے گئے ہوں) پوری دیت (یعنی ایک سو اونٹ کی تعداد) ہے اور ہونٹوں کی دیت (جب کہ وہ پورے کاٹ دیئے گئے ہوں) پوری دیت ہے اور دونوں خصیوں کے کاٹے جانے کی بھی پوری دیت اور پیٹھ کی ہڈی توڑے جانے کی پوری دیت اور عضو خاص کے کاٹے جانے کی بھی پوری دیت ہے اور دونوں آنکھوں کو پھوڑ دینے کی بھی پوری دیت

ہے، اور ایک پیر کاٹنے پر آدھی دیت ہے، اور سر کی جلد زخمی کرنے پر تہائی دیت ہے اور پیٹ میں زخم پہنچانے پر بھی تہائی دیت ہے اور اس طرح مجروح کرنے پر کہ ہڈی ایک جگہ سے سرک گئی ہو پندرہ اونٹ دینے واجب ہیں اور ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں سے ہر ایک انگلی (کاٹنے) پر دس اونٹ دینے واجب ہیں، اور ہر ہر دانت کا بدلہ پانچ پانچ اونٹ ہیں۔ (نسائی ، دارمی) اور امام مالک رحمہ اللہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ایک آنکھ (پھوڑنے) کی دیت پچاس اونٹ ہیں اور ایک ہاتھ اور ایک پیر کی دیت پچاس پچاس اونٹ ہیں اور ایسا زخم پہنچانے کی دیت جس میں ہڈی نکل آئی ہو یا ظاہر ہوگئی ہو پانچ اونٹ ہیں۔ (مؤطا امام مالک)

قتل شبہ عمد کی دیت سو اونٹ ہیں

عَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ قَالَ دِيَةُ شِبْهِ الْعَمَدِ اَثْلَاثًا ثَلَاثٌ وَّثَلَاثُوْنَ حِقَّةً وَّثَلَاثٌ وَّثَلَاثُوْنَ جِذْعَةً وَّاَرْبَعٌ وَّثَلَاثُوْنَ ثَنِيَّةً اِلٰى بَازِلِ عَامِهَا كُلُّهَا خَلِفَاتٌ، وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ فِي الْخَطَاءِ اَرْبَاعًا خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ حِقَّةً وَخَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ جِذْعَةً وَخَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ بَنَاتُ لَبُوْنٍ وَخَمْسٌ وَعِشْرُوْنَ بَنَاتُ مَخَاضٍ (رواہ ابوداؤد)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا قتل شبہ عمد کی دیت میں (سو) اونٹنیاں دینی واجب ہیں بایں تفصیل کہ تینتیس اونٹنیاں وہ ہوں جو چوتھے برس میں لگی ہوں اور تینتیس اونٹنیاں وہ ہوں جو پانچویں برس میں لگی ہوں اور چونتیس اونٹنیاں وہ جو چھٹے برس میں لگی ہوں اور آٹھ نو سال تک جا پہنچی ہوں اور سب حاملہ ہوں۔ ایک اور روایت میں حضرت علی سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا قتل خطاء کی دیت میں چار طرح کی (سو) اونٹنیاں دینی واجب ہیں، بایں تفصیل کہ پچیس وہ ہوں جو تین تین برس کی ہوں اور پچیس وہ ہوں جو چار چار برس کی ہوں اور پچیس وہ ہوں جو دو دو برس کی ہوں اور پچیس وہ ہوں جو ایک ایک برس کی ہوں۔ (ابوداؤد)

(اس روایت کا آخری حصہ احناف کی دلیل ہے، دیت کی پوری بحث میں نے پہلے ہم لکھدی ہے)

وَعَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ قَضٰى عُمَرُ فِي شِبْهِ الْعَمَدِ ثَلاثِيْنَ حِقَّةً وَثَلاثِيْنَ جذعةً وَّارْبعين خَلِفَةً ما بينَ ثَنِيَّةٍ اِلَىٰ بازِلِ عامِهَا (رواہ ابوداؤد)

اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قتل شبہ عمد کی دیت میں تیس اونٹنیاں تین تین برس کی اور تیس اونٹنیاں چار چار برس کی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ جو چھٹے برس سے لیکر نویں برس تک جا پہنچی ہوں دینے کا حکم فرمایا۔ (گویا یہ روایت حضرت امام شافعی کے مسلک کے موافق ہے)۔ابوداؤد

ان واضح احادیث اور واضح احکامات اور سر سے لیکر پاؤں تک انسان کے جسم کے ایک ایک عضو کا نام سردار دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مبارک زبان اور فرمان سے واضح فرماتے ہیں اور امت کو واضح ہدایات جاری فرما دیتے ہیں اور غامدی صاحب کہتا ہے کہ پیغمبر نے کوئی تعیین کبھی بھی نہیں کی ہے غامدی کو اس کے سوا ہم کیا کہہ سکتے ہیں

پیغمبر کو کیا منہ دکھاؤ گے ظالم　　　شرم مگر تم کو آتی نہیں

تعجب اس پر ہے کہ دن کی روشنی میں کس ڈھٹائی کے ساتھ غامدی صاحب دیت کا انکار کرتے ہوئے اپنی کتاب برھان میں لکھتے ہیں کہ ”زمانے کی گردشوں نے کتاب تاریخ میں چودہ صدیوں کے ورق الٹ دیے ہیں تمدنی حالات اور تہذیبی روایات، ان سب میں زمین وآسمان کا تغیر واقع ہوگیا ہے اب ہم دیت میں نہ اونٹ دے سکتے ہیں نہ اونٹوں کے لحاظ سے اس دور میں دیت کا تعین کوئی دانشمندی ہے۔

قارئین حضرات کو دیکھنا چاہیے کہ جو شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کو دانشمندی کے خلاف سمجھتا ہے اس کے دل میں کتنا ایمان ہوگا اور وہ قرآن کی تفسیر میں کیا کیا خرافات بھریگا؟ اور کتنے غیر دانشمندانہ فیصلے کریگا۔

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۳۴

﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ﴾ (نساء:۱۰۲)

اور جب تم ان کے درمیان ہو اور خطرے کی جگہوں پر انہیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو
(غامدی کا ترجمہ)

جناب غامدی صاحب نے صلوۃ خوف کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص کر دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں اس کی (صلوۃ خوف کی) تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت اب باقی نہیں رہی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تدبیر کا تعلق جیسا کہ آیت وَاِذَا کُنۡتَ فِیۡهِمۡ کے الفاظ سے واضح ہے خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے تھا آپ کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتداء کی خواہش نہ اتنی شدید ہو سکتی ہے اور نہ اس کی اتنی اہمیت ہے۔ قیام جماعت کا موقع ہو تو لوگ اب الگ الگ اماموں کی اقتداء میں نہایت آسانی کے ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں (البیان ص:۵۴۳)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے ایک اجتہاد کے ساتھ صلوۃ خوف کی ضرورت کو مسترد کر دیا ہے ان کا اجتہاد یہ ہے کہ اذا کنت فیھم میں آیت نے آنحضرت کی موجودگی کو ظاہر کیا ہے لہٰذا جب آنحضرت انتقال کے بعد موجود نہیں ہونگے تو پھر صلوۃ خوف کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب کے پاس اس تخصیص کی کونسی دلیل ہے؟ تمام محدثین اور سارے مفسرین اور فقہاء کرام نے صلوۃ خوف کی بقاء کا اقرار کیا ہے اور اس کی ترتیب بتائی ہے کسی نے نہیں کہا کہ اب یہ نماز نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین اور مجاہدین نے اس نماز پر عمل کیا ہے اگر مختلف امام مہیا ہو سکتے ہیں اور کسی ایک امام پر لوگ اصرار نہیں کرتے ہوں تو یہ ان لوگوں کی پسند اور ناپسند کی بات ہے لیکن یہ کہنا کہ اب اس نماز کی ضرورت نہیں ہے یہ غامدی صاحب کا وہی عقیدہ ہے کہ چونکہ صلوۃ خوف کے آٹھ دس طریقے احادیث سے ثابت ہیں اور غامدی صاحب احادیث کے قریب نہیں جاتے ہیں اس لئے انہوں نے صلوۃ خوف ہی سے جان چھڑالی اور تمام مفسرین سے الگ راستہ اختیار کیا کہ صلوۃ خوف اب نہیں ہے فقہاء میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اجتہاد بھی اسی طرح ہے لیکن تمام

فقہاء نے اس مسئلہ میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے موقف کو ان کا تفرد قرار دیا ہے اور کسی نے اس کے اس تفرد کو قبول نہیں کیا ہے۔ غامدی صاحب نے فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔

جاوید غامدی کی غلطی ۴۴

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ (سورۃ النساء ۱۵۷، ۱۵۸)

انہوں نے ہرگز اس کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ ہی نے اسے اپنی طرف اٹھالیا تھا (غامدی کا ترجمہ)

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں جناب غامدی صاحب کا خیال ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں قرب قیامت میں آسمان سے کوئی عیسیٰ نازل نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

اصل الفاظ ہیں: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ''۔ اس رفع کی وضاحت قرآن نے سورۃ آل عمران کی آیت ۵۵ میں اس طرح فرمائی ہے کہ وفات کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں اپنی طرف اٹھالیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ روح قبض کر کے ان کا جسم بھی اٹھالیا جائے گا تاکہ ان کے دشمن اس کی توہین نہ کر سکیں۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے اور رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرتا ہے اور جب تک ان کا مشن پورا نہ ہو جائے، ان کے دشمن ہرگز ان کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان کی توہین وتذلیل بھی اللہ تعالیٰ گوارا نہیں کرتا اور جو لوگ اس کے درپے ہوں، انہیں ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اپنے رسولوں کو لازماً ان کی دست درازی سے محفوظ کر دیتا ہے۔ (البیان ص:۵۷۵)

تبصرہ:

جاوید غامدی صاحب نے سورت آل عمران آیت ۵۵ کی تفسیر میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح کو قبض کر لیا اور جسم کو آسمان کی طرف اٹھالیا میں نے بھی وہاں جاوید غامدی کی غلطی ۲۴ کے ضمن میں بہت کچھ لکھا ہے اس عمدہ تحقیق پر ایک بار پھر نظر ڈالی جائے جاوید غامدی صاحب کے ملحدانہ عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ

علیہ السلام وفات پاچکے ہیں ان سے پوچھا جائے کہ یہ واقعہ کب ہوا کس جگہ ہوا کس طرح موت آئی؟ ان سوالات کا جواب دینا غامدی پر لازم ہے بغیر کسی دلیل کے یہ کہنا کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پاچکے ہیں کون تسلیم کریگا سینکڑوں احادیث میں تصریح ہے کہ قیامت کے قریب عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے اس طرح متواتر احادیث کو نظر انداز کرنا تو بڑی گمراہی ہے قرآن کا خود اعلان ہے "وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ" یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی علامات میں سے ہے اب قرآن کریم کی اس تصریح کو غامدی کس طرح نظر انداز کرسکتا ہے دوسری جانب سینکڑوں مفسرین ومحدثین اور سارے صحابہ نزول عیسیٰ پر متفق ہیں صرف غامدی اور ان کے استاذ کا یہ عقیدہ کس طرح صحیح قرار دیا جاسکتا ہے؟ یہ تو غلام احمد قادیانی کا عقیدہ ہے اور مرزائیوں کا عقیدہ ہے۔

غامدی صاحب نے ایک مفروضہ بنالیا ہے کہ کوئی رسول قتل نہیں ہوا ہاں انبیاء قتل ہوئے ہیں ان سے پوچھا جائے کہ نبی اور رسول میں یہ فرق تم نے کہاں سے پیدا کرلیا ہے اگر میں کہوں کہ رسول اور نبی کے مفہوم میں ترادف ہے جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ہے ﴿وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ یعنی اسماعیل علیہ السلام رسول بھی تھے اور نبی بھی تھے تو غامدی صاحب اس کا کیا جواب دے گا؟ پھر سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ پر قتل کا سخت وقت وہی آیا تھا جبکہ ان کو ایک مکان میں محصور کردیا گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اس کو آسمانوں پر اٹھالیا اور یہود سے بچالیا مگر غامدی کہتے ہیں کہ روح قبض کرلی گئی اور جسم کو آسمانوں پر اٹھالیا گیا اس طرح غامدی نے حضرت عیسیٰ کے قتل کا اعتراف کرلیا حالانکہ ان کا دعویٰ ہے کہ کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا غامدی صاحب سے یہ بھی پوچھا جائے کہ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ یعنی ان لوگوں نے یقیناً حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا یہ جو اٹھالیا کا لفظ ہے پوچھنا یہ ہے یہ کس چیز کو اٹھالیا اگر روح کو اٹھالیا تو اللہ تعالیٰ نے تاکید کے ساتھ قتل کی نفی کیوں فرمائی اور اگر بلا روح صرف جسم کو اٹھالیا روح الگ ہوگئی تو پھر بھی وہی سوال ہے کہ قتل کی نفی کیوں فرمائی لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کے قتل سے بچالیا اور آسمانوں پر روح وجسم کے ساتھ زندہ اٹھالیا ان کو

فرشتوں کی صفت عطا فرمائی اور قیامت کے قریب اتر کر آئیں گے اور دجال کو قتل کریں گے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول عیسیٰ پر قسم کھائی ہے جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ سینکڑوں احادیث کا انکار کرتے ہیں اس غلط عقیدہ سے قتل دجال اور خروج دجال سب چیزوں کا انکار لازم آئے گا غامدی صاحب کا جو عقیدہ ہے یہ مسلمانوں کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ عیسائیوں کے ایک فرقے کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھانے کے بعد آسمانوں پر لے جایا گیا مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمانوں پر اٹھائے گئے قرآن کی آیت ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ اس کی زبردست تائید ہے کہ اللہ زبردست ہے عاجز نہیں اور ان کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہے۔

جناب غامدی صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرفتار کرنے اور اللہ تعالیٰ کا اسے بچانے کا ایک نقشہ اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں ''یعنی صورت حال ایسی بنائی گئی کہ یہود یہی سمجھے کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کو سولی دلوادی ہے اس کی صورت کیا ہوئی؟ اس معاملے میں سب سے قرین قیاس بیان انجیل برناباس کا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب ''یہودا اسکریوتی'' یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر مسیح علیہ السلام کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لیکر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجناب کو اٹھا کر لے گئے اور یہودا اسکریوتی کی صورت اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو سیدنا مسیح کی تھی سولی اُسی ہی کو دی گئی مسیح علیہ السلام کو ہاتھ لگانا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں ہوا۔ (البیان ج ۱ ص: ۵۷۴)

جناب غامدی صاحب نے اپنی تفسیر میں خود انجیل برناباس کا یہ حوالہ نقل کیا ہے اور تعجب ہے کہ پھر بھی مسیح علیہ السلام کی وفات کے قائل ہیں جبکہ اس اقتباس میں صاف مذکور ہے کہ چار فرشتے آنجناب یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کو اٹھا کر لے گئے اب اس میں کہاں گنجائش ہے کہ آپ کی روح قبض کر لی گئی اور جسم آسمانوں پر اٹھایا گیا انجیل برناباس کا حوالہ اور اقتباس بالکل قرآن کے موافق ہے اور جناب غامدی کے نظریے کے بالکل مخالف ہے جو حقیقت میں ﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا﴾ یعنی گھر کے اپنے ہی لوگوں میں سے ایک نے گواہی دیدی۔ کی زندہ مثال ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدۃ

جاوید غامدی کی غلطی نمبر ۴۵

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا﴾ (سورۃ المائدۃ:۳۳)

ترجمہ: جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑیں گے اور زمین میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے ان کی سزا پھر یہی ہے کہ عبرتناک طریقے سے قتل کئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں۔

(ترجمہ غامدی) غامدی صاحب نے اس آیت کو عام کر کے زانی محصن کے رجم کا انکار کیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اللہ کا رسول دنیا میں موجود ہو اور لوگ اس کی حکومت میں اس کے کسی حکم یا فیصلے کے خلاف سرکشی اختیار کر لیں تو یہ اللہ و رسول سے لڑائی ہے۔ اسی طرح زمین میں فساد پیدا کرنے کی تعبیر ہے۔ یہ اس صورت حال کے لیے آتی ہے، جب کوئی شخص یا گروہ قانون سے بغاوت کر کے لوگوں کی جان و مال، آبرو اور عقل و رائے کے خلاف برسر جنگ ہو جائے۔ چنانچہ قتل دہشت گردی، زنا، زنا بالجبر اور چوری ڈاکا بن جائے یا لوگ بدکاری کو پیشہ بنا لیں یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئیں یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن جائیں یا نظم ریاست کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں یا اغوا، تخریب، ترہیب اور اس طرح کے دوسرے سنگین جرائم سے حکومت کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیں تو وہ اسی فساد فی الارض کے مجرم ہوں گے۔ (البیان ج ا ص: ۶۲۷)

آیت میں اس کے لیے ''یَسْعَوْنَ'' اور ''یُحَارِبُوْنَ'' وغیرہ کی صورت میں جمع کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جرم اگر جتھا بنا کر ہوا ہے تو اس کی سزا بھی انفرادی

حیثیت سے نہیں، بلکہ اس جتھے کو جتھے ہی کی حیثیت سے دی جائے گی۔ چنانچہ مجرموں کا کوئی گروہ اگر فساد فی الارض کے طریقے پر قتل، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس طرح کے دوسرے جرائم کا مرتکب ہوا ہے تو اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ متعین طور پر جرم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا اور کن سے نہیں ہوا ہے، بلکہ جتھے کا ہر فرد اس میں شریک سمجھا جائے گا اور اس کے ساتھ معاملہ بھی لازماً اسی حیثیت سے ہوگا۔ (البیان ج ۱ص: ۶۲۷)

اوپر آیت میں اصل میں ''أَنْ يُقَتَّلُوْا'' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کے معنی یہ ہیں کہ اللہ و رسول سے محاربہ اور فساد فی الارض کے یہ مجرم صرف قتل ہی نہیں، بلکہ عبرتناک طریقے سے قتل کر دیے جائیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ''قتل'' یہاں ''تقتیل'' کی صورت میں آیا ہے۔ بنا میں یہ زیادت نفس فعل میں شدت مبالغہ کے لیے ہوئی ہے۔ اس وجہ سے ''تقتیل'' یہاں ''شر تقتیل'' کے مفہوم میں ہے۔ چنانچہ حکم کا تقاضا یہ ہوگا کہ ان مجرموں کو ایسے طریقے سے قتل کر دیا جائے جو دوسروں کے لیے عبرت انگیز اور سبق آموز ہو۔ رجم، سنگ ساری بھی اسی کے تحت داخل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اوباشی کے بعض مجرموں کو یہ سزا اسی آیت کے حکم کی پیروی میں دی ہے۔ (البیان ج ۱ص: ۶۲۸)

تبصرہ:

جناب غامدی صاحب نے سورت مائدہ کی اس آیت کو کھینچ کر اپنی حد سے باہر نکال کر اتنا عام کیا کہ زنا یا زنا بالجبر کو اس کے ماتحت کر دیا ہے پہلے شادی شدہ زانی کی سنگساری اور رجم کی سزا کا انکار کر دیا اور پھر ان کو ڈکیٹ قرار دے کر ان کے رجم کی سزا کی جگہ ان کو محاربہ کی سزا کا مستحق قرار دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ آیت محاربہ کو زنا تک عام کرنے کا اختیار غامدی صاحب اور ان کے استادوں کو کس نے دیا، تمام فقہاء اور سارے مفسرین و محدثین نے آیت محاربہ کا مصداق الگ بتایا ہے اور حد زنا کا مصداق الگ بتایا ہے غامدی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ آیت محاربہ کے تحت

رجم کی سزا مندرج کریں الگ الگ جرائم ہیں اس کی الگ الگ سزائیں ہیں اس کو اسی طرح رکھنا چاہیے لیکن چونکہ غامدی صاحب اوران کے اساتذہ نے رجم کا انکار کردیا ہے لہٰذا عہد نبوی میں سنگساری کی سزا کو آیت محاربہ میں داخل کردیا تا کہ رجم کا انکار برقرار رہے اور اس کی سزا کو آیت محاربہ میں لاکر قصہ ختم کردیں اور غیر شادی شدہ اور شادی شدہ دونوں کے لیے صرف کوڑے ثابت کریں اور سینکڑوں احادیث کا انکار کریں اب ضروری تھا کہ رجم کے سزا یافتہ صحابہ اور صحابیات کو مفسدین بدمعاش ڈکیت اوباش اور دہشت گرد ثابت کریں۔

چنانچہ غامدی صاحب ان کے استاذ اور استاذ الاستاذ نے صحابہ اور صحابیات کے لیے غلیظ قلم استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو۔

حضرت ماعز اسلمیؓ جاوید غامدی کے قلم کی زد میں

صحابہ وصحابیات کے بارے میں جناب غامدی صاحب کی تحقیر وتوہین کے کلمات سے پہلے ایک ضابطہ اور قاعدہ سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ تکمیل شریعت کے لیے اور امت کو شریعت کا عملی نمونہ دکھانے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اعمال وافعال پر خود عمل فرمایا ہے جو اعمال وافعال عصمت نبوت کے منافی نہیں تھے اگر چہ عام ماحول میں وہ بہت ہی نا آشنا اور ثقیل سمجھے جاتے تھے جیسے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے کو عرب جاہلیت میں حرام سمجھتے تھے چنانچہ اس رسم کو توڑنے کے لیے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ بیوی سے آنحضرت نے نکاح کر کے عرب جاہلیت کے ایک سخت ترین رواج کو توڑ ڈالا یہ فعل چونکہ عصمت انبیاء کے منافی نہیں تھا اس لیے آنحضرت نے اپنی ذات مبارک کو اس کے توڑنے کے لیے پیش فرمایا لیکن بعض افعال واعمال ایسے تھے کہ تکمیل شریعت کے لیے اس کا نمونہ پیش کرنا ضروری تھا جیسے چوری کی پاداش میں ہاتھ کٹ جانا زنا کی پاداش میں شادی شدہ کے لیے سنگسار ہوجانا شراب پینے پر اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دینا حد قذف میں اسی (۸۰) کوڑے کھانا یہ ایسے

افعال تھے جن کا ارتکاب شانِ نبوت اور عصمتِ انبیاء کے خلاف تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا نمونہ خود پیش نہیں کر سکتے تھے اور تکمیل شریعت کے لیے اس کا عملی نمونہ نہایت ضروری تھا اس لیے تکوینی طور پر بعض صحابہ اور بعض صحابیات سے ایسے افعال سرزد ہو گئے جن پر حد نافذ ہو گئی اور امت کو شریعت مقدسہ کا ایک عملی نمونہ مل گیا کہ شادی شدہ مرد کو اس طرح سنگ سار کیا جاتا ہے زانیہ عورت کو اس طرح سنگ سار کیا جاتا ہے غیر شادی شدہ مرد وعورت اور حد خمر وحد قذف میں اس طرح کوڑے مارے جاتے ہیں چور اور چورنی کا ہاتھ اس طرح کاٹا جاتا ہے چنانچہ ان سزا یافتہ صحابہ وصحابیات کی یہ بڑی قربانی تھی جنھوں نے گویا تکمیل شریعت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور اسلامی شریعت کی تکمیل ہوگئی اس پیارے منظر نامے سے ان سزا یافتہ صحابہ وصحابیات سے امت کے ہر سننے پڑھنے والے کے دل میں محبت اور عقیدت پیدا ہو جاتی ہے میں جب حدیث میں ان حضرات کے اخلاص پر مبنی احادیث پڑھاتا ہوں تو بے اختیار خود بھی روتا ہوں اور طلبہ بھی روتے ہیں اس کے برعکس جاوید غامدی صاحب نے ان صحابہ وصحابیات کو غنڈے اوباش بدترین اشخاص بڑے بدمعاش بدترین اوباش انتہائی بدخصلت غنڈے، جنسی ہیجان کے غلبہ میں مہینوں عورتوں کا پیچھا کرنے والے جیسے ناموں سے اپنی کتاب برھان میں یاد کیا ہے

(دیکھیے برھان ص:۸۳تا۹۱ طبع ہفتم دسمبر ۲۰۰۹ء)

اس کے برعکس غامدی صاحب کے نقشہ پیش کرنے سے ان صحابہ سے دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور آنحضرت نے جو ان کی مدح فرمائی ہے اور جنت کی بشارت سنائی ہے سب مشکوک ہو جاتے ہیں جن شارحین حدیث اور محدثین وفقہاء اور مدارس کے علماء نے ان صحابہ وصحابیات کے خلوص اور خوف آخرت اور گناہ پر ندامت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے لیے جنت کی بشارت اور توبہ کی عظیم قبولیت کو بیان کیا تو ان تمام چیزوں کو جاوید احمد غامدی نے نہایت چالاکی سے رد کیا اور حضرت ماعز پر نہایت گندے اور رکیک حملے کیے ہیں غامدی کی کتاب برھان میں غامدی کی عبارت ملاحظہ فرمائیں وہ کس انداز سے حضرت ماعز کو مجرم ٹھہرا رہے ہیں۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جاوید غامدی ان کے استاد امین اصلاحی ان کے استاد حمید الدین فراہی رجم کی سزا کو نہیں مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ زانی کے لیے قرآن میں صرف کوڑے ہیں خواہ زانی شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو اور رجم کی احادیث سب غلط اور نا قابل اعتبار ہیں۔ ادھر احادیث کی کتابوں بخاری و مسلم اور صحاح ستہ میں عہد نبوی میں رجم کے کئی واقعات پیش آئے ہیں جو تواتر عملی اور اجماع صحابہ سے ثابت شدہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے رجم کی سزا سے انکار وفرار کی وجہ سے غامدی صاحب ان کے استاد امین اصلاحی ان کے استاد حمید الدین فراہی صاحب نے ان واقعات کو ''فساد فی الارض'' قرار دیا اور پھر ان صحابہ وصحابیات پر فساد فی الارض اور بغاوت ومحاربہ کا دفعہ چسپاں کر دیا اور کہا کہ یہ ڈکیت قسم کے لوگ تھے بدمعاش تھے غنڈے تھے ڈیرے ڈالنے والیاں تھیں قحبہ گر عورتیں تھیں بغاوت پر اترنے والے لوگ تھے اس لیے ان کو زنا کی وجہ سے نہیں بلکہ ان اضافی امور کی وجہ سے سنگ سار کیا گیا ہے ان کی سزا کا دفعہ سورت مائدہ کی آیت محاربہ کے تحت آتا ہے اور اسی کی روشنی میں یہ لوگ سنگ سار کیے گئے ہیں ان لوگوں نے اگر اعتراف کیا تو جان بچانے کے لیے کیا آنحضرت نے جو مدح فرمائی تو مرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے یہ ان لوگوں کی پاکی کی دلیل نہیں ہے بہر حال غامدی صاحب کی لمبی عبارت ملاحظہ کیجئے اور فیصلہ فرمائیں کہ صحابہ کے بارے میں ان کا اخلاقی معیار کس پیمانے پر ہے:

برھان ص: ۸۳ طبع ہفتم دسمبر ۲۰۰۹ء پر وہ لکھتے ہیں: سہولت کے لیے میں نمبر لگاتا جاؤں گا۔

(۱) اس میں شبہ نہیں کہ ماعز کے بارے میں یہ سب باتیں حدیث کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر اس کے اس کردار کی نفی کی جاسکے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے نمایاں ہوتا ہے۔

(۲) اعتراف جرم اور ندامت سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ یہ کوئی مرد صالح تھا جس سے یہ جرم اتفاقاً سرزد ہو گیا۔ دنیا میں جرائم کی جو تاریخ اب تک رقم ہوئی ہے، اس سے دسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ بدترین اوباش اور انتہائی بدخصلت غنڈے جو کسی طرح گرفت میں نہیں آسکتے تھے،

ارتکاب جرم کے فوراً بعد کسی وقت اس طرح قانون کے سامنے خود پیش ہوئے کہ ان کی ندامت پر لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے ہم دردی کے جذبات امنڈ آئے۔ نفسیات جرم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے محرکات کئی ہو سکتے ہیں: (۳) مجرم اس اندیشے میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اب یہ جرم چھپا نہ رہے گا، اس لیے وہ خود آگے بڑھ کر اس خیال سے اپنے آپ کو قانون کے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ اس طرح شاید اسے سخت سزا نہ دی جائے (۴) جرم اس طریقے سے سرزد ہوتا ہے کہ اس کے افشا کو روکنا فی الواقع ممکن نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ سبقت کر کے اپنے آپ کو لوگوں کے ردعمل کی شدت سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ (۵) جنسی ہیجان کے غلبہ میں مہینوں عورتوں کا پیچھا کرنے والے جب پہلی مرتبہ زنا بالجبر کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں تو بعض اوقات اس جرم کے نتیجے میں ہیجان کا ختم ہو جانا ہی انہیں اعتراف جرم پر آمادہ کر دیتا ہے۔ (۶) مجرم کے ماحول میں کسی غیر معمولی دینی شخصیت کا وجود بھی اس کا باعث بن جاتا ہے۔ (۷) جرم کے حالات، مثلاً مجرم کی درندگی کا شکار ہونے والی عورت یا بچے کی بے بسی بھی یہ نتیجہ پیدا کر دیتی ہے۔ (۸) ضمیر کی خلش اور انسان کے اندر سے نفس لوامہ کی سرزنش بھی صرف بھولے بھالے مجرموں ہی میں احساس ندامت پیدا کرنے کا باعث بنتی، بلکہ بڑے بڑے بدمعاش بھی بعض اوقات کسی خاص صورت حال میں اس سے متنبہ ہو جاتے ہیں اور پھر پورے خلوص کے ساتھ، نہ صرف یہ اپنے جرم کا اعتراف کر لیتے ہیں، بلکہ اصرار کرتے ہیں کہ انہیں جلد سے جلد کیفر کردار کو پہنچا دیا جائے۔

(۹) پروردگار اسے جنت میں بھی داخل کر سکتا ہے۔ اللہ کا رسول اگر دنیا میں موجود ہو اور اسے وحی کے ذریعے یہ بتایا جائے کہ مجرم کی مغفرت ہو گئی اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھے اور لوگوں کو بھی اس کے حق میں دعا کی نصیحت کرے تو اس سے اس کردار کی نفی کس طرح ہو جائے گی جو توبہ و اصلاح سے پہلے اس مجرم کا رہا؟ اس سے کیا یہ سمجھا جائے کہ کسی اوباش کو کبھی توبہ کی توفیق نہیں ملتی؟ اور جو شخص توبہ کر لے، اس کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کبھی اوباش بھی رہا تھا؟ (برہان ۸۴)

(۱۰) اسی طرح یہ بات تو بے شک صحیح ہے کہ کسی بدترین شخص کا ذکر بھی اس کے مرجانے کے بعد کبھی برے لفظوں میں نہیں کرنا چاہیے اور رسول اللہ ﷺ نے اسی بنا پر ان لوگوں کو تنبیہ کی جو ماعز کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ اس کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ کتے کی طرح سنگ سار کردیا گیا، لیکن اس کے معنی کیا یہ ہیں کہ جس شخص کے بارے میں بغیر کسی ضرورت کے اس طرح کا تبصرہ کرنے سے لوگوں کو روکا جائے، وہ لازماً کوئی ہستی معصوم ہی ہوتا ہے؟ اور قانون و شریعت کی تحقیق کے لیے بھی اس کا کردار کبھی زیر بحث نہیں لایا جاسکتا؟

(۱۱) رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے، مثلاً اس طرح کے سوالات کیے کہ کیا تم جانتے ہو کہ زنا کیا ہے؟ تو یہ وہ سوالات ہیں جو اعتراف جرم کی صورت میں ہر عدالت کو لازماً کرنے چاہییں۔ اس صورت میں چونکہ اس بات کا ہر وقت امکان ہوتا ہے کہ بعد میں کوئی شخص مجرم کے کسی مبہم بیان کی بنا پر عدالت کے فیصلے پر معترض ہو اور مدینہ کے ماحول میں جہاں منافقین صبح و شام اسی طرح کے فتنوں کے لیے سرگرم رہتے تھے، اس بات کا اندیشہ چونکہ اور بھی زیادہ تھا، اس وجہ سے آپ نے اپنے سوالات کے ذریعے سے معاملے کا کوئی پہلو غیر واضح نہیں رہنے دیا۔ اس سے کوئی شخص اگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بے چارہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ زنا کیا ہے تو اس کے بارے میں پھر کیا عرض کیا جاسکتا ہے! (۱۲) حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے لوگ اگر زنا بالجبر کے متعلق یہ بھی کہتے ہیں کہ شرفا بھی کبھی کبھی اس کے مرتکب ہوجایا کرتے ہیں تو اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے۔ عقل و دانش کی جو مقدار اب ہمارے مدرسوں میں باقی رہ گئی ہے، اس کے بل بوتے پر اس سے زیادہ کیا چیز ہے جس کی توقع ان لوگوں سے کی جاسکتی ہے؟ (۱۳) بہرحال یہ ہے ان سب باتوں کی حقیقت، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص اصرار کرتا ہے کہ ان روایات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہستی معصوم تھا جو بس یونہی راہ چلتے کسی عورت سے بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھا تو اسے پھر مان لینا چاہیے کہ اس صورت میں نہایت شدید قسم کا جو تناقض اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر اور ان روایات کے مضمون میں پیدا ہوجائے گا، اس کی بنا پر کوئی حتمی بات اس

مقدمے کے بارے میں بھی کسی شخص کے لیے کہنا ممکن نہ ہوگا۔ (برہان ص:۸۵)

تبصرہ:

مذکورہ مضمون میں جاوید غامدی نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو کسی رعایت کا مستحق نہیں چھوڑا بلکہ ہر طرف سے پہرہ لگا کر حضرت ماعز کو نا قابل معافی مجرم ٹھہرا کر چھوڑا، اللہ تعالیٰ غامدی کو سمجھائے غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں یہ ہیں وہ روایتیں اور مقدمات جن کی بنیاد پر ہمارے فقہا قرآن مجید کے حکم میں تغیر کرتے اور زنا کے مجرموں کے لیے ان کے محض شادی شدہ ہونے کی بنا پر رجم کی سزا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حمارے مواد پر جو تبصرہ ہم نے کیا ہے، اس کی روشنی میں پوری دیانت داری کے ساتھ اس کا جائزہ لیجئے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ اگر کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو بس یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے زنا کے بعض مجرموں کو رجم اور جلاوطنی کی سزا بھی دی ہے۔ لیکن کس قسم کے مجرموں کے لیے یہ سزا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء نے کس طرح کے زانیوں کو یہ سزا دی؟ اس سوال کے جواب میں کوئی حتمی بات ان مقدمات کی رودادوں اور ان روایات کی بنیاد پر نہیں کہی جا سکتی۔ (برہان ص:۸۸)

تبصرہ:

غامدی کی عبارات پر تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ نہایت واضح ہیں جس سے غامدی صاحب کی صحابہ کے بارے میں ذہنیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ قلم کے کس پیچ و تاب کے ذریعہ سے کس طرح خفیہ انداز سے صحابہ کرام کے بارے میں اپنے گندے کلمات کو ظاہر کر رہا ہے غامدی نے ہر اس راستہ کو بند کر دیا جہاں سے اس صحابی کے لیے کسی کے دل میں ہمدردی پیدا ہو سکتی تھی پھر غامدی نے اس سلسلہ میں فقہاء کرام پر حملہ کر دیا اور پھر دینی مدارس کے علماء و طلباء اور ان کی تربیت کو مشکوک بنا کر ان کے علم کی رسائی کا مذاق اڑایا چونکہ غامدی صاحب کی ذہنیت میں شیعیت مودودیت دہریت سُوءِ ادب اور انکار حدیث کا عنصر شامل ہے لہذا ان سے یہی توقع کی جا سکتی تھی جو کچھ اس نے لکھا ہے۔

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ حمید الدین فراہی کے قلم کی زد میں

علامہ غامدی کہتے ہیں کہ اس سزا (رجم) کا مأخذ درحقیقت کیا ہے؟ یہی وہ عقدہ ہے جسے امام حمید الدین فراہی نے اپنے رسالہ ''احکام الاصول باحکام الرسول'' میں حل کیا ہے۔ اپنے اصول کے مطابق انہوں نے ان مبہم اور متناقض روایات سے قرآن مجید کے حکم میں کوئی تغیر کرنے کے بجائے انہیں اس کتاب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک رجم اور جلاوطنی کی اس سزا کا مأخذ سورۃ مائدہ کی آیت محاربہ ہے۔

امام حمید الدین فراہی کی اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ، اس کی اصل سزا تو سورہ نور میں قرآن کے صریح حکم کی بنا پر سو کوڑے ہی ہے، لیکن مجرم اگر زنا بالجبر کا ارتکاب کرے یا بدکاری کو پیشہ بنالے یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئے یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائے یا مردہ عورتوں کی نعشیں قبروں سے نکال کران سے بدکاری کا مرتکب ہو یا اپنی دولت اور اقتدار کے نشے میں غربا کی بہو بیٹیوں کو سربازار برہنہ کرے یا کم سن بچیاں بھی اس کی درندگی سے محفوظ نہ رہیں تو مائدہ کی اس آیت محاربہ کی رو سے اسے رجم کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مجرم کے حالات اور جرم کی نوعیت کے لحاظ سے جو دوسری سزائیں اس آیت میں بیان ہوئی ہیں، وہ بھی اگر عدالت مناسب سمجھے تو اس طرح کے مجرموں کو دے سکتی ہے۔ انہی سزاؤں میں سے ایک سزا جلاوطنی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجرموں کو جو محض زنا ہی کے مجرم نہیں تھے، بلکہ اس کے ساتھ اپنی اوباشی کی بنا پر فساد فی الارض کے مجرم بھی تھے، یہ دونوں سزائیں دی ہیں۔ چنانچہ ان میں وہ مجرم جو اپنے حالات اور جرم کی نوعیت کے لحاظ سے رعایت کے مستحق تھے، انہیں آپ نے زنا کے جرم میں آیت نور کے تحت سو کوڑے مارنے کے بعد معاشرے کو ان کے شر و فساد سے بچانے کے لیے ان کی اوباشی کی پاداش میں مائدہ کی اسی آیت محاربہ کے تحت جلاوطنی کی سزا دی اور ان میں سے وہ مجرم جنہیں کوئی رعایت دینا ممکن نہ تھا، اسی آیت کے حکم: ان یقتلوا : کے تحت رجم

کردیے گئے۔ (برہان ص:۹۱ طبع ہفتم)

تبصرہ:

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ حمید الدین فراہی کن الفاظ سے صحابہ کو یاد کر رہے ہیں جن کا خلاصہ اوپر غامدی صاحب نے پیش کیا ہے، حمید الدین فراہی صاحب کی بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے حکم رجم کا انکار کیا اور عہد نبوی میں رجم کے واقعات ایسے صحابہ کے لیے ثابت کیا جو غنڈے تھے فساد فی الارض کے مرتکب تھے بدمعاش اور اوباش تھے اس لیے ان کو آیت محاربہ کے تحت سنگسار بھی کیا گیا اور جلاوطن بھی کیا گیا۔ فراہی صاحب نے اپنے شاگردوں کو بہت ہی غلط نظریہ دیا جس سے سینکڑوں احادیث کا انکار لازم آگیا۔

حضرت ماعزؓ امین احسن اصلاحی کے قلم کی زد میں

امین اصلاحی نے بھی حمید الدین فراہی کی طرح سنگ ساری اور رجم کی سزا کو آیت محاربہ کے تحت داخل مانا ہے اور نام لیے بغیر حضرت ماعزؓ اور رجم کے سزا یافتہ دیگر مرد و خواتین کو انہیں القاب سے یاد کیا جو حمید الدین فراہی نے یاد کیا اور جو ان کی اتباع میں آج کل جاوید احمد غامدی ان القاب سے آنحضرت کے ان صحابہ کو یاد کر رہے ہیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے امین اصلاحی سورت مائدہ کی آیت محاربہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اللہ اور رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھا جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظام حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے، عام اس سے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم، اس کے قانون اور نظام کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ

شریعت کے عام ضابطہ حدود وتعزیرات کے تحت کاروائی کی جائے گی۔
دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے۔ اپنے شروفساد سے علاقے کے امن ونظم کو درہم برہم کردے۔ لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کے لیے لاء اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کردیں۔ ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطۂ حدود وتعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کی مجاز ہے''۔ (تدبر قرآن ۲/۵۰۵)

اس کے بعد انہوں نے رجم کا ماخذ ان الفاظ میں واضح کیا ہے (قرآن میں تقتیل کا حکم مذکور ہے) اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ ان کو عبرت انگیز اور سبق آموز طریقہ پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق ملے۔ صرف وہ طریقۂ قتل اس سے مستثنیٰ ہوگا جو شریعت میں ممنوع ہے، مثلاً: آگ میں جلانا، اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو غنڈوں اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون اور نظم کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کرسکتی ہے۔ رجم یعنی سنگ سار کرنا بھی ہمارے نزدیک تقتیل کے تحت داخل ہے''۔ (تدبر قرآن ۲/۵۰۵)

اصلاحی مزید لکھتے ہیں اس وجہ سے وہ غنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کی عزت وناموس کے لیے خطرہ بن جائیں جو زنا اور اغوا کو پیشہ بنالیں جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت وآبرو پر ڈاکہ ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے

(تدبر قرآن ۲/۵۰۴ ج ۴)

حضرت ماعزؓ کے علاوہ دیگر جن افراد کو عہد نبویؐ میں رجم کیا گیا امین احسن اصلاحی کے نزدیک یہ سب غنڈے تھے وہ لکھتے ہیں: ''اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بہت سے ڈیرے والیاں ہوتی تھیں، جو پیشہ کراتی تھیں، اوران کی سرپرستی زیادہ تر یہودی کرتے تھے جو ان کی

آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے، اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ان لوگوں کا بازار سرد پڑ گیا، لیکن اس قسم کے جرائم پیشہ آسانی سے باز نہیں آتے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی قماش کے کچھ مرد اور بعض عورتیں زیر زمین یہ پیشے کرتے رہے اور تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے، بالآخر جب وہ قانون کی گرفت میں آئے تو مائدہ کی اسی آیت کے تحت، جس کا حوالہ اوپر گزرا، آپ نے رجم کرایا"۔ (تدبر قرآن ج ۲ ص:۵۰۶)

رجم سے متعلق حضرت عمر فاروق کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں: بہر حال یہ روایت بالکل بے ہودہ ہے اور ستم یہ کہ اسے حضرت عمر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ (تدبر قرآن ص:۵۰۳)

رجم شدہ صحابہ وصحابیات کو مغفرت کی بشارت

عہد نبوی میں جن صحابہ اور صحابیات پر رجم کا قانونِ شرعی نافذ کیا گیا تھا ان سے متعلق عقیدت ومغفرت اور نفرت وعداوت کے دونوں پہلو سامنے آسکتے تھے اس لیے لسانِ نبوت سے ان کی مغفرت اور جنت کی بشارت بالکل واضح طور پر آ گئی تاکہ آئندہ ان سے متعلق کسی کی زبان سے غلط اور ہتک آمیز جملہ صادر نہ ہو جائے چنانچہ صحیح مسلم ج ۲ ص:۶۸ پر حضرت بریدہؓ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ ماعز بن مالک کے لیے استغفار کی دعا کرو لوگوں نے اس طرح دعا کی "غَفَرَ اللّٰهُ لِمَاعِزِ بْنِ مَالِكٍ" اللہ تعالیٰ ماعز بن مالک کی مغفرت فرمائے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِّمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ:

ترجمہ: ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک امت پر تقسیم کردی جاتی تو پوری امت کو کافی ہوتی"۔

نسائی میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَقَدْ رَأَيْتُهُ بَيْنَ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ (فتح الباری ج ۱۲ ص: ۱۳۰)

ترجمہ: "میں نے ماعز کو دیکھا کہ جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے"۔

مسند احمد بروایت ابوذر رضی اللہ عنہ یہ ارشاد مروی ہے:

قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَدْخَلَ الْجَنَّةَ (فتح الباری ص: ۱۳۰ ج ۱۲)

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے ماعز کو بخش دیا اور اسے جنت میں داخل کر دیا“۔

صحیح ابو عوانہ میں بروایت جابرؓ یہ الفاظ ہیں:

فَقَدْ رَأَيْتُهٗ يَتَخَضْخَضُ فِيْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ (فتح الباری ص: ۱۳۰ ج ۱۲)

ترجمہ: ”میں نے اس کو جنت کی نہروں میں غوطے لگاتے ہوئے دیکھا ہے“۔

صحیح مسلم ج ۲ ص: ۶۸ پر غامدیہ کا مشہور واقعہ بھی ہے سنگ ساری کے دوران حضرت خالد کے چہرہ پر غامدیہ کے خون کا چھینٹا آ کر لگا حضرت خالد نے ان کو برا جملہ کہا تو آنحضرت نے فرمایا:

مَهْلًا يَا خَالِدُ! فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهٗ

ترجمہ: ”اے خالد! برا بھلا کہنے سے باز رہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ ٹیکس وصول کرنے والا کرتا تو اس کی بھی بخشش ہو جاتی“۔

اپنی تفسیر میں غامدی صاحب ظالم نے بڑی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت ماعز نے جان بچانے کے لیے جو اعتراف جرم کیا تھا ان کے اعتراف جرم اور توبہ کرنے سے اس طرح جرم معاف نہیں ہو سکتا ہے۔ اپنی تحریر میں غامدی صاحب نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے بارے میں بہت ہی زیادہ زہر اگلا ہے حالانکہ غامدی صاحب نے اپنی تفسیر کے ایک صفحہ بعد اپنی ہی بات کی کھلی خلاف ورزی کی ہے جو کھلا تضاد ہے چنانچہ غامدی صاحب نے اپنی تفسیر میں بحوالہ امین اصلاحی اس طرح لکھا ہے یعنی اس طرح مجرم اگر حکومت کے کسی اقدام سے پہلے خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو قانون کے حوالہ کر دیں تو ان سے پھر عام مجرموں کا معاملہ کیا جائے گا اس صورت میں انہیں محاربہ یا فساد فی الارض کا مجرم قرار نہیں دیا جائے گا استاذ امام نے لکھا ہے ”یہ خاص اختیارات صرف ان باغیوں کے خلاف استعمال کئے جائیں گے جو حکومت کے حالات پر قابو پانے سے پہلے تک اپنی بغاوت پر اڑے رہے ہوں اور حکومت نے اپنی طاقت سے ان کو مغلوب

ومقہور کیا ہو، جو لوگ حکومت کے ایکشن سے پہلے ہی توبہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر چکے ہوں ان کے خلاف ان کے سابق رویے کی بنا پر اس قسم کا کوئی اقدام جائز نہیں ہوگا بلکہ ان کے ساتھ عام قانون کے تحت معاملہ ہوگا اگر ان کے ہاتھوں عام شہریوں کے حقوق تلف ہوئے ہیں تو حتی الامکان ان کی تلافی کرادی جائے گی (البیان ج ا ص: ۶۳۰)

غامدی صاحب کی سابقہ عبارت اور ان کی اور ان کے استاد کی لاحقہ عبارت کو پڑھ لیجئے اس میں کتنا تضاد ہے اور حضرت ماعز کے واقعاتی معاملہ سے ان کی عبارات میں کتنا تفاوت ہے کیونکہ حضرت ماعز نے حکومت کی گرفت سے پہلے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تھا اور توبہ کر کے حد زنا کے نفاذ کے لیے بار بار اصرار کیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اس توبہ کے بعد اور قانون کے ہاتھوں میں آنے سے پہلے ان کو سزا کیوں دی گئی؟ اور خاص کر ان کو محاربہ کے تحت لا کر سخت سزا کیوں دی گئی حالانکہ غامدی اوپر اپنی تفسیر میں خود اس کی سختی سے نفی کر رہے ہیں پھر غامدی صاحب نے اپنی تائید میں اپنے استاذ کی پوری عبارت نقل کردی ہے خود بھی کہہ رہے ہیں اور ان کے استاد بھی کہہ رہے ہیں کہ حکومت کی گرفت سے پہلے اور اسی طرح توبہ کرنے کے بعد زنا کا مرتکب شخص آیت محاربہ کے تحت نہیں آسکتا ہے جب نہیں آسکتا ہے تو حضرت ماعز کو آیت محاربہ کے تحت سزا کیسے ہو؟ کسی نے سچ کہا ہے

کہ دروغ گورا حافظہ نہ باشد

خود ساختہ تفسیر کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہر حال میں عوام وخواص اور علماء اور طلباء سے درخواست کرتا ہوں کہ اس طرح نا قابل اعتماد اور نا قابل اعتبار غیر معتمد تفاسیر سے اپنے آپ کو بچائیں۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ

خاتمۂ کلام

الحمدللہ آج مؤرخہ ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۴۳۷ھ مطابق یکم اپریل ۲۰۱۶ء کو میں اس طویل تحریر سے فارغ ہوا جس کو میں نے یکم محرم الحرام ۱۴۳۷ھ میں لکھنا شروع کیا تھا اہل حق اور اہل باطل دونوں کی تفاسیر پر میں نے روشنی ڈالی ہے میں نے اس کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے کہ مجھے جناب غامدی صاحب کی تفسیر البیان کے متعلق کچھ لکھنا ہے تاکہ ان کے غلط نظریات کو علماء اور طلباء پر واضح کردوں آج میں ان کی تفسیر کی پہلی جلد کی موٹی موٹی غلطیوں کی نشاندہی سے فارغ ہوگیا ہوں یہ کل ۴۵ بڑی غلطیاں ہیں چھوٹی غلطیاں اس کے علاوہ ہیں اور ترجمہ کی کثیر غلطیاں اپنی جگہ پر ڈھیر لگا ہوا ہے۔

غامدی صاحب کی تفسیر کی تین جلدیں اس کے علاوہ ہیں ان کی غلطیاں پکڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے اس کے لیے بڑا وقت درکار ہے غامدی صاحب نے اپنی تفسیر کی جلد اول میں سند کے ساتھ ایک حدیث بھی ذکر نہیں کی ہے نہ کسی مفسر کی تفسیر کا حوالہ دیا ہے نہ ان کی اتباع کی ہے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص تفسیر بالرائے ہے پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ میں تورات یا انجیل پڑھ رہا ہوں ہاں جہاں غامدی صاحب غلط راستے پر چل پڑتے ہیں پھر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب نیند سے جاگ اٹھے ہیں۔ تعجب اس پر ہے کہ قرآن جس ماحول میں اترا تھا یا جن مسائل وفضائل سے متعلق اترا تھا یا مسلمانوں کے معاملات کے تنازعات ختم کرنے کے لیے اترا تھا ان تمام چیزوں کا ذکر تک نہیں ہے کیونکہ ان چیزوں کی طرف جانے سے احادیث کا سہارا لینا پڑتا ہے اور احادیث کو ماننا پڑتا ہے اور احادیث کو ماننا یا اس کا ذکر کرنا غامدی صاحب اور ان کے استاذوں کے مزاج کے خلاف ہے۔

اس لیے غامدی صاحب کو نہ آیات کے مقاصد ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ احادیث کے ذکر کرنے کی ضرورت پڑی اور نہ کسی مفسر کی تفسیر کی طرف جھانکنے کی ہمت ہوئی۔ تورات وانجیل اور یہود ونصاریٰ کے صحائف کے حوالے تو بھرپور ملیں گے مگر مفسرین کی تفاسیر کا ایک حوالہ بھی نہیں ملے گا جناب غامدی صاحب کی تفسیر کی جلد اول سے اندازہ ہوگیا کہ ان کہ دیگر جلدوں میں یہی کچھ ہوگا جناب حمیدالدین فراہی صاحب کی تفسیر نظام القرآن جو قرآن کی آخری سورتوں پر مشتمل ہے اس میں جو غلطیاں ہیں اس کو میں نے ایک حد تک جمع کیا ہے امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید غامدی

صاحب کی تفسیر کی آخری جلدوں میں لامحالہ وہی غلطیاں ہوں گی کیونکہ یہ حضرات ایک دوسرے کے نقش قدم پر ایسے چلتے ہیں کہ لکھنے کے اصطلاحی الفاظ میں بھی فرق نہیں آنے دیتے ہیں۔

محترم حضرات! میں نے صرف قرآن عظیم کی عظمت کا لحاظ کر کے قرآن میں باطل افکار ڈالنے والوں کا ایک حد تک تعاقب کیا ہے مقصد یہ ہے کہ مسلمان نوجوان اپنے عقائد کا خیال رکھیں اور مسلمان اپنے اسلام کی بنیادی اصولوں کے ساتھ وابستہ رہیں مجھے کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب کو جن لوگوں نے لاوارث لاش سمجھ کر بھبھوڑنا شروع کیا ہے ان کے حملوں سے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا دفاع کیا ہے تحریر میں جہاں تلخی ہوگی تو بقول غامدی صاحب میں کہوں گا۔

قلم کی تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

یہاں تک جاوید احمد غامدی کی تفسیر جلد اول کی ۴۵ غلطیاں اور اس پر تبصرے مکمل ہو گئے اس سے پہلے امین احسن اصلاحی کے ۲۱ شاذ نظریے اور اس پر تنقید مکمل ہو گئی اس سے پہلے حمید الدین فراہی کی کئی غلطیاں اور اس کے جوابات مکمل لکھے گئے ان حضرات کی دیگر جلدوں میں بہت کچھ غلطیاں ہونگی میں تھک گیا ہوں ایمان بچانے والے جوانوں کے لیے یہ تنبیہات وتشریحات کافی ہیں ہر آدمی اپنے ایمان کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہے۔

اللہ سب کی حفاظت فرمائے آمین یارب العالمین۔

وصلى الله على نبيه الكريم

(حضرت مولانا) فضل محمد یوسف زئی (صاحب)

استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نمبر ۵

یکم اپریل ۲۰۱۶ء